سہ ماہی **بحث ونظر** حیدرآباد

شمارہ نمبر : ۸۸-۸۹	اپریل — ستمبر ۲۰۱۲ء	جمادی الاولیٰ - شوال ۱۴۳۳ھ

زرِ تعاون

اندرون ملک

ایک شمارہ: 40روپے

سالانہ: 150، بذریعہ رجسٹری: 200

سہ سالہ: 450، بذریعہ رجسٹری: 550

بیرونِ ملک

ایشیائی ممالک کیلئے سالانہ: 20امریکی ڈالر

یورپ، امریکہ، افریقہ کے لئے :

سالانہ: 30امریکی ڈالر

ترسیل زر اور خط وکتابت کا پتہ

Khalid Saifullah Rahmani, Baitul Hamd, H.No:16-182/1, Quba Colony, Po:Pahadi Shareef, Hyd, A.P 500005, Ph: 9989709240 E-mail: ksrahmani@yahoo.com

چیک / ڈرافٹ پر صرف: "Khalid Saifullah" لکھیں

کمپیوٹر کتابت: محمد نصیر عالم سبیلی ''العالم'' اُردو کمپیوٹر سنٹر، حیدرآباد، فون نمبر: 9959897621 91+

فہرست مضامین

افتتاحیہ

پوری دنیا میں مسلمان آج اپنی نازک صورتحال سے گزر رہے ہیں، انھیں دوطرفہ خطرہ درپیش ہے، ایک طرف وہ اسلام دشمن عناصر ہیں، جن کا مقصد اسلام اور مسلمانوں کو زیادہ سے زیادہ بدنام کرنا اور انھیں ایک ایسی قوم کی حیثیت سے پیش کرنا ہے، جو شدت پسند، ناروادار، بردباری سے محروم اور تمدن سے عاری گروہ ہے، جو ہر مسئلہ کو تشدد، طاقت اور نعروں سے حل کرنا چاہتی ہے —— دوسری طرف وہ لوگ ہیں، جو نہ صرف اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں؛ بلکہ اپنے آپ کو اسلام کا واحد نمائندہ خیال کرتے ہیں، انھوں نے اپنے طور پر اسلام کا ایک تصور طے کرلیا ہے اور خود ہی اس کو نافذ کرنے کے لئے بھی کوشاں ہیں، جو کام حکومتوں کے کرنے کا ہے، ان کاموں کو انھوں نے اپنے ہاتھوں میں لے لیا ہے، یا تو یہ غلط فہمی کا شکار ہیں یا یہ اعداء اسلام کے آلہ کار کے طور پر کام کررہے ہیں، ان کی حرکتیں بظاہر ان لوگوں کے لئے ثبوت فراہم کرتی ہیں، جو اسلام کی طرف وحشت اور ناروا داری کی نسبت کرتے ہیں۔

اس صورت حال سے نہ صرف ملت کو سیاسی سطح پر نقصان پہنچ رہا ہے؛ بلکہ علمی وفکری اعتبار سے بھی دین حق کی تصویر مسخ ہورہی ہے اور دعوت وتبلیغ دین کے راستہ میں رکاوٹیں کھڑی ہورہی ہیں، ان حالات میں علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ علمی وفکری جہت سے اسلام کی صحیح تصویر پیش کریں، اسلام کا تصورِ جہاد کیا ہے؟ غیر مسلم اکثریت اور غیر مسلم اقلیت کے ساتھ کیا رویہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے؟ ہم جس ملک میں رہتے ہیں اس ملک کے حکمرانوں اور برادرانِ وطن کے ساتھ ہمارے تعلقات کیسے ہونے چاہئیں؟ اگر معاشرے میں کوئی برائی پھیل رہی ہے تو اس کو روکنے کے لئے ایک عام شہری کیا طریقۂ کار اختیار کرسکتا ہے؟؟ —— ایسے مسائل پر علماء اُمت کو قلم اُٹھانا چاہئے، ایک طرف انھیں اسلام کے خلاف کئے جانے والے ناشائستہ پروپیگنڈوں کا جواب بھی دینا چاہئے، اور دوسری طرف مسلمانوں کی نئی نسل کی رہنمائی بھی کرنی چاہئے؛ مگر افسوس کہ اہم مسائل پر بہت کم لکھا اور بولا جاتا ہے، جس سے مسلمان نوجوان بے سمتی کا شکار ہورہے ہیں اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ میں اسلام سے متعلق شکوک وشبہات پیدا ہورہے ہیں۔

مزید ایک افسوس ناک پہلو یہ ہے کہ اس وقت مذہبی طبقہ میں مسلکی اختلاف اپنی انتہا پر پہنچا ہوا ہے، بعض حضرات تبلیغ دین کی بجائے تبلیغ مسلک کو اپنی زندگی کا مقصد بنائے ہوئے ہیں، مسجدیں ویران ہیں؛ لیکن وہ نماز کی دعوت دینے کی بجائے طریقۂ نماز کی دعوت دے رہے ہیں اور اپنے سوا دوسروں کی نماز کو غلط ٹھہراتے ہیں، اس اختلاف نے اُمت میں انتشار کو بڑھایا ہے اور مسلمانوں کا ایک طبقہ مذہبی قائدین سے مایوس ہو چکا ہے، اگر تمام مکاتبِ فکر کے علماء سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس وقت اُمت کو حقیقی معنی میں جو چیلنج درپیش ہے، مل جل کر اس کو حل کریں تو صورت حال میں بہت کچھ تبدیلی آسکتی ہے، مگر افسوس کہ ہماری شدت پسندی اور گروہ بندی ہمیں اس ضرورت کا احساس ہی نہیں ہونے دیتی۔

بحث ونظر کا یہ شمارہ (۸۸-۸۹) مشترک شمارہ ہے، اس شمارہ میں زیادہ حصہ ان خطبات کا ہے، جو مختلف موقعوں سے اس حقیر نے دیئے ہیں، ان میں زیادہ تر خطبات 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' کے ان سیمیناروں کے ہیں، جو مختلف موضوعات پر تربیتی نقطۂ نظر سے منعقد ہوتے رہے ہیں، بعض خطبات انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز دہلی، المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد اور مجلس تعمیر ملت حیدرآباد کے پروگراموں سے متعلق ہیں، یہ خطبات اس سیمینار سے متعلق مضامین کے مجموعہ میں شامل ہو کر طبع ہو چکے ہیں، بعض احباب کی خواہش تھی کہ ان سب کو یکجا بھی شائع ہونا چاہئے؛ کیوں کہ کلیدی اور تعارفی کلمات میں عام طور پر موضوع کی روح سمٹ آتی ہے، یہ دوستوں کی اسی خواہش کی تعمیل ہے؛ البتہ اس شمارے میں بھی ایک سفرنامہ کو شامل رکھا گیا ہے، جو جنوبی افریقہ خاص کر اس کے ساحلی شہر 'کیپ ٹاؤن' سے متعلق ہے، گذشتہ شمارے میں کناڈا کا سفرنامہ شامل تھا، جسے قارئین نے بہت پسند کیا اور بعض حضرات کی طرف سے مطالبہ آیا کہ ہر شمارہ میں ایک سفرنامہ بھی شامل رکھنے کی کوشش کی جائے؛ تاکہ لوگوں کے لئے دلچسپی کا باعث ہو اور مختلف ملکوں میں بسنے والے مسلمانوں کے دینی وسماجی حالات سامنے آسکیں، یہ سفرنامہ بھی اسی پس منظر میں ہے۔

خالد سیف اللہ رحمانی

۷؍ذوالحجہ ۱۴۳۳ھ
۲۴؍اکتوبر ۲۰۱۲ء

○ ○ ○

حدیث ــــ اُصول، تخریج، تدریس☆

خالدسیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد المرسلين
وعلى آله واصحابه اجمعين ومن تبعهم باحسان إلى يوم الدين .

جناب صدر، مہمان معزز، علماء کرام اور طلبۂ عزیز! تمام اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ کتاب اللہ اور سنت رسول ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا ''ترکت فیکم شیئین لن تضلوا بعدھما کتاب اللہ وسنتي''(۱) ان دونوں مصادر شریعت میں سے جہاں کتاب اللہ کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ استناد کے اعلیٰ ترین مقام پر ہے اور اس کا ایک ایک حرف محفوظ ہے؛ بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس کی حفاظت کا وعدہ فرمایا ہے ''إِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَإِنَّا لَهُ لَحَافِظُوْنَ''(الحجر:۹) اور جس کے شک وشبہ سے بالاتر ہونے کی خود قرآن مجید نے صراحت کی ہے ''ذٰلِكَ الْكِتَابُ لاَ رَيْبَ فِيْهِ''(البقرۃ:۲) وہیں حدیث کو یہ اہمیت حاصل ہے کہ وہ قرآن مجید کا بیان اور شریعت اسلامی کی توضیح وتفسیر ہے؛ اسی لئے امام اوزاعیؒ نے فرمایا: ''الكتاب أحوج إلى السنة من السنة إلى الكتاب'' حدیث کی اسی اہمیت کی وجہ سے اسے ہر عہد کے اصحابِ نظر علماء اور محققین کی خصوصی توجہ حاصل رہی ہے اور دوسری صدی ہجری سے لے کر موجودہ صدی تک کوئی عہد ایسا نہیں گذرا، جس میں حدیث کے مختلف پہلوؤں پر، اس عہد کی ضرورتوں کے مطابق بہت سی تصنیفات منظر عام پر نہیں آئی ہوں، روایت وتدریس اور تصنیف وتحقیق غرض ہر پہلو سے اس فن کی ایسی عظیم الشان خدمت کی گئی ہے کہ اس کو رسول اللہ ﷺ کے معجزہ کے سوا اور کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

اصل میں اللہ تعالیٰ کا نظام یہ ہے کہ جس چیز سے انسانیت کا نفع متعلق ہوتا ہے، اسے باقی رکھتے ہیں اور جن چیزوں سے انسانیت کا نفع متعلق نہیں ہوتا، وہ بہ تدریج ختم ہو جاتی ہیں، جب بارش کا موسم آتا ہے تو کتنے ہی خود رو پودے زمین میں اُگ آتے ہیں؛ مگر برسات کے گذرتے ہی یہ پودے آہستہ آہستہ ختم ہو جاتے ہیں؛ لیکن جو

☆ المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد میں تخریج حدیث کے موضوع پر ایک ورکشاپ کا انعقاد عمل میں آیا تھا، یہ اس کا ''خطبۂ افتتاحیہ'' ہے۔

(۱) کنز العمال، الاعتصام بالکتاب والسنة، حدیث نمبر:۸۷۶۔

پودے انسان کے لئے مفید ہوتے ہیں، ان کی عمر دراز ہوتی ہے؛ بلکہ بعض کی عمر تو سو سال سے بھی زیادہ ہوتی ہے، اسی طرح جن جانوروں سے انسان کی غذا اور دوسرے مفادات متعلق ہوتے ہیں، باوجودیکہ وہ کثیر مقدار میں ذبح کئے جاتے ہیں؛ لیکن ان کی نسلیں بڑھتی رہتی ہیں، جیسے گائیں اور بکرے، اور جن جانوروں سے انسان کا مفاد متعلق نہیں ہے، ان کی نسلیں گھٹتی اور ختم ہوتی جارہی ہیں، اگرچہ کہ وہ طاقتور ہیں اور آپ اپنی حفاظت کی صلاحیت رکھتے ہیں، جیسے: شیر، مذاہب اور مذہبی شخصیتوں کے سلسلے میں بھی قدرت کا یہی نظام کارفرما ہے، جن مذہبی کتابوں سے اب انسان کی ہدایت متعلق نہیں رہی، وہ محفوظ نہیں رہیں اور وہ انسانی آمیزشوں اور ملاوٹوں کا شکار بن گئیں، اسی طرح ان مذہبی پیشواؤں کی سیرت بھی اپنی حقیقی حالت میں آج موجود نہیں ہے، یہاں تک کہ جن پیغمبروں کا قرآن مجید میں ذکر آیا ہے اور جن پر ہمارا ایمان ہے، ان کی زندگی کے بھی محض چند واقعات آج روشنی میں ہیں؛ بلکہ اگر قرآن مجید میں ان کا ذکر نہ ہوتا، تو تاریخی طور پر ان کی تصدیق بھی دشوار ہوتی؛ لیکن جناب محمد رسول اللہ ﷺ پر چوں کہ نبوت کا سلسلہ مکمل ہو چکا ہے اور قیامت تک انسانیت آپ ہی کے نبوت کے سایہ میں رہے گی، اس لئے من جانب اللہ آپ کی پوری زندگی تاریخ کی روشنی میں ہے اور آپ کے فرمودات ومعمولات اس طرح محفوظ ہیں کہ زندگی کا کوئی گوشہ اندھیرے میں نہیں ہے، اس لئے حدیث کی حفاظت دراصل قرآن کی حفاظت اور رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کا لازمی تقاضہ ہے۔

حدیث کی نقل وروایت کی خدمت اس کے ابتدائی عہد میں جس طرح عربوں نے کی، اسی طرح اس کے جمع وتدوین اور اس فن کو اوجِ کمال تک پہنچانے کا سہرا زیادہ تر ایرانی نژاد علماء کے حصہ میں آیا، پھر مصر وشام اور فلسطین ویمن کے علاقوں سے اُٹھنے والے اہل علم نے اس فن کی آبیاری میں حصہ لیا ہے، اسی طرح ہندوستان گو جزیرۃ العرب سے دور دراز کا علاقہ ہے؛ لیکن اسے یہ شرف حاصل ہے کہ حضرت عمر کے ابتدائی عہد میں ہی یہاں سے اہل ایمان کا قافلہ حجاز مقدس پہنچ چکا تھا اور بعض تاریخی روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں ہی ہندوستان کے ساحلی علاقہ پر اسلام کی روشنی پہنچ گئی تھی، اس دیار نے جہاں مختلف اسلامی اور عربی علوم کی خدمت کی ہے، وہیں حدیث نبوی کی خدمت میں بھی اس کا نمایاں حصہ رہا ہے۔

برصغیر کا علم حدیث سے قدیم رابطہ رہا ہے، یہاں حضرت عمر کے عہد سے ہی صحابہ اور تابعین کا ورود شروع ہو گیا تھا، عہد فاروقی میں پانچ صحابہ، عبداللہ بن عبداللہ بن عتیق انصاری، عاصم بن عمرو تمیمی (جو فتح عراق میں حضرت خالد بن ولید کی فوج میں شامل تھے)، قبیلۂ بنو عبدالقیس کے صحار بن عبدی، سہیل بن عدی اور حکم بن ابی العاص ثقفی کا ذکر ملتا ہے، اس طرح حضرت عثمان غنی کے عہد میں عبید اللہ بن معمر تمیمی مدنی، عبدالرحمٰن بن سمرہ (جو فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے) اور حضرت امیر معاویہ کے عہد میں سنان بن سلمہ ہذلی، جو سندھ تشریف لائے، ان میں

بعض حضرات کے راویان حدیث میں شامل ہونے کی صراحت ملتی ہے، اور عمومی طور پر صحابہ کی تربیت اس طرح ہوئی تھی کہ وہ کہیں بھی اور کسی بھی نسبت سے پہنچتے، رسول اللہ ﷺ کے ارشادات لوگوں تک پہنچاتے۔

اس عہد کے بعد موسیٰ بن یعقوب ثقفی — جو محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ آئے تھے — یزید بن ابی کبشہ سکسکی دمشقی — جن کو سلیمان بن عبدالملک نے محمد بن قاسم کی جگہ مقرر کیا — تابعی تھے اور ماہرین رجال نے ان کو ثقہ راوی شمار کیا ہے، بخاری میں بھی ان کی روایت ہے، مفضل بن ابی صفراء، ابوموسیٰ اسرائیل بن موسیٰ بصری — جن کے تلامذہ میں سفیان ثوری، سفیان بن عیینہ اور یحییٰ بن سعید القطان جیسے محدثین ہیں — عمرو بن سفیان ثوری، ربیعہ بن صبیح بصری، جو حسن بصری کے شاگرد تھے اور جن کو اسلام میں پہلا مصنف قرار دیا گیا ہے، جیسے اہل علم اور علماء حدیث پہلی اور دوسری صدی ہجری میں وارد ہند ہوئے، پھر سندھ کے شہر دیبل اور سندھ ہی میں محمد بن قاسم کے قائم کئے ہوئے شہر منصورہ کو مشرق میں اشاعت علم حدیث کے مرکز کی حیثیت حاصل ہوگئی اور اس وقت سے یہاں علم حدیث کی خدمت کا تسلسل قائم رہا۔

عام طور پر علماء ظاہر اور علماء باطن میں چشمکیں رہتی ہیں؛ لیکن ہندوستان میں صوفیاء کی خدمت کا ایک امتیازی پہلو یہ رہا ہے کہ دہلی اور اس کے مشرق ومغرب کے علاقوں میں علم حدیث کی نشر واشاعت صوفیاء اور ان کی خانقاہوں سے ہوئی، شاہ نظام الدین اولیاء (جن کے فیض کا دائرہ دور دور تک وسیع تھا) نے اپنی شہرت ومقبولیت کے عروج کے زمانہ میں علم حدیث کی تحصیل کے لئے مولانا کمال الدین زاہد کا تلمذ اختیار کیا اور ان سے ''مشارق الانوار'' پڑھی، جو تدریسی نقطۂ نظر سے ہندوستان میں مقبول ترین کتاب تھی، حدیث کی وجہ سے وہ صلاۃ جنازہ علی الغائب، قراءۃ فاتحہ خلف الامام اور سماع کے مسئلہ میں فقہاء احناف سے اختلاف رکھتے تھے، آپ کے شاگردوں میں شمس الدین اودھی ہیں، جنھوں نے مشارق الانوار کی شرح لکھی تھی، فخر الدین دہلوی ہیں، جن کی تالیف ''**کشف القناع عن وجوہ السماع**'' کا مخطوطہ اب بھی موجود ہے، ''تاریخ فیروز شاہی'' کے مصنف فیروز شاہ برنی، شیخ نصیر الدین چراغ دہلوی اور سید محمد گیسودراز، جنھوں نے مشارق الانوار کی شرح بھی لکھی اور فارسی میں اس کا ترجمہ بھی کیا، نیز معروف فقیہ قاضی شہاب الدین دولت آبادی بھی آپ کے تلامذہ میں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

شیخ نظام الدین اولیاء سے بھی بڑھ کر جنھیں علم حدیث میں شہرت حاصل ہوئی، وہ مخدوم الملک شیخ شرف الدین یحییٰ منیری کی شخصیت ہے، انھوں نے سونار گاؤں میں اپنے استاذ اور خسر ابوتوامہ حنبلی کی نگرانی میں تعلیم حاصل کی، ان کے مکتوبات اور تصوف سے متعلق تالیفات میں کثرت سے احادیث منقول ہیں اور کہا جاتا ہے کہ پورے ہندوستان میں سب سے پہلے انھوں نے ہی صحیحین کی تعلیم شروع کی، ان کے شاگردوں میں شیخ مظفر بلخی، حسین بن معز بہاری اور احمد لنگر دریا علم حدیث کی نشر واشاعت اور تصنیف وتالیف میں امتیازی حیثیت کے حامل ہیں۔

تیسری شخصیت سیدعلی ہمدانی کی ہے،جن کے ذریعہ کشمیر میں اسلام کی اشاعت بھی ہوئی اور درس حدیث کا سلسلہ بھی شروع ہوا،انھوں نے''**السبعین فی فضائل امیر المومنین** ''(جواہل بیت کےفضائل میں ہے) اور''اربعین فی الحدیث''،لکھی،ان کے شاگردوں میں سیدجلال الدین اورقاضی حسین شیرازی قابل ذکر ہیں،قاضی شیرازی ہی نے بابارتن ہندی سے متعلق احادیث جمع کیں، جوصحابی رسول ہونے کا مدعی تھا — چوتھی شخصیت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی کی ہے،ان کے تلامذہ میں ان کے صاحبزادے محدث جمال الدین کے علاوہ سیدجلال الدین بخاری خاص طور پر قابل ذکر ہیں،ثانی الذکر بھی قراءۃ فاتحہ خلف الامام اورصلوٰۃ جنازہ علی الغائب کے سلسلے میں شاہ نظام الدین اولیاء کے نقطۂ نظر پر تھے،اس طرح ہندوستان میں اشاعت حدیث کے سلسلے میں صوفیاء کا بڑا اہم حصہ رہاہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعض بڑے بڑے محدثین جو عالم عرب میں اپنے عہد میں مرجع کی حیثیت رکھتے تھے،ان کے تلامذہ یا تلامذہ کے تلامذہ خود ہندوستان میں وارد ہوئے یا ہندوستان سے جا کر وہاں کسب فیض کرکے واپس آئے ، حافظ ابن حجرعسقلانی سے براہ راست استفادہ کرنے والوں میں ہمیں یحییٰ بن عبدالرحمٰن ہاشمی شافعی کا نام ملتا ہے،جن کےعلم کا فیض گلبرگہ سے جاری ہوااورایک واسطہ سےتلمذ حاصل کرنے والوں میں جنوبی ہند کےمشہورعادل حکمراں محمودگاواں ہیں،جنھوں نے ایک عظیم الشان مدرسہ کی بھی بنیادرکھی،اسی طرح علامہ عبدالرحمٰن سخاوی کے شاگردوں میں ابوالفتح بن رضی مکی ، احمد بن صالح عمر بن محمد دمشقی ،عبدالعزیز بن محمودطوسی شافعی ، وجیہ الدین محمد مالکی،حسین بن عبداللہ کرمانی اور جمال الدین محمد جوبحرق کے نام سے معروف تھے، نیز رفیع الدین صفوی کا تذکرہ ملتا ہے،جن میں سے زیادہ تر شخصیتیں دکن کی مختلف مسلمان سلطنتوں میں فروکش تھیں، یہ سب براہ راست علامہ سخاوی کے شاگرد تھے — علامہ ابن حجرھیثمی کے تلامذہ شیخ عبداللہ عیدروسی ،ابوالسعادہ محمد فاکہی حنبلی ،میرمرتضیٰ شریف شیرازی اورمحمد میرکلاں محمدسعید بن مولانا خواجہ ہیں، جومحدث اکبرآبادی کے نام سے معروف تھے،اول الذکر دونوں بزرگوں کا علمی مرکز گجرات میں قائم ہوااورثانی الذکر دونوں شخصیتوں کا آگرہ میں،اس طرح مشہور دبستانِ حدیث جوعالم اسلام میں پائے جاتے تھے،ان کا فیض ہندوستان تک پہنچا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے،جس کے مختلف خطوں میں درس حدیث کی گونج رہی ہے ،سندھ کوتو اس میں اولیت حاصل ہے ہی ؛لیکن دکن ، گجرات ، دہلی ، جونپور ، بہار ، بنگال ،لکھنؤ ، لاہور اور مالدہ وغیرہ کوخصوصی اہمیت حاصل رہی ہےاور ہندوستان کی خاک سے متعددایسی شخصیتیں اُٹھتی رہی ہیں،جن کےعلم کی روشنی نے عالم اسلام کوبھی منورکیا ہے، ان میں شیخ علی متقیؒ کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے، شیخ علی متقی (متوفی:۹۷۵ھ) نے احادیث پرمتعددکتابیں مرتب کی ہیں،جن میں'' کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال'' کو

ایسی عالمگیر شہرت و پذیرائی حاصل ہوئی، جو کم کتابوں کے حصہ میں آئی، اس کے علاوہ انھوں نے فقہی ابواب کی ترتیب پر ''الجامع الصغیر'' اور زیادۃ الجامع الصغیر کا مجموعہ بھی ''منہاج العمال'' کے نام سے مرتب کیا تھا، جواب تک مخطوطہ کی شکل میں ہے، اس دبستانِ درس کی شخصیتوں میں شیخ ابوالحسن سندھی (متوفی: ۱۱۳۸ھ) محشی صحاح ستہ ہیں، جنھوں نے پہلی بار مسند احمد کی شرح لکھی اور جواب تک تشنۂ طبع ہے، ان کے صاحبزادے علامہ محمد حیات سندھی، علامہ ابوطیب سندھی جن کی شرح جامع ترمذی پر ہے، اور ''عقود الجواہر المنیفہ فی اصول ادلۃ مذہب ابی حنیفہ'' کے مصنف علامہ سید مرتضٰی بلگرامی (متوفی: ۱۲۰۵ھ) اور علامہ محمد عابد سندھی (متوفی: ۱۲۵۷ھ) جنھوں نے مسند امام ابی حنیفہ کی ''المواہب اللطیفہ'' کے نام سے شرح لکھی ہے، نیز بلوغ المرام کی شرح بھی تالیف فرمائی ہے، اسی درسگاہ کے کواکب وانجم ہیں۔

شیخ کے شاگرد علامہ طاہر پٹنی حنفی کو علم حدیث کی خدمت میں جو شہرت حاصل ہوئی، وہ محتاجِ اظہار نہیں، ان کی تالیفات ''المغنی فی ضبط الرجال، تذکرۃ الموضوعات، قانون الموضوعات والضعفاء، مجمع بحار الانوار'' مطبوعہ ہیں اور ''اسماء الرجال'' مخطوطہ کی شکل میں خدابخش لائبریری پٹنہ میں موجود ہے، ان ہی علماء میں شیخ وجیہ الدین علوی گجراتی ہیں، جنھوں نے مختلف موضوع کی تئیس کتابوں پر شرحیں اور حواشی لکھے ہیں، ہندوستان کے محدثین میں ایک زندہ و پائندہ نام علامہ حسن صنعانی لاہوری (متوفی: ۵۶۰ھ) کا ہے، جنھوں نے علوم اسلامی کی تحصیل کے لئے حجاز اور عراق کے بکثرت اسفار کئے، انھوں نے احادیث موضوعہ پر قلم اُٹھایا، جو رسالۃ الموضوعات کے نام سے چھپ چکا ہے، مشارق الانوار کے نام سے (۲۲۵۳) احادیث کا بخاری و مسلم سے انتخاب کیا، یہ کتاب ایک زمانے تک ہندوستان کے تدریسی اُفق پر چھائی رہی اور اس کو تشریح و ترجمہ کے اعتبار سے بھی اہل علم کی بڑی توجہ حاصل ہوئی، ان کی فہرست تصانیف میں رجال پر ''کتاب الضعفاء والمتروکین'' کے نام سے بھی ایک کتاب کا نام ملتا ہے۔

ہندوستان میں علم حدیث کی تدریس وتالیف کو فروغ دینے والی ایک نہایت اہم شخصیت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کی ہے، جنھوں نے ہندوستان میں ''مشکوٰۃ المصابیح'' کے درس کو رواج دیا اور اس کی شرح عربی میں **''لمعات التنقیح''** اور فارسی میں **''اشعۃ اللمعات''** کے نام سے لکھی، آپ کی ایک اہم تالیف ایام ولیالی کے فضائل اور اعمال سے متعلق ''ما ثبت بالسنۃ'' کے نام سے مطبوعہ ہے، شاہ عبدالحق صاحب نہ صرف خود حدیث کا درس دیا اور تالیف وتصنیف کے ذریعہ علم حدیث کی خدمت کی؛ بلکہ ایک ایسی درسگاہ کی بنیاد رکھی، جس سے بہت سے اہل علم نے استفادہ کیا اور بڑے بڑے محدثین وہاں سے فارغ التحصیل ہوئے، جن میں خود شیخ کی اولاد واحفاد میں شیخ نورالحق ہیں، جن کی بخاری پر ''تیسیر القاری'' کے نام سے پانچ جلدوں میں ایک جامع شرح چھپ چکی ہے، اور اسی خاندان کے ایک اور بڑے عالم سلام اللہ محدث رامپوری ہیں، مؤطا امام مالک پر عربی زبان میں ان کی شرح ''المحلی

باسرار الموطا'' کے نام سے مخطوطہ کی شکل میں موجود ہے، شیخ عبدالحق کی درسگاہ سے استفادہ کرنے والوں میں بابا داؤد مشکاتی کشمیری بھی ہیں، جن کو پوری مشکوٰۃ حفظ تھی، ان ہی میں میر غلام علی آزاد بلگرامی بھی ہیں، جو مشہور مصنف، مؤرخ اور فارسی کے ادیب تھے، جن کی تالیفات میں ''سبحۃ المرجان فی آثار ہندوستان'' (مطبوعہ ۱۳۰۳ھ) اور ہندوستان سے متعلق احادیث پر ''**شمامة العنبر فی ماورد فی الهند عن سید البشر**'' کو خاص طور پر شہرت حاصل ہوئی۔

شاہ عبدالحق صاحب کے بعد جس شخصیت نے ہندوستان میں باضابطہ درسگاہ حدیث کی بنیاد رکھی اور حدیث کے فیض کو دور دور تک پہنچایا، وہ شاہ ولی اللہ دہلویؒ ہیں، جنھوں نے حجاز کا سفر کیا اور وہاں سے حدیث کا تحفہ لے کر آئے، اس وقت ہندوستان کی علمی فضا پر معقولات کی گھٹا چھائی ہوئی تھی، انھوں نے ہندوستان واپس آکر موطا امام مالک، صحاح ستہ، مسند دارمی اور مشکوٰۃ کا درس شروع کیا، شاہ ولی اللہ صاحب کے شاگردوں میں شاہ عبدالعزیز صاحب، قاضی ثناء اللہ پانی پتی، مولانا محمد عاشق پھلتی، خواجہ امین ولی اللہی، مولانا خیرالدین سواتی اور مولانا بشیرالدین مرادآبادی جیسے نابغۂ روزگار علماء شامل ہیں، جن کے ذریعے پورے ہندوستان میں حدیث کی نشر واشاعت ہوئی اور درس حدیث کی ایک نئی تحریک نے جنم لیا، شاہ عبدالعزیز صاحب سے استفادہ کرنے والوں میں شاہ فضل رحمٰن گنج مرادآبادی اور شاہ محمد اسحٰق جیسے اہل علم ہوئے، دیوبند اور سہارنپور کا سلسلہ حدیث شاہ محمد اسحٰق صاحب اور شاہ عبدالغنی صاحب سے مربوط ہے، اور شاہ عبدالعزیز صاحب ہی کے ایک اور شاگرد میاں سید نذیر حسین محدث دہلوی سے اہل حدیث مکتبۂ فکر کا رشتہ جڑا ہوا ہے، اس طرح اس وقت برصغیر میں حدیث کے جو مدارس ہیں، ان سب کا سلسلۂ نسب شاہ عبدالعزیز صاحب سے ملتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کے بعد ہندوستان کے آسمان علم وتحقیق پر نیر تاباں بن کر طلوع ہونے والی شخصیات میں غالباً سب سے نمایاں نام مولانا عبدالحئ فرنگی محلی لکھنوی کا تھا، وہ علوم اسلامی کی جامعیت، حدیث وفقہ میں یکساں تبحر اور تقلید کے ساتھ ساتھ تحقیق اور فکر ونظر میں عدل واعتدال کا ایسا نمونہ ہیں، جن کو شاہ ولی اللہ صاحب کی فکر کا عکس جمیل قرار دیا جاسکتا ہے، وہ بنے بنائے راستہ پر قناعت کرنے کے بجائے نئے راستے بنانے کی صلاحیت رکھتے تھے اور ابداعی فکر کے مالک تھے، انھوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا، اس کا حق ادا کرنے کی کوشش کی، حدیث کے ردوقبول کے سلسلے میں سند کے علاوہ دوسرے قرائن اور وجوہِ درایت کی اہمیت کو انھوں نے بڑی قوت کے ساتھ اور مدلل طور پر پیش کیا، اس سلسلے میں ''الرفع والتکمیل'' اور ''الاجوبۃ الفاضلۃ'' اُصولِ حدیث کے پورے کتب خانے میں امتیازی حیثیت کی حامل کتابیں ہیں، جو بعد کے اہل علم کے لئے سرمۂ چشم بنیں؛ اسی لئے ممتاز محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ کی جو توجہ مولانا لکھنوی کی تالیفات کو حاصل ہوئی، شاید ہی کسی اور عالم کے حصہ میں آئی ہو۔

اسی دور میں ہندوستان میں ایک دوسری شخصیت نواب صدیق حسن خاں کی ابھری، جو اس دیار میں مسلک اہل حدیث کے مؤسسین میں ہیں؛ البتہ ان کے یہاں اعتدال اور ائمہ متبوعین کا پورا احترام بھی ہمیں نظر آتا ہے، فقہ الحدیث پر ان کی تالیف ''نزل الابرار'' کے علاوہ ان کی اور بھی متعدد کتابیں ملتی ہیں اور خاص طور پر انھوں نے ہندوستان میں علامہ شوکانی کے علوم وافکار کی اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے، اس موقعہ پر علامہ شوکانی کے ایک تلمیذ رشید محدث حسین بن محسن انصاری یمانی کا ذکر بھی مناسب ہوگا، جو اپنے عہد کے مشہور اساتذۂ حدیث میں تھے، بڑے بڑے اہل علم خاص کر دارالعلوم ندوۃ العلماء کے اکابر نے ان سے استفادہ کیا، مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی ان سے استفادہ کرنے والوں میں ہیں، ان کی تالیف ''**التحفة المرضية في حل بعض المشكلات الحديثية**'' نقدِ حدیث کے موضوع پر بڑی اہم کتاب ہے، جس میں دوسری بحثوں کے بہ شمول حدیث کے رد وقبول میں ''تلقی بالقبول'' کی اہمیت پر بڑی چشم کشا گفتگو کی گئی ہے۔

مدارس حدیث کی جہد مسلسل ہی کا نتیجہ ہے کہ حدیث کے موضوع پر اُردو فارسی کے علاوہ عربی زبان میں بھی ہمیں علماء ہند کی تصنیفات کا ایک بڑا ذخیرہ نظر آتا ہے؛ چنانچہ متونِ حدیث کو جمع کرنے میں شیخ علی متقی ہندی کی ''کنز العمال'' ایسی شہرہ آفاق اور جامع تالیف ہے، جس کی شہرت ذکر وتعارف سے ماوراء ہے، پھر ماضیٔ قریب میں مولانا ظہیر احسن شوق نیموی کی ''آثار السنن'' مولانا ظفر احمد عثمانی کی ''اعلاء السنن'' اور مولانا عبداللہ شاہ محدثِ دکن کی ''زجاجۃ المصابیح'' حنفی نقطۂ نظر سے احکام حدیث کے ایسے جامع اور وقیع مجموعے ہیں، جن کی عالم اسلام کے علماء نے بھی داد دی ہے۔

شروح حدیث میں بخاری پر مولانا احمد علی محدث سہارنپوری اور مولانا محمد قاسم نانوتوی کے حواشی، مولانا رشید احمد گنگوہی کی ''لامع الدراری'' مولانا انور شاہ کشمیری کی ''فیض الباری''، مسلم پر مولانا شبیر احمد عثمانی کی ''فتح الملہم، سنن ابی داؤد پر مولانا شمس الحق عظیم آبادی کی ''عون المعبود'' مولانا خلیل احمد سہارنپوری کی ''بذل المجہود'' اور مولانا سید انور شاہ کشمیری کی ''انوار المحمود''، سنن ترمذی پر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کی ''تحفۃ الاحوذی'' مولانا انور شاہ کشمیری کی ''العرف الشذی'' مولانا محمد یوسف بنوریؒ کی ''معارف السنن'' اور مولانا رشید احمد گنگوہی کی ''الکوکب الدری''، سنن نسائی پر مولانا رشید احمد گنگوہی کی ''الفیض السماوی'' اور مؤطا امام مالک پر شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ''المسویٰ''، نیز مولانا محمد زکریا صاحب کاندھلوی کی مفصل شرح ''اوجز المسالک''، مؤطا امام محمد پر مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کی ''التعلیق الممجد''، امام ابو یوسف کی کتاب الآثار پر مولانا ابوالوفاء افغانی کی ''تعلیقات''، امام محمد کی کتاب الآثار پر مفتی مہدی حسن شاہجہاں پوری کی ''قلائد الازہار'' نیز سنن دارقطنی پر مولانا شرف الدین عظیم آبادی کی التعلیق المغنی اور شرح معانی الآثار پر مولانا محمد یوسف کاندھلوی کی امانی الاحبار وغیرہ نہایت اہم تالیفات ہیں۔

اُصولِ حدیث کے موضوع پر مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلی لکھنوی کی ''ظفر الامانی علی مختصر الجرجانی'' شاہ عبدالحق صاحب کا ''مقدمہ فی اصولِ الحدیث'' از روئے درایت نقد حدیث کے سلسلے میں مولانا لکھنوی کی ''الرفع والتکمیل'' اور ''الاجوبۃ الفاضلۃ'' کے علاوہ اعلاء السنن پر مولانا ظفر احمد عثمانی کا، فتح الملہم پر مولانا شبیر احمد عثمانی کا، تحفۃ الاحوذی پر مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری کا، اوجز المسالک پر مولانا محمد زکریا کاندھلوی کا اور لامع الدراری پر مولانا محمد عاقل سہارنپوری کا مقدمہ بلند پایہ تحریریں ہیں، اسی طرح محدث یمانی کی التحفۃ المرضیہ اور نواب صدیق حسن خاں صاحب کی بعض تالیفات نہایت اہمیت کی حامل ہیں۔

رجال کے سلسلے میں علامہ پٹنی کی ''المغنی فی ضبط الاسماء'' کے علاوہ شاہ عبدالحق محدث دہلوی کی ''الاکمال فی اسماء الرجال'' اور طحاوی کے رجال پر مولانا محمد ایوب سہارنپوری کی ''تراجم الاحبار'' وغیرہ اہم تالیفات ہیں، اسی طرح تخریج حدیث میں مولانا حبیب اللہ مختار کی ترمذی کی احادیث الباب پر ''کشف النقاب'' ایک مفید ترین کام ہے، جو افسوس کہ مکمل نہیں ہو پایا۔

یہ تو ان تالیفات میں سے کچھ اہم کتابوں کا ذکر ہے، جو عربی زبان میں لکھی گئی ہے؛ لیکن برصغیر میں اُردو زبان میں بھی حدیث کے موضوع پر ایک پورا کتب خانہ وجود میں آچکا ہے، جس میں متونِ حدیث کے ترجمے بھی ہیں، صحاحِ ستہ اور حدیث کی بعض اور کتابوں کی مختصر، متوسط اور تفصیلی شرحیں (جو زیادہ تر دروس کے مجموعے ہیں) بھی ہیں، اُصولِ حدیث پر بھی مختصر اور مفصل مستقل کتابیں اور عربی کی اہم کتابوں کے ترجمے موجود ہیں، حدیث کے انکار کے فتنے کی بیج یوں تو مستشرقین نے بوئی اور اس کا پہلا اثر مصر کی بعض مغرب زدہ شخصیتوں نے قبول کیا؛ لیکن یہ فتنہ تقریباً اسی دور میں ہندوستان میں بھی پہنچ گیا اور یہاں بعض معروف شخصیتیں اس گمراہی کا شکار ہوئیں، اس پس منظر میں حدیث کی حجیت، عہد نبوی اور عہد صحابہ میں حدیث کی کتابت اور حدیث کے استناد واعتبار پر علماء نے پوری تحقیق، بصیرت، دینی حمیت اور سلف صالحین کے نقطۂ نظر پر استقامت کے ساتھ نہ صرف قلم اٹھایا؛ بلکہ اس پر پورا کتب خانہ تیار کردیا اور شاید یہ کہنا مبالغہ نہ ہو کہ اس جہت سے علماء ہند کی خدمات عالم عرب سے بھی زیادہ وقیع ہیں، اس سلسلے میں علامہ سید سلیمان ندوی، مولانا سید مناظر احسن گیلانی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، مولانا بدر عالم میرٹھی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی وغیرہ کی خدمات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

روایات کی سند ومتن اور نقد ودرایت کی جہتوں سے تنقیح وتحقیق کے سلسلے میں علامہ شبلی نعمانی اور ان کے تلمیذ سعید علامہ سید سلیمان ندوی کی کوششیں ایک حد تک اس وقت تک کی ان تالیفاتِ سیرت پر بھی بھاری ہیں، جو عربی زبان میں لکھی گئی ہیں۔

حدیث کی متعدد اہم تالیفات وہ ہیں، جن پر تحقیق وتعلیق کی خدمت علماء ہند نے انجام دی ہے، اس سلسلے

میں ''مسند امام اعظم''، امام ابو یوسف اور امام محمد کی ''کتاب الآ ثار، مصنف عبدالرزاق، مسند ابو یعلی اور سنن سعید بن منصور''، پر علماء ہند کی علمی کاوشیں بڑی اہمیت کی حامل ہیں اور ہندوستان میں مولانا ابوالوفاء افغانی اور مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی کی خدمات اس سلسلہ میں نا قابل فراموش ہیں، نیز عصر حاضر میں ڈاکٹر مصطفیٰ اعظمی اور مولانا ابواللیث خیر آبادی وغیرہ خدمت حدیث کے سلسلہ میں عالمی سطح پر معروف ہیں اور ان کی تصنیفات کو عالم عرب میں بھی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

ان خدمات کے مختصر اور سرسری ذکر کا مقصد تفاخر اور محض تاریخ کے صفحات کو الٹانا نہیں ہے؛ بلکہ مقصد یہ ہے کہ نئی نسل کے سامنے اپنے بزرگوں کا کارنامہ رہے؛ کیوں کہ قومیں ماضی کے آئینہ میں اپنے مستقبل کو سنوارتی ہیں اور بزرگوں کے نقش قدم پر آئندہ کا سفر طے کرتی ہیں، پس اللہ تعالیٰ خادمین دین کے اس قافلہ کو بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے اور ہمیں اپنے دین اور علم دین کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔

حضرات! اس وقت ہم جس خطہ میں آپ کا استقبال کر رہے ہیں یعنی سرزمین دکن، یہ علم حدیث کے اہم مراکز میں رہا ہے، برہان پور، گلبرگہ، بیجاپور، بیدر اور احمد نگر وغیرہ میں سنی مسلم حکومتوں نے محدثین کی بڑی پذیرائی کی، اور انھیں تدریس وتصنیف کے ذریعہ اس علم کی آبیاری کرنے کا پورا پورا موقع فراہم کیا ہے، جن میں سے بعض کا ذکر اوپر ہو چکا ہے، ماضی قریب میں بھی دکن خاص کر حیدرآباد کا حدیث کی نشر واشاعت میں بڑا حصہ رہا ہے، یہیں دائرۃ المعارف العثمانیہ سے پہلی بار ''کنز العمال، سنن بیہقی، کتاب الانساب للسمعانی، کتاب الثقات لابن حبان، مشکل الآثار للطحاوی''، وغیرہ جیسی عظیم کتابیں طبع ہوئیں، اور اہل علم کو ان سے استفادہ کا موقع ملا، اسی طرح مولانا ابوالوفاء افغانی کے قائم کردہ ادارہ ''لجنۃ احیاء المعارف النعمانیہ'' کی خدمات بھی نا قابل فراموش ہیں، جس سے امام ابو یوسف اور امام محمد کی ''کتاب الآثار'' وغیرہ شائع ہوئیں، صحاح ستہ (سوائے سنن ترمذی) کے مترجم اور مفردات حدیث پر عربی اُردو لغت کے مؤلف نواب وحید الزماں حیدرآبادی کا قیام اسی شہر میں تھا اور وہ یہیں کی آغوش میں پروان چڑھے، مولانا شبیر احمد عثمانی کی فتح الملہم کی تالیف میں سابق حکومت حیدرآباد ہی نے مالی تعاون کا تحفہ پیش کیا اور بحمد اللہ اس وقت بھی اس دیار میں تدریس وتالیف اور تحقیق وتعلیق کی صورت میں علم حدیث کی خدمت جاری ہے اور متعدد ایسی درسگاہیں ہیں، جہاں صحاحِ ستہ کا درس ہوتا ہے اور لڑکیوں کے لئے تو دورۂ حدیث تک تعلیم کی درسگاہیں ایک درجن سے زیادہ ہیں۔

حضرات! المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد جہاں اس وقت آپ تشریف فرما ہیں، ایک نو قائم شدہ ادارہ ہے، جس کے قیام پر صرف دس سال پورے ہوئے ہیں، اس کا بنیادی مقصد مختلف اسلامی علوم اور دینی خدمتوں میں بہتر اور باصلاحیت افراد کی تیاری، نیز علماء کو انگریزی زبان اور عصر حاضر کے علوم سے اس حد تک آشنا کرنا کہ وہ زیادہ

بہتر طور پر اسلام کی ترجمانی اور تشریح کرسکیں، تفسیر و حدیث، فقہ اور عصر حاضر میں اسلام کے بارے میں پیدا کی جانے والی غلط فہمیوں کے موضوعات پر تحقیق، غیر مسلم بھائیوں میں دعوتِ اسلام کی کوشش اور دعوت کی عملی جدوجہد اس کے مقاصد میں شامل ہیں، اور یہ ادارہ بتدریج اپنی منزل کی طرف بڑھ رہا ہے۔

اس کا ایک اہم شعبہ حدیث کا بھی ہے، یہاں فقہ حنفی کی معروف کتاب ''بدائع الصنائع'' کی احادیث کی تخریج کا کام پانچ جلدوں میں ہوا ہے، ایک اہم مخطوطہ ''الادلۃ الشریفہ علی مذہب ابی حنیفہ''، علامہ سیوطی کی ''**العرف الوردی فی احادیث المهدی** '' اور شاہ ولی اللہ دہلوی کی ''حجۃ اللہ البالغہ'' کی تخریج بھی عمل میں آئی ہے، ایک فاضل نے اُردو زبان میں حدیث کے سرمایہ کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، اور سن دو ہزار تک کی کتابوں کا تعارف پیش کیا ہے، جن احادیث پر عقلی جہت سے اہل مغرب اعتراض کرتے ہیں، ان پر بھی کام کرایا گیا ہے، موضوع روایات پر اُردو زبان میں ایک تفصیلی مقالہ مرتب ہوا ہے، جس میں وضع حدیث کی تاریخ، علامات، موضوع روایات سے متعلق کتابیں اور زبان زد موضوع روایات کا ذکر کیا گیا ہے اور اُردو زبان میں اس موضوع پر یہ پہلی تفصیلی کتاب ہے، اسی طرح ایک فاضل نے حدیث کی جمع و تدوین کے سلسلے میں مستشرقین اور مستغربین کے اعتراضات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، ایک اور فاضل نے ان مرویات کو جمع کیا ہے، جن میں عہد نبوی اور عہد صحابہ میں کتابت حدیث کا ذکر ہے، یہ مکررات کو حذف کرنے کے بعد حدیثیں ہیں، جو غالباً اس موضوع پر اب تک جمع کی گئی روایتوں میں سب سے زیادہ ہے، ایک فاضل نے ''علماء دیوبند کی خدمات حدیث'' اور ایک اور فاضل نے احناف کی کتب حدیث پر کام کیا ہے، اس وقت طحاوی کی ''**شرح معانی الآثار** '' پر احادیث کی تخریج اور رجال کی تحقیق کا کام بھی ہو رہا ہے اور علامہ ابن رشد قرطبی مالکی کی ''مختصر شرح معانی الآثار'' پر بھی — جو ابھی مخطوطہ کی شکل میں ہے — کوشش کی جارہی ہے کہ حدیث کی اس اہم کتاب کی شایانِ شان خدمت کی جائے۔ **وباللہ التوفیق وھو المستعان .**

معہد میں مختلف موضوعات پر محاضرات و سیمینار اور ورکشاپ کا اہتمام ہوتا رہتا ہے، اس سال بھی تربیت قضاء، اسلامی فینانس، طریقۂ تعلیم، فلکیات، طب سے متعلق وہ مباحث جن سے احکام شرعیہ متعلق ہیں، وغیرہ پر ورکشاپ منعقد ہوئے ہیں، اتفاق سے حدیث کے موضوع پر کم پروگرام رکھے جاسکے ہیں، اس لئے اس وقت اُصولِ حدیث اور تخریج حدیث پر اس ورکشاپ کا انعقاد بڑی مسرت اور اس سے بڑھ کر سعادت کی بات ہے، جو علم وادب کی اس بستی کو حاصل ہورہی ہے، ہم سب کے شکریہ و امتنان کے مستحق ہیں، ڈاکٹر محی الدین محمد عوامہ حفظہ اللہ، جو خود بڑے فاضل ہیں اور ان کے والد ماجد محدث العصر شیخ محمد محمد عوامہ حفظہ اللہ (تلمیذ رشید فقیہ و محدث شیخ عبدالفتاح ابوغدہ نور اللہ مرقدہ) ہیں، جن کی محدثانہ کاوشیں محتاج اظہار نہیں اور شیخ عبدالفتاح تو علماء ہند کے لئے ہمیشہ آنکھوں کا نور اور دل کا سرور رہے ہیں، وہ خود اپنے عہد کے محدث کبیر علامہ زاہد الکوثری کے شاگرد تھے، اس

طرح یہ علمی زنجیر سلسلۃ الذہب کی حیثیت رکھتی ہے، ہمارے مہمان معزز اسی زنجیر کی ایک کڑی ہیں اور انھیں براہ راست یا بالواسطہ ان بزرگوں سے استفادہ کا موقع ملا ہے، وہ ایمان وروحانیت اور علم وادب کی سرزمین شام کے رہنے والے ہیں اور اس وقت حرم مدنی میں قیام پذیر ہیں اور ہماری حقیر دعوت پر یہاں تشریف لائے ہیں، دُعاء ہے کہ اللہ ان کے علم وعمل اور صحت وحیات میں خوب خوب برکت عطا فرمائے اور انھیں اپنے والد محترم کا مکمل جانشین بنائے۔

حضرات! ہم اس اہم موقع پر آپ حضرات کے بھی شکر گذار ہیں کہ تدریسی اعتبار سے ایسے اہم اور نازک وقت میں آپ نے ہماری حقیر دعوت پر لبیک کہا اور یہاں تشریف لائے اور ہم اُمید رکھتے ہیں کہ انشاء اللہ یہ ورکشاپ اپنے مقصد میں کامیاب اور ثمر آور ہوگا اور ہمارے نوجوان فضلاء اور اساتذہ میں علم وتحقیق کا نیا حوصلہ پیدا کرنے کا باعث بنے گا، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی مرضیات پر قائم رکھے اور اپنی منہیات سے بچائے۔

ربنا تقبل منا إنک أنت السميع العليم .

○ ○ ○

اسلام کے اُصولِ قانون ☆

خالدسیف اللہ رحمانی

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین ومن تبعھم باحسان إلی یوم الدین .

صدر عالی قدر، مہمانان ذی احترام، دانشوران گرامی، ہندوستان بھر کی مختلف دینی درسگاہوں سے آئے ہوئے اساتذہ کرام اور طلبۂ عزیز!

اسلامی علوم میں فقہ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے، یہ ایک طرف قرآن وحدیث کا عطر ہے اور دوسری طرف ہر لمحہ رواں دواں زندگی سے مربوط ہے اور غور کیا جائے تو اس علم کا رشتہ تمام ہی اسلامی علوم سے ہے، قرآن وحدیث تو فقہ کے اصل مآخذ ہیں؛ اس لئے فقہ کا طالب علم تفسیر وحدیث سے مستغنی نہیں ہوسکتا، فقہ میں ارتداد اور الفاظ کفر کے تحت کلام وعقیدہ کے بھی بہت سے مسائل آجاتے ہیں، فقہاء نے اخلاقی احکام جیسے جھوٹ، غیبت، ریا اور کبر کو بھی اپنی تحقیق کا موضوع بنایا ہے اور خاص کر حنفیہ کے یہاں حظر واباحہ کے باب میں اس سلسلہ کے بہت سے مسائل ملتے ہیں؛ اس لئے کہا جاسکتا ہے کہ تزکیہ واحسان اور علم الاخلاق کی روح بھی اس میں سمٹ گئی ہے، عربی زبان وادب، نحو وصرف کے قواعد اور بلاغت کے اُصول سے بھی ایک فقیہ کا واقف ہونا ضروری ہے؛ تاکہ کتاب وسنت کے الفاظ کا مصداق صحیح طور پر متعین کرسکے؛ اس لئے یہ کہنا بے جا نہیں ہوگا کہ بعض جہتوں سے فقہ تمام اسلامی علوم کا مغز اور اس کا نچوڑ ہے۔

علم فقہ کے معاون کئی علوم ہیں جن میں سرفہرست اُصولِ فقہ ہے؛ کیوں کہ فقہ دراصل معتبر علماء کے اجتہادات اور استنباطات کا مجموعہ ہے اور اجتہاد کا طریقہ اُصولِ فقہ ہی کے ذریعہ معلوم ہوتا ہے؛ اس لئے یہ اہم بلکہ اہم ترین فن ہے اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ باضابطہ طریقہ پر اُصولِ قانون کو سب سے پہلے مسلمان علماء نے ہی مرتب کیا ہے، مستشرقین — جو مشکل ہی سے مسلمانوں کے علمی وفکری کمالات کا اقرار کرتے ہیں — کو بھی اعتراف ہے کہ

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد کے اشتراک سے حیدرآباد میں 'اسلام کے اُصولِ قانون' کے موضوع پر ایک تربیتی سیمینار منعقد کیا تھا، یہ اسی موقع کا کلیدی خطبہ ہے۔

اس فن کوسب سے پہلے مسلمانوں نے وجود بخشا ہے اوراس میں کوئی شبہ نہیں کہ مسلمان فقہاء نے نہایت دقتِ نظر، گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اسلام کے اُصول وقانون کو مدون کیا ہے اوران کو صرف ایک نظریہ کی حیثیت سے پیش نہیں کیا؛ بلکہ منطبق کر کے دکھایا ہے۔

حضرات گرامی! اس اہم علم سے متعدد فوائد متعلق ہیں :

۱- اسی فن کے ذریعہ اجتہاد اور اخذ واستنباط کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور احکام پر منصوص اور قیاسی دلائل قائم کئے جاسکتے ہیں؛ اسی لئے اس علم کا فائدہ صرف فقہ ہی میں نہیں ہے؛ بلکہ تمام شرعی علوم میں ہے، اُصولِ فقہ جہاں استنباط کی صلاحیت پیدا کرتا ہے، وہیں اجتہاد واستنباط میں ہونے والی فکری غلطی سے بھی بچاتا ہے اوراس علم کے حامل کے لئے زبان وبیان کے مختلف اسالیب کو سامنے رکھتے ہوئے احکام کے درجات کو متعین کرنا بھی آسان ہوجاتا ہے۔

۲- یہ فن کتاب وسنت کی غلط تعبیر اور دین کی غلط تشریح کرنے والوں پر رد اوران کے شبہات کے ازالہ کے لئے بڑی اہمیت کا حامل ہے؛ کیوں کہ اُصولِ فقہ کے ذریعہ ہی استدلال واستنباط کی غلطی کو سمجھا اور آشکارا کیا جاتا ہے۔

۳- اُصولِ فقہ کے ذریعہ تمام ہی علوم شرعیہ — تفسیر، حدیث اور فقہ — میں بصیرت حاصل ہوتی ہے؛ بلکہ درایتی پہلو سے حدیث کی نقد وتحقیق کے قواعد عام طور پر اُصولِ فقہ ہی کے ذیل میں بیان کئے گئے ہیں، جن سے نہ صرف حدیث کے معانی اخذ کرنے میں فائدہ اُٹھایا جاسکتا ہے؛ بلکہ متن حدیث کی شہادت اور خارجی قرائن کی روشنی میں حدیث کے معتبر اور نامعتبر ہونے کا فیصلہ کرنے میں بھی ان کی بڑی اہمیت ہے۔

۴- ہر دور میں جو نئے مسائل پیدا ہوتے ہیں، ان پر احکام شرعیہ کی تطبیق اُصولِ فقہ میں درک ومہارت کے بغیر نہیں کی جاسکتی، خود اس دور میں پیدا ہونے والے بہت سے مسائل — عرف، مصالح مرسلہ، ضرورت وحاجت، سد ذریعہ اور قیاس وغیرہ — سے متعلق ہیں، جب تک اُصولِ فقہ پر نظر نہیں ہوگی، ان پیش آمدہ مسائل کے بارے میں درست رائے قائم کرنا بھی ممکن نہیں ہوگا۔

غرض کہ اُصولِ فقہ ایک عظیم الشان علم شرعی ہے، اگر ''ادلۂ شرعیہ'' (کتاب وسنت اور اجماع وقیاس) علم ومعرفت کا خزانہ ہیں، تو اُصولِ فقہ اس کی کلید۔

حضرات! اسلامک فقہ اکیڈمی نے اسی اہمیت کے پیش نظر یہ تربیتی کیمپ رکھا ہے؛ اگر ہم اس علم کی روشن تاریخ پر نظر ڈالیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ علوم اسلامی کی تدوین کے بالکل ابتدائی دور میں ہی یہ اہل علم کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا، اس فن کے مدون اول کی حیثیت سے اہل تشیع نے عام طور پر امام باقرؒ کا ذکر کیا ہے؛ مگر اس پر کوئی علمی

شہادت موجود نہیں ہے، اہل سنت نے امام ابوحنیفہؒ، امام شافعیؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کا ذکر کیا ہے، امام شافعیؒ کی کتاب ''الرسالة'' اس موضوع کی پہلی کتاب کی شکل میں آج بھی موجود ہے؛ لیکن ابن قطلو بغا، علامہ موفق الدین ، علامہ ابن ندیم اور علامہ ابن ہمام نے نقل کیا ہے کہ امام ابو یوسفؒ کی تصنیف اس موضوع پر پہلی تصنیف ہے، موجودہ دور میں اس پر ایک واقعاتی شہادت بھی حاصل ہوگئی ہے ، کہ علامہ ابوالحسین بصری معتزلی کی کتاب ''المعتمد فی أصول الفقه'' جوطویل عرصہ سے مخطوطہ کی شکل میں تھی ، زیور طبع سے آراستہ ہوگئی ہے اور اس میں کثرت سے امام ابو یوسف کی کتاب سے اقتباسات نقل کئے گئے ہیں۔

اس کے بعد یہ علم مسلسل ارتقا پذیر رہا اور تالیف کے اعتبار سے اس میں مختلف مناہج اختیار کئے گئے ، جن میں ایک طریق ''طريق الشافعية'' یا ''طريق المتكلمين'' کہلاتا ہے، جس میں اُصولِ قانون کوان کی تطبیقات اور جزئیات سے قطع نظر کرتے ہوئے دلائل کی روشنی میں پیش کیا جاتا ہے، علامہ ابن حزم، علامہ ابوالولید باجی، علامہ ابواسحاق شیرازی، امام الحرمین جوینی، امام غزالی، امام رازی رحمہم اللہ وغیرہ جیسے اہل علم نے اس نہج پر اعلیٰ درجہ کی کتابیں تصنیف کی ہیں، دوسرا منہج وہ ہے جسے ''طريقة الفقهاء'' یا ''طريقة الحنفية'' کہتے ہیں، جس میں جزئیات کو بنیاد بنا کر اُصول مقرر کئے جاتے ہیں اور اُصول اور ان کی جزئیات کے باہمی ربط کو واضح کیا جاتا ہے، امام بکر جصاص رازی، قاضی ابوزید دبوسی، فخر الاسلام بزدوی اور شمس الائمہ سرخسی وغیرہ کی تالیفات اسی منہج پر ہیں —— اسی طرح ایک اور رجحان ان دونوں مناہج کی خوبیوں کو جمع کرتے ہوئے اُصولِ فقہ کی تالیف کا شروع ہوا، اس سلسلہ کی پہلی کاوش علامہ مظفر الدین ابن الساعاتی حنفی کی ہے، ان کے علاوہ علامہ تاج الدین عبدالوہاب سبکی، علامہ کمال الدین ابن ہمام وغیرہ کی تالیفات اس نہج پر اہم شمار کی گئی ہیں اور اسی طریقہ کو بعد کے ادوار میں زیادہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

اس موقع پر ایک اور خدمت کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ آٹھویں صدی ہجری میں علم وتحقیق کے مطلع پر بدر منیر بن کر علامہ ابو اسحاق شاطبی مالکی (م: ۷۹۰ھ) پیدا ہوئے اور انھوں نے اپنی مایۂ ناز تالیف ''الموافقات'' مرتب فرمائی، جس کا نام انھوں نے ابتداءً ''التعريف باسرار التكليف'' رکھا تھا، انھوں نے اُصولِ فقہ کے مسائل کو بیان کرنے کے لئے ایک جدید اور نہایت منطقی اور دل پذیر اُسلوب اختیار کیا اور اپنی کتاب کے قابل لحاظ حصہ کا موضوع ''مقاصدِ شریعت'' کو بنایا اور اسے اس خوبی کے ساتھ پیش کیا کہ اس کتاب سے نہ صرف فقہ کے اُصول معلوم ہوتے ہیں؛ بلکہ احکام شریعت کی مصالح، اس کی عقل اور انسانی ضرورت سے ہم آہنگی اور زندگی کی فطری ضرورتوں کو پورا کرنے کی صلاحیت بھی واضح ہوتی ہے۔

موجودہ دور میں اُصولِ فقہ کو اس انداز پر مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ اہل سنت والجماعت کے تمام

دبستانِ فقہ کا نقطۂ نظر سامنے آجائے ، ایسی کوششوں میں شیخ ابوزہرہ ، شیخ خضری بک ، شیخ عبدالوہاب الخلاف اورڈاکٹر وہبہ زحیلی کی کاوشیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، ہندوستان کے علماء نے اُصولِ فقہ کے مقابلہ حدیث وفقہ کو زیادہ اپنی توجہ کا مرکز بنایا ہے ؛ لیکن اُصولِ فقہ کے میدان میں بھی ان کی کاوشیں قابل لحاظ ہیں ، اس سلسلہ میں خاص طور پر ملا عبدالحکیم سیالکوٹی (متوفی : ۱۰۶۶ھ) کی ''حاشیہ تلویح وتوضیح'' ، علامہ محبّ اللہ بہاری (متوفی : ۱۱۱۹ھ) کی ''**مسلم الثبوت**'' اوراس پر بحر العلوم مولانا عبدالعلی فرنگی محلی (متوفی : ۱۲۲۵ھ) کی ''**فواتح الرحموت**'' ، نیز شاہ ولی اللہ دہلوی کی ''**اسباب الاختلاف**'' اور ''**عقد الجید**'' مولانا عبدالحئ فرنگی محلی کے متعدد رسائل ، شاہ اسماعیل شہید کی ''**اصول الفقہ**'' نواب صدیق حسن خاں (متوفی : ۱۳۰۸ھ) کے قلم سے علامہ شوکانی کی ''**ارشاد الفحول**'' کی تلخیص ''**حصول المامول**'' اور ایک ہندوستانی مصنف کے قلم سے اصول الشاشی کی شرح ''**فصول الحواشی**'' ، نیز محبّ گرامی مولانا عبیداللہ اسعدی کی ''**الموجز فی أصول الفقه**'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں ، اُردو زبان میں اُصولِ فقہ کے موضوع پر متعدد مختصر یا مفصل نیز نصابی اور مطالعاتی کتابیں موجود ہیں ، جن میں اس حقیر کی تالیف ''آسان اُصولِ فقہ'' بھی شامل ہے ۔

اس عہد میں اُصولِ فقہ کے موضوع پر جو گرانقدر خدمات انجام دی گئی ہیں ، ان میں ایک قابل ذکر خدمت یہ ہے کہ اگر چہ کہ مقاصدِ شریعت کا موضوع بہت پہلے سے اُصولِ فقہ کا حصہ رہا ہے اوراس سلسلہ میں امام الحرمین ، امام غزالی ، علامہ عزالدین بن عبدالسلام وغیرہ کی تحریریں موجود ہیں ، نیز بعد میں ــــ اس کو جیسا کہ مذکور ہوا ــــ علامہ ابواسحق شاطبی نے اوجِ کمال تک پہنچایا ہے ؛ لیکن چوں کہ نئے مسائل کو حل کرنے میں مقاصدِ شریعت کی بڑی اہمیت ہے ؛ کیوں کہ مقاصد کی حیثیت دائمی اُصولوں کی ہے اور وہ شریعتِ اسلامی کے مزاج ومذاق کو ظاہر کرتے ہیں ؛ اس لئے نئے مسائل کو حل کرنے میں ان سے بڑی مدد ملتی ہے ، اسی پس منظر میں موجودہ عہد کے بعض محقق علماء نے اس کو ایک مستقل فن کی حیثیت سے اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے اور نہایت گہرائی کے ساتھ اُصول وقواعد منقح کئے ہیں ، اس سلسلے میں المعہد العالمی للفکر الاسلامی کی خدمات نمایاں اور قابل قدر ہیں ؛ البتہ یہ کہنا مداہنت ہوگا کہ مقاصدِ شریعت کے حوالہ سے ماضی قریب میں جو اجتہادات سامنے آئے ہیں ، وہ سب کے سب قابل قبول ہیں ؛ کیوں کہ جو احکام نصوص میں مذکور ہوں اور ان کے بارے میں یہ صراحت نہیں ہو کہ وہ ایک مخصوص زمانہ کے لئے ہیں ، تو ان کی حیثیت دین کی حدود اربعہ کی ہے اور وہ دائمی ہیں ، مقاصدِ شریعت کے عنوان پر اس میں ترمیم نہیں ہوسکتی ۔

حضرات ! آج جس شہر میں آپ حضرات کا استقبال کیا جارہا ہے ، وہ ہندوستان کا ایک علم خیز اور علم پرور خطہ رہا ہے ، جسے ماضی میں ''بغدادِ ہند'' کہا جاتا تھا اور جس کے چپہ چپہ پر اسلامی ثقافت کی چھاپ اس طرح نمایاں تھی ، جیسے کسی نیلگوں سمندر میں سورج کا عکس ، محمد قلی قطب شاہ نے ۹۹۹ھ مطابق ۱۵۹۰ء میں اس شہر فرخندہ بنیاد کی خشت

اول رکھی تھی اور دکنی اُردو میں اپنے خالق سے دُعاء کی تھی :

مرا شہر لوگوں سوں مامور کردے

شاید یہ قبولیتِ دُعاء کا وقت تھا، اسی لئے یہ دُعاء ایسی مقبول ہوئی کہ نہ صرف یہ بستی بسی اور یہ ویرانہ آباد ہوا؛ بلکہ یہاں سے علم وادب کے چشمے بھی پھوٹے اور ایک عالَم نے اس سے فیض حاصل کیا، قلی قطب شاہ کو خود اپنے اس انتخاب پر ایسا ناز تھا کہ بعد میں انھوں نے کہا :

لطیف و دل کشا آب و ہوائے

مبارک منزلے فرخندہ جائے

اس شہر نے صرف بانیٔ شہر ہی سے نہیں ؛ بلکہ ہر دور میں مختلف اہل علم وادب سے خراج تحسین وصول کیا ہے، مشہور شاعر ذوق کے استاذ شاہ نصیر نے اس شہر کو بہشت قرار دیا، داغ کو یہ شہر یورپ کے حسن وآرائش میں مشہور شہر ــــ پیرس ــــ کا ہم پلہ نظر آتا ہے، کہتے ہیں :

نہیں حیدرآباد پیرس سے کچھ کم

یہاں بھی سجے ہیں مکاں کیسے کیسے

ہندوستان کے بڑے گرامی قدر علماء مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ ، مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی ، پروفیسر الیاس برنی ، مولانا عبدالقدیر بدایونی ، مولانا حافظ محمد احمد دیوبندی ، علامہ شبلی نعمانی ، مولانا شبیر احمد عثمانی ، مولانا عبدالماجد دریا آبادی ، مولانا عبدالباری ندوی ، مولانا ابوالوفاء افغانی ، مادحِ رسول ماہر القادری ــــ رحمہم اللہ ــــ اور ان جیسی نہ جانے کتنی شخصیات ہیں جو یہاں خیمہ زن ہوئیں ، اسی سرزمین میں علم وتحقیق اور شعر وسخن کے چراغ جلائے اور دور دور تک اس کی روشنی پہنچی ، اسی طرح فضیلت جنگ مولانا انوار اللہ فاروقی بانی جامعہ نظامیہ ، محدث دکن مولانا عبداللہ شاہ صاحب ، تحریک اسلامی کے بانی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، میدانِ تحقیق کے درِّ بے بہا ڈاکٹر حمید اللہ ، مشہور واعظ مولانا حسام الدین فاضل اور سحر انگیز خطیب نواب بہادر یار جنگ ــــ رحمہم اللہ ــــ اسی سرزمین میں پیدا ہوئے اور یہیں سے ان کا چشمۂ فیض جاری ہوا۔

اس خطہ کو داعیانِ اسلام اور صوفیاء ذی احترام حضرت شاہ خاموش ، شیخ مخدوم علاء الدین انصاری ، شیخین یوسفین اور بابا شرف الدین ــــ رحمہم اللہ ــــ جیسے اہل دل کا مسکن بننے کا شرف بھی حاصل ہوا ، یہیں سے اُردو زبان کے ابتدائی دو اصحاب دیوان شعراء ــــ محمد علی قطب شاہ اور ولی دکنی ــــ کا نغمۂ جاں فزا بلند ہوا اور اُردو شاعری کی بنیاد پڑی ، امجد حیدرآبادی جیسے مصلح اور مخدوم محی الدین جیسے انقلابی ، نیز منفرد لب ولہجہ کے شاعر شاذ تمکنت اسی ارض ادب کی پیداوار میں سے ہیں ، خاص کر اُردو نظم وغزل اور مزاح میں اس شہر کی ہمیشہ سے ایک شناخت رہی ہے

اوراس گئے گزرے دور میں بھی اس کی یہ شناخت باقی ہے۔

اسی شہر میں دائرۃ المعارف العثمانیہ کی ۱۹۲۳ء میں بنیاد پڑی ،جس کے محرک فضیلت جنگ حضرت مولانا انوار اللہ فاروقی تھے،اس ادارہ نے ایک سوچھبیس سال کے عرصہ سے میں ایک سوستر کتابوں کو آٹھ سوجلدوں میں شائع کیا ہے،۲۲رجلدوں میں ابوالحسن ابراہیم بقاعی کی نادر تفسیر''**نظم الدرر فی تناسب الآیات و السور**'' اُصول حدیث پر لکھی گئی ابتدائی تالیفات''**الکفایة فی علم الروایه للخطیب البغدادی**''اور''**معرفة علوم الحدیث للحاکم النیشابوری**'' حدیث میں علامہ متقی ہندی کی''**کنز العمال**''علامہ حاکم نیشاپوری کی ''**المستدرک علی الصحیحین**''علامہ ابوبکر بیہقی کی''**السنن الکبریٰ مع الجوهر النقی لابن الترکمانی**''ابوالمؤید خوارزمی کی''**جامع مسانید الامام الأعظم أبی حنیفة**''امام ابوجعفر طحاوی کی ''**مشکل الآثار**''رجال واسانید میں''**الاستیعاب لابن عبد البر ، تذکرة الحفاظ للذهبی ، تهذیب التهذیب لابن حجر**''امام بخاری کی''**التاریخ الکبیر**''مولانا عبدالحیٔ حسنی کی''**نزهة الخواطر**''سیرت نبوی میں علامہ جلال الدین سیوطی کی''**الخصائص الکبریٰ**''فقہ میں امام محمد کی''**کتاب الأصل**''اور مختلف اسلامی وعربی علوم وفنون میں نہ جانے کتنی اہم کتابیں ہیں، جو پہلی بار اسی ادارے سے شائع ہوئیں اور اصحابِ علم وتحقیق کی آنکھوں کا سرمہ بنیں۔

یہیں دارالترجمہ قائم تھا،جس میں اسلامی وسائنسی علوم اور تاریخ وقانون وغیرہ کی سینکڑوں کتابوں —— جو عربی اور یورپی زبانوں میں تھیں —— کو اُردو کا جامہ پہنایا گیا،اب افسوس کہ یہ عظیم اُردو ذخیرہ آخر تعصب کی بھینٹ چڑھ گیا اور کچھ شر پسندوں نے اس عظیم علمی امانت کو نذر آتش کر کے تاتاریوں کی علم دشمنی کی تاریخ کو تازہ کردیا، یہ شہر اپنے کتب خانوں کے لئے بھی مشہور رہا ہے اور یہاں کی مخطوطات کی لائبریری اسلامی اور عربی مخطوطات کی کثرت کے اعتبار سے خدا بخش لائبریری پٹنہ کی ہم پلہ ہے اور دنیا کی منتخب لائبریریوں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے، آج بھی اس شہر میں متعدد بیش قیمت لائبریریاں موجود ہیں،یہیں اُردو کی پہلی یونیورسٹی عثمانیہ یونیورسٹی کا قیام عمل میں آیا،افسوس کہ انڈین یونین کے انضمام کے بعد اس کا لسانی کردار ختم کردیا گیا،اُردو کی دوسری یونیورسٹی مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی بھی آج اسی شہر میں قائم ہے، یونیورسیٹیاں، ماڈرن ایجوکیشن کے اقلیتی اداروں اور دینی مدارس وجامعات کی کثرت،موجودہ حالات میں بھی اس شہر کی پہچان ہیں،الغرض کہ حیدرآباد کی عظمت رفتہ پر اگر چہ کہ عداوت وعناد کے گہرے زہر آلود تیر آزمائے گئے ؛لیکن اس شہر نے ایک نئی صبح اور نئی زندگی کے ساتھ کروٹ لی ہے اور آج نہ صرف ہندوستان ؛ بلکہ دنیا کے نقشہ پر اس کی ایک پہچان ہے۔

حضرات ! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا جو اس پروگرام کی اصل داعی ہے، کا قیام فقیہ الامت حضرت مولانا

قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کے ہاتھوں بیس سال پہلے عمل میں آیا، عصر حاضر میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل کا شریعت کی روشنی میں حل تلاش کرنا، اجتماعی غور وفکر کے ذریعہ ایسے مسائل کے بارے میں اُمت کی رہنمائی کرنا، نوجوان فضلاء کی فقہی و علمی تربیت کرنا اور جدید فکری اور فقہی مسائل پر مستند اور معیاری لٹریچر فراہم کرنا، نیز ہندوستان اور عالم اسلام کے علماء اور علمی اداروں کی خدمات سے ایک دوسرے کو واقف کرانا اس ادارہ کے اہم مقاصد ہیں؛ چنانچہ نئے مسائل کے حل کے لئے اکیڈمی نے اب تک اٹھارہ عالمی سطح کے سیمینار کئے ہیں، جن میں ڈیڑھ سو سے زیادہ فقہی فیصلے کئے گئے، ان فیصلوں کو نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں بھی قدر ووقعت کی نظر سے دیکھا گیا ہے، تربیتی نقطۂ نظر سے اس نے ملک کے مختلف علاقوں میں ۲۴ پروگرام رکھے ہیں، جن سے دینی مدارس اور عصری درسگاہوں کے سینکڑوں فضلاء نے استفادہ کیا ہے، اس نے اہم ترین علمی و فقہی موضوعات پر تقریباً سو کتابیں شائع کی ہیں اور کویت سے شائع ہونے والی عظیم الشان فقہی موسوعہ کی ۴۵ جلدوں کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے اور اکیڈمی کے مختلف سیمیناروں کے مقالات کے تیس سے زیادہ مجموعے طبع ہو چکے ہیں اور تقریباً اتنے ہی باقی ہیں، جو اُردو زبان میں عصر حاضر کے فقہی مسائل پر ایک انسائیکلو پیڈیا کا درجہ رکھتا ہے، اس کے سیمیناروں میں ہندوستان، عالم اسلام اور عالم عرب کے منتخب وممتاز علماء کی شرکت ہوتی رہی ہے اور اس کی انتظامیہ بھی ملک کے جید فقہاء واصحابِ افتاء پر مشتمل ہے، اس وقت آپ جس پروگرام کا افتتاح کر رہے ہیں، وہ بھی ایسی ہی کاوشوں کا ایک حصہ ہے۔

حضرات! المعہد العالی الاسلامی اکیڈمی کا شکر گذار ہے کہ اس نے اسے اس اہم پروگرام کی میز بانی کا موقع دیا اور حیدرآباد جیسے علمی، ادبی اور ثقافتی شہر — جو شمال وجنوب کے سنگم کی حیثیت رکھتا ہے — کا اس اہم پروگرام کے لئے انتخاب کیا، یہ ادارہ فضلاء مدارس کی تربیت اور افراد سازی کے جذبہ کے تحت قائم ہوا ہے، اس ادارہ کا بنیادی ہدف یہ ہے کہ علماء جس میدان میں کام کریں، اس میں بہتر کارکن ثابت ہوں، خواہ وہ تدریس وتعلیم کا میدان اختیار کریں، لوح وقلم کو اپنی خدمت کا وسیلہ بنائیں، دعوت دین کا فریضہ انجام دیں، صحافت کا راستہ اختیار کریں، منبر ومحراب کو زینت بخشیں، تنظیمی کاموں کا حصہ بنیں، اسلام پر ہونے والی فکری یلغار کا جواب دیں، اسلامی مالیاتی اداروں میں رہنمائی کے منصب پر فائز ہوں، جہاں ہوں اور جس کام میں ہوں، وہاں امتیازی حیثیت کے حامل ہوں اور اس کام کو بصیرت، شعور، زمانہ شناسی، دردمندی اور سلیقہ شعاری کے ساتھ انجام دیں۔

بحمد اللہ معہد ان مقاصد کی طرف بتدریج بڑھ رہا ہے، اب تک یہاں سے ۴۳۹ فضلاء نے تربیت حاصل کی ہے، جن میں ایک بڑی تعداد دینی وعصری درسگاہوں میں مختلف مراحل کی تدریس سے وابستہ ہے، تقریباً تیس فضلاء افتاء اور قضاء کی خدمت انجام دے رہے ہیں، ایک درجن سے زیادہ فضلاء وہ ہیں جو اُردو اور انگریزی صحافت سے وابستہ ہیں، چند وہ بھی ہیں جو اسلامی طرز پر کام کرنے والے مالیاتی اداروں میں شرعی رہنمائی پر مامور

ہیں اور ایک بڑی تعداد ماشاء اللہ ان فضلاء کی ہے، جو اپنے اپنے زیر اثر علاقوں میں برادرانِ وطن میں دعوتِ دین کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، اس دس سال کے عرصہ میں قرآنیات، حدیث، فقہ اور دعوت کے متعلق عصری مسائل پر زیر تربیت فضلاء نے جو کام کئے ہیں وہ ۱۱۶ موضوعات پر ہیں اور تقریباً پچاس ہزار صفحات پر مشتمل ہیں، یہ مقالات اُردو، عربی، انگریزی، ہندی، تلگو اور بنگلہ میں لکھے گئے ہیں اور بحمد اللہ نہ صرف ہندوستان کے گوشہ گوشہ سے فضلاء مدارس یہاں رُجوع ہوتے ہیں؛ بلکہ امریکہ، برطانیہ اور ساؤتھ افریقہ تک اس ادارہ کا فیض پہنچ چکا ہے۔

اس وقت ایک ایسے مالیاتی نظام کی ضرورت ہے، جو سود و قمار اور شرعی و اخلاقی قباحتوں سے خالی ہو، یہ نہ صرف اسلامی نقطۂ نظر سے ضروری ہے؛ بلکہ اشتراکیت کی ناکامی، سرمادارانہ نظام کی زبوں حالی، دولت کی تقسیم کے بجائے اس کے ارتکاز کا بڑھتا ہوا رجحان اور محنت کاروں کے ساتھ ظلم و ناانصافی کے پس منظر میں انسانی نقطۂ نظر سے بھی اسلامی نظام معیشت کا قیام بہت بڑی ضرورت ہے، اس وقت ایسے علماء اور مسلمان معاشی ماہرین کی ضرورت ہے جو ایک طرف سرمایہ دارانہ نظام کے نقصانات اور اسلامی نظامِ معیشت کی نافعیت کو واضح کریں اور دوسری طرف اسلامی طرز پر مالیاتی اداروں کی رہنمائی کرسکیں، اسی مقصد کے تحت المعہد العالی الاسلامی فارغین افتاء کے لئے اسلامک فائنانس کا کورس شروع کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ جولائی ۲۰۱۰ء سے معاشیات پڑھے ہوئے عصری اداروں کے طلبہ کے لئے بھی اس کورس کا آغاز کرے، چنانچہ آج کے اس اجلاس سے فارغین افتاء کے لئے رسمی طور پر اسلامک فائنانس کا آغاز کیا جارہا ہے۔

اخیر میں صدر اجلاس کے ہم شکر گزار ہیں کہ جن کے ذریعہ اس پروگرام کو رونق حاصل ہو رہی ہے، ہم اپنے عرب مہمانوں —— ڈاکٹر صلاح سلطان، ڈاکٹر عبد المجید سوسوا اور ڈاکٹر مسفر قحطانی —— کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں، جنھوں نے اکیڈمی کی دعوت پر سفر کی زحمت گوارا کی اور ہندوستان کے نوجوان اساتذۂ فقہ اور منتہی طلبہ کو استفادہ کا موقع دیا، ہم مہمانانِ خصوصی کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں کہ آپ یہاں تشریف لائے اور آپ تمام شرکاء اور ہندوستان کے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے اساتذہ وطلبہ کے بھی شکر گزار ہیں کہ آپ نے ہماری حقیر آواز پر لبیک کہا اور سب سے بڑھ کر حمد وستائش اور شکر و سپاس اللہ کے لئے ہے کہ :

جو کچھ ہوا ہے ، ہوا ہے کرم سے تیرے
جو بھی ہوگا ، تیرے کرم سے ہوگا

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين

○ ○ ○

موجودہ عہد میں اسلامی قانون کی اہمیت ☆

خالدسیف اللہ رحمانی

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید المرسلین ،
وعلیٰ آلہ وصحبہ اجمعین ، وعلیٰ من تبعھم باحسان الی یوم الدین .

صدرِ عالی قدر، بزرگانِ محترم، حضرات گرامی! اللہ تعالیٰ کا شکر واحسان ہے کہ اس وقت ہم آفاقی شہرت کی حامل ایک تاریخی دانش گاہ میں جمع ہیں، جس کے بانی کی بنیادی فکر تھی کہ ہمارے دائیں ہاتھ میں قرآن مجید ہو، بائیں ہاتھ میں سائنس اور سر پر ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ '' کا تاج — بانی کے اخلاص اور ان کی حسن نیت کا ثمرہ ہے کہ آج علم ودانش کے اس مہر عالم تاب کی کرنیں پوری دنیا میں پھیل رہی ہیں اور انشاء اللہ ہمیشہ پھیلتی رہیں گی، اللہ اسے نظر بد سے محفوظ رکھے، اس لئے اس جگہ سے زیادہ مناسب اور زیادہ بہتر شاید کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی تھی، جہاں ''موجودہ عہد میں اسلامی قانون کی معنویت'' پر یہ مذاکرہ منعقد ہوتا۔

حضرات! انسان کی خواہشات، اس کی چاہتیں اور آرزوئیں جن کو قرآن نے ''امانی'' سے تعبیر کیا ہے، (النساء:۱۲۳) بے شمار اور بے نہایت ہیں؛ جب کہ اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کو اس کی تمام تر وسعت کے باوجود محدود وسائل کا حامل بنایا ہے، اس دنیا میں انسان کی ضرورتیں تو پوری ہوسکتی ہیں، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ربوبیت کا عین تقاضا ہے اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے ''وَمَا مِنْ دَابَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللهِ رِزْقُهَا ''(ھود:۶) اور رزق میں تمام ضرورتیں شامل ہیں؛ لیکن اس کی نہ ختم ہونے والی سرحد ناآشنا خواہشات پوری نہیں ہوسکتیں، اس کی جگہ دنیا نہیں، آخرت ہے، جو ''مَا تَشْتَهِيْ اَنْفُسَكُمْ '' کی جگہ ہے (فصلت:۳۱) اسی لئے آخرت میں جنت مکیں لوگوں کے درمیان کوئی ٹکراؤ اور تصادم نہیں ہوگا اور ان کے قلوب ہر طرح کے ''غل وغش'' سے پاک ہوں گے؛ مگر اس دنیا میں محدود وسائل کی وجہ سے خواہشات کے درمیان ٹکراؤ ہوگا، اس ٹکراؤ کی وجہ سے ظلم وزیادتی کے واقعات بھی پیش آئیں گے اور جرائم کا ارتکاب بھی ہوگا؛ بلکہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد ہابیل اور قابیل سے ہی اس کا سلسلہ شروع ہوچکا ہے۔ (المائدۃ:۲۸)

☆ اس عنوان سے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے جامعہ ملیہ دہلی میں شعبۂ اسلامیات کے تعاون سے ایک سیمینار منعقد کیا تھا، یہ اس سیمینار کا کلیدی خطبہ ہے۔

اسی کے لئے قانون کی ضرورت پیش آتی ہے، قانون اس تصادم کو روکتا ہے، قانون ہر شخص کے لئے دائرے مقرر کرتا ہے کہ اس کے حقوق اور اختیارات کی حدیں کہاں تک ہیں؟ قانون ظالم کو ظلم سے باز رکھتا ہے اور اس کے جرائم کی سزا دیتا ہے، مظلوم کو انصاف دلاتا ہے اور اس کے حق کو بازیاب کرتا ہے، اس لئے کوئی مہذب انسانی سماج ایسا نہیں ہوسکتا، جو کسی قانون کے بغیر زندگی بسر کرے، جو سماج لاقانونیت پر مبنی ہو، وہ حقیقت میں ''جنگل راج'' کا مصداق ہوگا اور وہاں ''جس کی لاٹھی، اس کی بھینس'' کے اُصول پر جبر وظلم کے سایہ میں لوگوں کو زندگی بسر کرنی ہوگی، اس لئے قانون کی اہمیت اور انسانی سماج کے لئے اس کی ضرورت کا کوئی سمجھدار شخص انکار نہیں کرسکتا۔

اہمیت اس بات کی ہے کہ قانون بنانے کا حق کس کو ہے؟ — بنیادی طور پر دنیا کی تاریخ میں تین قسم کے قوانین پائے جاتے ہیں، شخصی قانون، عوامی قانون اور الہامی قانون، شخصی قانون میں ایک شخص کی زبان اور اس کی سوچ قانون کی اساس ہوتی ہے، تنہا بادشاہ یا ڈکٹیٹر کے فیصلے تمام عوام پر واجب العمل سمجھے جاتے ہیں، آج کی دنیا شاہی نظامِ حکومت کو رد کرچکی ہے، بہت کم ملکوں میں اس طرح کے نظام قائم ہیں اور جہاں ہیں، وہاں بھی بہت سی جگہوں میں بادشاہ کو محض ایک علامتی سربراہ کی حیثیت سے باقی رکھا گیا ہے؛ عوام اپنے منتخب نمائندوں کے واسطہ سے خود قانون بناتے ہیں، جسے ہم ''جمہوریت'' کہتے ہیں، آج کی دنیا میں یہ ایک آئیڈیل، پسندیدہ اور مقبول ترین نظام حکومت ہے، جو ہمارے ملک میں بھی جاری ہے؛ بلکہ کہا جاتا ہے کہ ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت ہیں، ان دونوں نظام ہائے حکومت میں انسان کو قانون بنانے کا اہل مانا جاتا ہے اور وہی قانون کا اصل سرچشمہ ہوتا ہے، چاہے شاہی فرامین ہوں، عوام کے منتخب نمائندوں کے فیصلے ہوں یا حکومت کے نامزد عوامی نمائندوں کے فیصلے، یا وہ رسوم ورواجات جنھیں عوامی مقبولیت حاصل ہوگئی ہے۔

اس کے مقابلہ قانون کی ایک قسم وہ ہے جو الہام پر مبنی ہے، یعنی وہ قانون جس کی بنیاد مذہب پر ہے اور مذہب وجود میں آتا ہے خدا کے تصور سے، اس لئے اہل مذہب اپنے قوانین کے بارے میں خیال رکھتے ہیں کہ یہ خدا کا بھیجا ہوا قانون ہے، جو کسی ذریعہ سے انسانیت تک پہنچا ہے، اسلام بنیادی طور پر اسی کا قائل ہے؛ چنانچہ اسلام کی نگاہ میں قانون بنانے اور حلال وحرام کو متعین کرنے کا حق صرف اللہ تعالیٰ کو ہے، إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ، (الانعام:۵۷) وَلَهُ الْأَمْرُ (الاعراف:۵۴)؛ کیوں کہ پوری انسانیت کے لئے وہی ذات نظامِ حیات کو طے کرسکتی ہے، جو ایک طرف پوری کائنات کے بارے میں باخبر ہو اور پوری انسانیت کے جذبات واحساسات اور اس کی خواہشات وضروریات، نیز اس کے نفع ونقصان اور اشیاء کے نتائج واثرات سے پوری طرح واقف ہو؛ کیوں کہ اگر وہ ان حقیقتوں کا علم نہیں رکھتا ہو، تو عین ممکن ہے کہ اس کے دیئے ہوئے بعض احکام نفع کے بجائے نقصان اور خیر وفلاح

کے بجائے ناکامی وخسران کا باعث بن جائیں۔

دوسری طرف وہ تمام انسانی طبقات کے ساتھ عدل وانصاف کا برتاؤ کرسکتا ہو، کالے گورے، امیر وغریب، مرد وعورت، رنگ ونسل اور زبان ووطن کی بنیاد پر ان کے درمیان کوئی تفریق روا نہ رکھتا ہو — اور ایسی ذات خدا ہی کی ہوسکتی ہے؛ کیوں کہ وہ علیم وخبیر بھی ہے اور عادل ومنصف بھی۔

انسان یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ کائنات کی تمام اشیاء کے فائدہ ونقصان اور پوری انسانیت کے جذبات واحساسات سے واقف ہے؛ بلکہ وہ تو اپنے آپ سے بھی پوری آگہی کا مدعی نہیں ہوسکتا، اور ہر انسان چوں کہ کسی خاص رنگ ونسل، کنبہ وخاندان اور زبان وعلاقہ کی وابستگی کے ساتھ ہی پیدا ہوتا ہے اور یہ وابستگی اس میں فطری طور پر ترجیح وطرفداری کا ذہن پیدا کرتی ہے؛ اس لئے کسی انسان یا انسانی گروہ کے بارے میں یہ بات نہیں سوچی جاسکتی کہ وہ تمام انسانوں کے ساتھ مساوی طریقہ پر عدل وانصاف کا برتاؤ کرے گا؛ اس لئے خدا کا بھیجا ہوا قانون انسانی قانون کے مقابلہ یقیناً برتر وفائق اور مبنی برانصاف ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے جس دن سے کائنات کی یہ بستی انسانوں سے بسائی ہے، اسی دن سے انسان کو زندگی بسر کرنے کے طریقہ کی بھی تعلیم دی ہے، پھر انسانی تمدن کے ارتقاء کے اعتبار سے وقتاً فوقتاً نئے احکام بھی دیئے جاتے رہے ہیں، نیز قانون کی گرفت کو کمزور کرنے کے لئے انسان نے آسمانی ہدایات میں اپنی طرف سے آمیزشیں بھی کی ہیں، ان تحریفات اور آمیزشوں سے پاک کرنے کی غرض سے رب کائنات کی طرف سے انسانیت کے لئے نئے بے آمیز ہدایت نامے آتے رہے ہیں، اس سلسلہ کی آخری کتاب قرآن مجید کی صورت میں پیغمبر اسلام محمد رسول اللہ ﷺ پر نازل ہوئی، یہ کوئی نیا قانون اور مکمل طور پر نئی شریعت نہیں ہے؛ بلکہ اسی قانون کا تسلسل ہے، جو مختلف ادوار میں پیغمبروں کے واسطہ سے انسانیت تک پہنچتا رہا ہے۔

محترم حضرات! شریعتِ اسلامی کو جو باتیں انسان کے خود ساختہ قوانین سے ممتاز کرتی ہیں، ان میں سے چند کا ذکر یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے :

۱- عدل

شریعتِ اسلامی کا سب سے امتیازی پہلو اس کا عدل ہے، اس دین کی بنیاد ہی عدل پر ہے، إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْإِحْسَانِ، (النحل:۹۰) اسلام کی نگاہ میں رنگ ونسل، جنس اور قبیلہ وخاندان کی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَآ أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّأُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَّقَبَآئِلَ

لِتَعَارَفُوْا ، اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقَاکُمْ . (الحجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمہیں ایک ہی مرد وعورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو خاندانوں اور قبیلوں میں تقسیم کیا ہے؛ تا کہ ایک دوسرے کو پہچان سکو، بے شک تم میں سب سے زیادہ معزز اللہ کے نزدیک وہ ہے، جو سب سے زیادہ تقوی اختیار کرنے والا ہو۔

رسول اللہ ﷺ نے اس کو مزید واضح فرمایا اور ارشاد ہوا کہ کسی گورے کو کسی کالے پر اور کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے،(۱) اسلام کے تمام قوانین کی اساس اسی اُصول پر ہے، برخلاف انسانی قوانین کے کہ انسانوں نے جو بھی قوانین وضع کئے ہیں، وہ ایک گروہ کی برتری اور دوسرے طبقہ کی تذلیل وحق تلفی پر مبنی رہا ہے، مغربی ممالک میں نصف صدی پہلے تک نسلی تفریق موجود تھی، ساؤتھ افریقہ میں تو یہ تفریق (جو اہل یورپ کی طرف سے مسلط کی گئی تھی) گذشتہ پندرہ بیس سال پہلے تک بھی موجود تھی، آج بھی ان کے آثار وشواہد باقی ہیں، جنھیں دیکھ کر انسانیت کا سر مارے شرم کے جھک جاتا ہے، امریکہ جو دُنیا کی واحد سُپر طاقت ہے، وہاں کی بعض ریاستوں میں آج بھی نسلی امتیاز پر مبنی قوانین موجود ہیں، شہریت کے مختلف درجات مقرر ہیں اور اسی نسبت سے ان کو رعایتیں اور سہولتیں حاصل ہوتی ہیں، بعض ریاستوں میں اب بھی گوری اور کالی نسل کے درمیان شادی نہیں ہوسکتی، اگر کر لی جائے تو یہ شادی غیر معتبر ہوگی اور پانچ سو ڈالر یا چھ مہینہ کی قید یا دونوں سزائیں اس کا ارتکاب کرنے والوں کو دی جائیں گی۔(۲)

۲- توازن واعتدال

شریعتِ اسلامی کا دوسرا امتیازی وصف اس کا ''توازن واعتدال'' ہے، مثلاً مرد وعورت انسانی سماج کے دو لازمی جزو ہیں، دُنیا میں کچھ ایسے قوانین وضع کئے گئے، جن میں عورت کی حیثیت جانور اور بے جان املاک (Property) کی سی قرار دے دی گئی، نہ وہ کسی جائیداد کی مالک ہوسکتی تھی نہ اس میں تصرف کرسکتی تھی، نہ اس کو اپنے مال پر اختیار حاصل تھا نہ اپنی جان پر، یہاں تک کہ اہل علم کے درمیان بحث جاری تھی کہ عورتوں میں انسانی روح پائی جاتی ہے یا حیوانی روح؟ اس کے مقابل دوسری طرف کچھ لوگوں نے عورتوں کو تمام ذمہ داریوں میں مردوں کے مساوی قرار دے دیا، عورتوں کی جسمانی کمزوری، ان کے ساتھ پیش آنے والے قدرتی حالات وعوارض اور طبیعت ومزاج اور قوتِ فیصلہ پر ان کے اثرات کو نظر انداز کر دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہ ظاہر تو اسے عورت کی

---

(۱) مسند احمد:۴۱۱/۵۔

(۲) الرق بيننا وبين أمريكا :۳۹، تاليف : على شحاته۔

حمایت سمجھا گیا؛لیکن انجام کاراس آزادی نے سماج کو بے حیائی،اخلاقی انارکی،نا قابل علاج امراض،خاندانی نظام کا بکھراؤاور خودعورتوں کونا قابل تحمّل فرائض کاتحفہ دیا۔

اسلام نے مردوں اور عورتوں سے متعلق نہایت متوازن قانون دیا ہے ، انسانی حقوق میں مردوں اورعورتوں کومساوی درجہ دیا گیا ہے،وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ،(البقرہ:۲۲۸)لیکن سماجی زندگی میں دونوں کے قویٰ اور صلاحیت کے لحاظ سے فرق کیا گیا ہےاور بال بچوں کی تربیت کی ذمہ داری عورتوں پراور کسبِ معاش کی ذمہ داری مردوں پر رکھی گئی ہے،سماجی زندگی کا یہ نہایت ہی زریں اُصول ہے،جس میں خاندانی نظام کا بقاء،اخلاقی اقدار کی حفاظت اورعورت کونا قابل برداشت مصائب سے بچانا ہے۔

دولت مندوں اور غریبوں،آجروں اور مزدوروں،عوام اور حکومت کے تعلقات اور مجرموں اور جرم سے متاثر مظلوموں کے درمیان انصاف وغیرہ سے متعلق اسلامی تعلیمات کو اگر حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے تو قانونِ شریعت میں جواعتدال نظر آئے گا،گذشتہ اور موجودہ ادوار میں انسانوں کے بنائے ہوئے کسی قانون میں ایسی میانہ روی نہیں ملے گی۔

۳- عقل و مصلحت سے ہم آہنگی

خدا سے بڑھ کر کوئی ذات انسان کی مصلحتوں سے آگاہ نہیں ہوسکتی؛اسی لئے شریعت کے احکام عقل کے تقاضوں اور مصلحتوں کے عین مطابق ہیں،یہاں تک کہ بعض اہل علم نے کہا ہے کہ شریعت تمام تر مصلحت ہی سے عبارت ہےاور ہر حکم شرعی کا مقصد یا تو کسی مصلحت کو پانا ہے،یا کسی نقصان اورمفسدہ کاازالہ:’’ **إن الشريعة كلها مصالح ، إمادرأ مفاسد،أو جلب مصالح**‘‘۔(۱)

اس کے برخلاف انسان کی عقل کوتاہ و نارسا ہےاور بہت سی دفعہ خود اپنے نفع ونقصان کو سمجھنے سے بھی قاصر وعاجز انسان بعض اوقات خواہشات سے اس قدر مغلوب ہوجاتا ہے کہ کسی بات کونقصان جانتے ہوئے بھی اس کو قبول کرلیتا ہے،اس کی واضح مثال شراب ہے،شراب انسان کے لئے نہایت نقصان دہ اوراس کی صحت کو برباد کردینے والی چیز ہے،اس پر اتفاق ہے؛لیکن آج دُنیا کےان تمام ملکوں میں جوانسانی قانون کے زیرسایہ زندگی بسر کررہے ہیں،شراب کی اجازت ہے،غیر قانونی جنسی تعلق اور ہم جنسی کے بارے میں تمام میڈیکل ماہرین متفق ہیں کہ یہ صحت کے لئے نہایت مہلک فعل ہےاور نہ صرف اخلاق کے لئے تباہ کن ہے؛ بلکہ طبی نقطۂ نظر سے بھی زہر ہلاہل سے کم نہیں،اس کے باوجود عوامی دباؤاور آوارہ خیال لوگوں کی کثرت سے مجبور ہوکر بہت سے ترقی یافتہ ملکوں میں ان خلافِ فطرت اُمور کی بھی اجازت دے دی گئی ہے۔

---

(۱) قواعد الاحکام لعز الدین بن عبد السلام:۹/۱۔

اسلامی شریعت کہیں بھی عقل اور حکمت و مصلحت سے برسر پیکار نظر نہیں آتی اور اس کا ایک ایک حکم انسانی مفاد و مصلحت پر مبنی ہے۔

۴- فطرتِ انسانی سے مطابقت

اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا کیا ہے، اسی لئے وہی انسانی فطرت سے بھی پوری طرح واقف ہے اور اس کی بھیجی ہوئی شریعت مکمل طور پر فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ ہے؛ اسی لئے قرآن نے اسلام کو دین فطرت سے تعبیر کیا ہے، فِطْرَۃَ اللہِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْھَا، (الروم: ۳۰) فطرت سے بغاوت ہمیشہ انسان کے لئے نقصان و خسران اور تباہی و بربادی کا سبب بنا ہے، انسان کے بنائے ہوئے قانون میں فطرت سے بغاوت کا رجحان قدم قدم پر ملتا ہے، مثلاً اللہ تعالیٰ نے عورت کی فطرت میں جلد بازی، زود رنجی اور بعجلت قدم اُٹھانے کا مزاج رکھا ہے؛ اسی لئے اسلام نے طلاق کا اختیار عورت کے ہاتھ میں نہیں رکھا، مرد کو طلاق کا اختیار دیا اور عورت کے لئے عدلیہ کے واسطہ سے گلوخلاصی کی سہولت دی، مغرب نے مرد و عورت کو مساوی درجہ دیتے ہوئے طلاق کے معاملہ میں بھی دونوں کو یکساں حیثیت دے دی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طلاق کی شرح بہت بڑھ گئی؛ یہاں تک کہ بہت سے ملکوں میں نکاح کے مقابلہ طلاق کی شرح بڑھی ہوئی ہے، خاندانی نظام بکھر کر رہ گیا ہے، اس وقت مغربی سماج اس درد میں کراہ رہا ہے اور رشتوں کی بنیاد محبت کی بجائے خودغرضی پر قائم ہوگئی ہے۔

اسی طرح انسانی فطرت ہے کہ سخت اور مناسب سزائیں ہی انسان کو جرم سے باز رکھ سکتی ہیں اور مجرم کے ساتھ حسن سلوک دراصل مظلوم کے ساتھ ناانصافی اور سماج کو امن سے محروم کردینے کے مترادف ہے؛ اسی لئے اسلام میں قتل کی سزا قتل رکھی گئی اور بعض دیگر جرائم میں بھی سخت سزائیں رکھی گئیں؛ لیکن مختلف ملکوں میں قتل کے مقابلہ قتل کی سزا ختم کردی گئی اور ہمدردی و انسانیت کے نام پر مجرم کو سہولتیں دی گئیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرائم پر جسارت بڑھتی جارہی ہے اور جو سزائیں دی جاتی ہیں، وہ جرم کے سدباب کے لئے قطعاً ناکافی ثابت ہورہی ہیں؛ اسی لئے بعض ملکوں میں تو قتل کی سزا منسوخ کرنے کے بعد دوبارہ ان کے اجراء کا فیصلہ کیا گیا ہے۔

شریعتِ اسلامی کے جس حکم کو بھی حقیقت پسندی کے ساتھ دیکھا جائے، محسوس ہوگا کہ اس میں قانونِ فطرت کی مطابقت غیر معمولی حد تک پائی جاتی ہے، برخلاف انسان کے خود ساختہ قوانین کے، کہ اس میں فطرت سے بغاوت اور عقل و مصلحت کے تقاضوں پر خواہشات کے غلبہ کا رجحان ہر جگہ نمایاں ہے۔

۵- ثبات و تغیر — دوش بدوش

کسی بھی قانون کے مفید اور فعال رہنے کے لئے جہاں یہ ضروری ہے کہ اس میں حالات اور مواقع کے لحاظ

سے تغیرات کو قبول کرنے کی گنجائش رہے، وہیں ایک گونہ ثبات ودوام اور بقاء واستمرار بھی ضروری ہے، جو قانون بالکل بے لچک اور تغیر ناآشنا ہو، وہ زمانہ کی تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دے سکتا اور جس قانون میں کوئی بقاء واستحکام ہی نہ ہو، وہ انصاف قائم کرنے اور لوگوں کا اعتماد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ اس کے ہر اُصول میں شکست وریخت کی گنجائش ہوگی اور لوگ اس کو اپنی خواہشات کے سانچہ میں ڈھال لیں گے۔

شریعتِ اسلامی میں ان دونوں پہلوؤں کی رعایت ملحوظ ہے، کچھ احکام وہ ہیں، جن کی بابت اُصول وقواعد اور شریعت کے مقاصد کی وضاحت پر اکتفاء کیا گیا ہے، ہر عہد میں جو مسائل پیدا ہوں، ان کو ان اُصولوں کی روشنی میں حل کیا جائے گا؛ کیوں کہ شریعت کا اصل مقصد عدل کو قائم کرنا اور ظلم کو دفع کرنا ہے، اگر ایک ہی حکم کسی زمانہ میں عدل کو قائم رکھنے کا سبب ہو اور دوسرے عہد میں ظلم وناانصافی کا باعث بن جائے، تو دونوں حالات میں حکم ایک دوسرے سے مختلف ہوگا۔

شریعت نے بعض مسائل میں جزوی تفصیلات کو بغیر کسی استثناء اور تخصیص کے متعین کردیا ہے، یہ تعیین وتحدید اس بات کی علامت ہے کہ یہ قیامت تک قابل عمل ہے، اسی طرح شریعت میں جو اُصولی ہدایات دی گئی ہیں اور جن قواعد اور مقاصد کی رہنمائی کی گئی ہے، وہ ناقابل تبدیل ہیں، اسی لئے قرآن مجید نے کہا ہے کہ قرآنی ہدایات کے ذریعہ دین پایۂ کمال کو پہنچ چکا ہے، اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ، (المائدة:۳) اور محمد رسول اللہ ﷺ پر سلسلۂ نبوت کو ختم کردیا گیا ہے، (الاحزاب:۴۰) لہٰذا اب خالق کائنات کی طرف سے کسی نئی شریعت کے آنے کا امکان باقی نہیں رہا۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو جوں جوں عمر بڑھتی جاتی ہے، لباس کی مقدار میں اضافہ ہوتا جاتا ہے؛ لیکن جب انسان جوانی کی عمر کو پہنچ جاتا ہے، تو اس وقت جو لباس اس کے لئے موزوں ہوتا ہے، وہ ہمیشہ اس کے لئے کافی ہوتا ہے اور اس کی موزونیت باقی رہتی ہے، اسی طرح انسانی تمدن کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسبِ حال احکام آتے رہے، یہاں تک کہ جب انسانی شعور اور اس کا تمدن اپنے اوجِ کمال کو پہنچ گیا تو اسے شریعت محمدی سے نوازا گیا، اب یہ انسانی سماج کے لئے ایسا موزوں قانون ہے کہ قیامت تک اس کی موزونیت اور اس کی افادیت کم نہیں ہوسکتی۔

مگر —— جیسا کہ مذکور ہوا —— اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی قانون میں کوئی لچک نہیں ہے؛ بلکہ شریعت کے وہ قوانین جو قیاس واجتہاد یا مصلحت پر مبنی ہوں، براہ راست قرآن مجید اور معتبر احادیث سے ماخوذ نہ ہوں یا جن پر فقہاء مجتہدین کا اتفاق نہ ہو، ہر عہد میں ان کی تطبیق اس زمانے کے مطابق ہوتی رہی ہے اور ہوتی رہے گی؛ بلکہ خود قرآن وحدیث میں بھی ایسے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، جن کی مختلف ادوار میں، ان ادوار کے وسائل اور احوال

کے لحاظ سے تعبیر کی جا سکے، جیسے قرآن مجید میں گواہوں کے ''عادل'' ہونے کی شرط لگائی گئی ہے (طلاق:۲)؛ لیکن ''عادل'' کا مصداق متعین نہیں کیا گیا ہے؛ تاکہ ہر زمانہ میں اس زمانہ کے اخلاقی معیار کے مطابق اس کا مصداق متعین کیا جائے، اسی طرح حدیث میں کسی چیز پر قبضہ سے پہلے خرید وفروخت سے منع کیا گیا (۱)؛ لیکن اس کا قطعی مفہوم متعین نہیں کیا گیا؛ تاکہ ہر زمانہ میں قبضہ کی جو نئی شکلیں پیدا ہوں، وہ اس حکم کے دائرہ میں آسکیں۔

۶- قانون کی تنفیذ

کسی بھی قانون کا نفاذ دو طریقوں پر ہوتا ہے، سماج کے اندر قبول وطاعت کا جذبہ پیدا کر کے اور قانون کے خلاف طاقت کا استعمال۔

کچھ طبیعتیں سلامتی اور شرافت کی حامل ہوتی ہیں، ان میں از خود قانون پر عمل کرنے کا جذبہ موجود ہوتا ہے؛ لیکن جن طبیعتوں میں سرکشی اور بغاوت ہوتی ہے، یا جو خواہشات سے مغلوب ہوتی ہیں، وہ جبر وخوف کے بغیر یا قانون کو قبول کرنے کی شکل میں اس سے خوب تر کی اُمید کے بغیر سر تسلیم خم نہیں کرتیں، انسانی قوانین میں عدالت، پولیس اور ان دونوں شعبوں کے ذریعہ سزاؤں کا خوف ہی انسان کو جرم سے باز رکھتا ہے، لیکن شریعتِ اسلامی میں اس سے آگے ایک اور عقیدہ ''آخرت کے عذاب وثواب'' کا ہے، اسی لئے قرآن وحدیث میں ہر حکم کے ساتھ، اس کے ماننے پر آخرت کا اجر اور اس کے نہ ماننے پر آخرت کی پکڑ کا ذکر موجود ہے، یہ ایسا انقلاب انگیز عقیدہ ہے، جو طاقتور سے طاقتور انسان کے دل کو ہلا کر رکھ دیتا ہے اور بڑے بڑے مجرموں کو قانون کے سامنے سپر انداز ہونے پر مجبور کرتا ہے، جب کوئی آنکھ دیکھنے والی اور کوئی زبان ٹوکنے والی نہیں ہوتی، اس وقت بھی یہ عقیدہ اس کے ہاتھوں کے لئے ہتھکڑی اور اس کے پاؤں کے لئے زنجیر بن جاتا ہے۔

مسلم سماج میں اِس گئے گذرے دور میں بھی اس کی مثالیں بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہیں، مثلاً یہی منشیات کا مسئلہ ہے، آج پوری دُنیا اس مسئلہ سے دوچار ہے اور اس کے نقصانات بحث سے ماوراء ہیں، امریکہ نے ان حالات کو دیکھتے ہوئے ۱۹۳۰ء میں نشہ بندی کا ایک قانون بنایا اور شراب کی مضرتوں کو واضح کرنے کے لئے صرف تشہیر پر ۶۵ ملین ڈالر خرچ کئے، ۹ ہزار ملین صفحات شراب کے نقصانات پر لکھے گئے، ۲۰۰ آدمی قتل کئے گئے، ۵ لاکھ کو قید کی سزا دی گئی، جو جرمانے کئے گئے، اس کی مقدار بے شمار ہے؛ لیکن اس کے باوجود قانون کی طاقت سے قانون کو منوایا نہیں جاسکا اور ۱۹۳۳ء میں امریکی حکومت اس بات پر مجبور ہوئی کہ اس قانون کو واپس لے لے۔

قرآن مجید نے جب شراب کو حرام قرار دیا، تو عرب اس کے بے حد عادی تھے، یہاں تک کہ اسلام سے پہلے

---

(۱) بخاری، عن علی بن عبد اللّٰہ، حدیث:۲۱۳۵۔

ان کی مذہبی تقریبات بھی شراب سے خالی نہیں ہوتی تھیں؛ لیکن شراب کی حرمت کا حکم آتے ہی لوگوں نے اپنا سر جھکا دیا اور مدینہ کی گلیوں، کوچوں میں شراب بہنے لگی، آج بھی صورتِ حال یہ ہے کہ جہالت وغفلت کے باوجود مسلمان سماج میں شراب سے جو احتیاط برتی جاتی ہے، شاید ہی اس کی مثال مل سکے، مغربی ممالک میں خاص طور پر اس کو محسوس کیا جاسکتا ہے کہ دوش بدوش زندگی گذارنے والے مسلمان اور غیر مسلم مئے نوشی کے اعتبار سے ایک دوسرے سے بہت مختلف کردار کے حامل ہوتے ہیں۔

اسی طرح زنا اور غیر قانونی جنسی تعلق کا معاملہ ہے، کہ آج بھی اس معاملہ میں مسلم سماج دوسری قوموں سے بدرجہا غنیمت ہے، یہی وجہ ہے کہ ایڈس کی بیماری کی شرح مسلم ملکوں میں سب سے کم ہے، یہاں تک کہ وہ مسلمان ملک جنھیں سیکولرزم کے نام پر''اغواء'' کرلیا گیا ہے، وہ بھی ایسی برائیوں میں مغربی اور مغرب زدہ ممالک سے بہتر حالت میں ہیں،—— مغربی ملکوں میں شہر شہر بوڑھے لوگوں کے لئے ہاسٹل قائم کردیئے گئے ہیں، لوگ بوڑھے ماں باپ اور بزرگانِ خاندان کو ان ہاسٹلوں میں رکھ کر اپنا بوجھ ہلکا کرلیتے ہیں، لیکن مسلم سماج میں آج بھی ایسی خودغرضی نسبتاً کم پائی جاتی ہے، والدین کا احترام اور بزرگوں کی قدر دانی کو لوگ اپنا مذہبی فریضہ سمجھتے ہیں، یہ آخرت کے خوف اور آخرت میں جوابدہی کے احساس کے بغیر نہیں ہوسکتا، پس وضعی قوانین کا نفاذ قانون کی طاقت ہی سے ممکن ہے؛ لیکن قانون شریعت کے نفاذ میں عقیدہ وایمان کی طاقت بھی مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔

اجتہاد

حضرات گرامی! اسلامی قانون کا تعارف اس وقت تک نامکمل ہوگا جب تک مسئلہ اجتہاد کے بارے میں کچھ عرض نہ کیا جائے، اجتہاد کے سلسلہ میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اسلامی قانون کے بنیادی مصادر چار ہیں: کتاب اللہ، سنتِ رسول، اجماع یعنی اُمت کا کسی مسئلہ پر اتفاق، قیاس یعنی جس صورتِ حال کا حکم قرآن وحدیث میں صراحتاً ذکر نہ کیا گیا ہو اس میں قرآن وحدیث کے مماثل حکم جاری کرنا، اس کے علاوہ بعض ضمنی مآخذ بھی ہیں جن کا تعلق ضرورت ومصلحت اور عرف ورواج وغیرہ سے ہے، ان مآخذ سے شرعی احکام مستنبط کرنے اور جو نئے واقعات پیش آئیں، ان کو اس پر منطبق کرنے کو اجتہاد کہتے ہیں، پیغمبر اسلام ﷺ نے نہ صرف 'اجتہاد' کو درست قرار دیا؛ بلکہ اس کو اجر وثواب کا باعث بھی بتایا، اس لئے اجتہاد کا مسئلہ اسلامی قانون سے حد درجہ مربوط ہے۔

یہ بات عرصہ سے زیر بحث ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہوا ہے یا بند ہو چکا؟ —— اس پر اہل علم کے درمیان کافی بحثیں بھی کی جاتی ہیں، اس سلسلہ میں ایک بات تو واضح ہے کہ جس دروازہ کو رسول اللہ ﷺ نے کھولا ہے اسے کوئی کیسے بند کرسکتا ہے، اُمت کے بڑے سے بڑے عالم کو بھی اس کا حق نہیں پہنچتا کہ قرآن وحدیث میں جس بات کو جائز قرار دیا گیا ہے وہ اس سے منع کردے؛ البتہ دو باتیں قابل غور ہیں، اول یہ کہ کس حد تک اجتہاد کی ضرورت

ہے؟ دوسرے یہ کہ کونسے مسائل اجتہاد کا محل ہیں؟

مجتہد بنیادی طور پر تین کام کرتا ہے :

(الف) جس ذرائع سے کوئی حکم ہم تک پہنچا ہے، اس کے معتبر و نامعتبر اور مقبول و نامقبول ہونے کی تحقیق، جیسے وہ احادیث جو متواتر نہیں ہیں، یا صحابہ کے اقوال وغیرہ کے بارے میں اس بات کو جاننا کہ جن شخصیتوں کی طرف ان اقوال وافعال کی نسبت کی گئی ہے، وہ نسبت مستند و معتبر بھی ہے یا نہیں؟

(ب) شریعت میں قرآن وحدیث میں بعض احکام وہ ہیں جن کے اسباب وعلل اور مقاصد کو بھی واضح کردیا گیا ہے اور بہت سے احکام وہ ہیں جن میں ان کی وضاحت نہیں کی گئی ہے، غور وفکر کر کے مجتہدین ان کی علتوں کو دریافت کرتے ہیں۔

(ج) تیسرا کام یہ ہے کہ جن صورتوں کے بارے میں کتاب وسنت میں صراحت نہیں کی گئی ہے اور اس دور میں وہ پیش آتی ہیں، دریافت شدہ اسباب وعلل کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان پر اس کو منطبق کیا جائے۔

ان میں سے پہلے دو کام وہ ہیں جو صدیوں کی محنتوں کے نتیجے میں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکے ہیں، ائمۂ مجتہدین نے روایت اور درایت اور داخلی اور خارجی شہادتوں کے ذریعہ نصوص کو پرکھنے کا کام اس ذہانت ومحنت کے ساتھ انجام دیا ہے کہ تاریخ علم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، اب از سرنو اس کام کو کرنا بنی بنائی مستحکم عمارت کو ڈھا کر دوبارہ تعمیر کرنے کے مترادف ہے، جو یقیناً ایک عبث کام ہوگا، ہر علم میں تدریج اور ارتقاء کا ایک فطری دور ہوتا ہے اور جب وہ ارتقاء کی ایک منزل تک پہنچ جاتا ہے تو اب اس میں مزید ترقی کی گنجائش نہیں رہتی، یہ دونوں کام اپنی اس منزل کو پہنچ چکے ہیں۔

تیسرا کام وہ ہے جس کی ضرورت قیامت تک باقی رہے گی، اسی کو فقہاء احناف نے ''تخریج مسائل'' اور علامہ شاطبی نے ''تحقیق مناط'' سے تعبیر کیا ہے، ہر دور میں علماء اس کام کو کرتے رہے ہیں اور موجودہ دور میں تیز رفتار تبدیلیوں اور سائنسی ترقیوں کی وجہ سے اس کی ضرورت بڑھ گئی ہے، اس لئے 'اجتہاد مطلق' جو مذکورہ تینوں کاموں سے مرکب ہے، کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی؛ بلکہ اس میں ڈھیر سارے مفاسد کا اندیشہ ہے اور جزوی اجتہاد اپنے عہد کے مسائل کو حل کرنے کے لئے ایک ضرورت ہے اور کسی صاحبِ نظر عالم نے اس کا انکار نہیں کیا ہے اور نہ اس سے انکار نہیں کیا ہے۔

دوسرا قابل غور پہلو یہ ہے کہ کونسے مسائل اجتہاد کا محل ہیں؟ —— اس سلسلہ میں اُصولی بات یہ ہے کہ جو مسائل یقینی ذریعہ یعنی قرآن مجید اور حدیثِ متواتر سے ثابت ہوں اور اپنے معنی ومفہوم پر بھی اس کی دلالت واضح ہو، اس میں کسی اور معنی کا احتمال نہ ہو یا جن مسائل پر اُمت کا اجماع واتفاق ہو ان میں اجتہاد کی کوئی گنجائش نہیں، جو

احکام قیاس ومصلحت پر مبنی ہوں، ایسے دلیلوں سے ثابت ہوں جن کا معتبر ہونا متفق علیہ نہ ہو، ایسے الفاظ میں ان احکام کا ذکر کیا گیا ہو جن میں ایک سے زیادہ معنوں کا احتمال ہو یا جن اُمور کے بارے میں معتبر فقہاء کے درمیان اختلافِ رائے پایا جاتا ہو وہی اصل میں اجتہاد کا محل ہیں، بدقسمتی سے ہمارے دور میں ایک طبقہ ایسے مسائل میں اجتہاد چاہتا ہے جو محل اجتہاد ہیں ہی نہیں اور جو مسائل اجتہاد کا محل ہیں اور ان میں اجتہاد کی ضرورت ہے ان میں اجتہاد کا عمل جاری ہے، خاص کر فقہ اکیڈمیاں جو عالم اسلام اور بعض غیر مسلم مما لک جیسے: ہندوستان اور یورپ وغیرہ میں خدمت انجام دے رہی ہیں وہ اجتہاد کی ضرورت کو اجتماعی کوششوں کے ذریعہ پوری کر رہی ہیں، ہندوستان میں بھی خاص کر مسلمان خواتین کے مسائل کو حل کرنے کے لئے علماء ایسی کوششیں کرتے رہے ہیں، اس سلسلہ میں حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کی ''الحیلۃ الناجزۃ'' کے علاوہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے آٹھویں سیمینار منعقدہ: ۷-۸ر جولائی ۲۰۰۷ء علی گڑھ کا ذکر کیا جاسکتا ہے، جس میں کئی فیصلوں کے بہ شمول دو اہم فیصلے کئے گئے، ایک ''اشتراط فی النکاح'' کا، یعنی اگر نکاح کے وقت عورت کوئی ایسی شرط لگائے جو شریعت کے خلاف نہ ہو تو وہ معتبر ہوگی، دوسرے مشروط مہر کا یعنی نکاح کے وقت اگر دو مختلف حالتوں کے ساتھ دو مہر مقرر کئے جائیں تو اس کا اعتبار ہوگا، اس لئے حقیقت یہ ہے کہ ضرورت کی حد تک اجتہاد کا عمل ہمیشہ سے جاری رہا ہے اور جاری رہے گا، یہ شریعت اسلامی کی ابدیت اور محمد رسول اللہ ﷺ پر ختم نبوت کا لازمی تقاضہ ہے۔

حضرات! قانون شریعت کی ضرورت ومصلحت اور فطرت انسانی سے ہم آہنگ کا نتیجہ ہے کہ پوری دنیا میں اور خود ہمارے ملک میں بھی اسلامی قانون سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے، جیسے قانونِ طلاق ہے؛ چوں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ایک اخلاقی ہدایت انجیل متی میں موجود ہے کہ ''جس کو خدا جوڑے، اس کو کوئی نہ توڑے'' اس لئے عیسائی دنیا میں نکاح ایسا بندھن سمجھا جاتا تھا، جس کو کھولا نہیں جاسکتا، اسی لئے مغربی دنیا میں طلاق کا تصور نہیں تھا اور نہ ہمارے ہندو بھائیوں کے یہاں تھا؛ لیکن آج پوری دنیا میں طلاق کو ایک سماجی ضرورت تسلیم کیا گیا ہے، — عورتوں کو نہ یورپ میں میراث کا حق تھا اور نہ ہندوستان میں یورپ میں انیسویں صدی کے اختتام تک بھی عورتوں کو حق میراث حاصل نہ ہوتا تھا؛ لیکن آج مغرب سے مشرق تک خواتین کو حق میراث دیا گیا ہے، ہمارے ملک میں بیوہ عورتوں کو دوسرے نکاح کی اجازت نہیں تھی؛ لیکن موجودہ ہندو قانون میں اجازت دی گئی، غرض کہ زندگی کے مختلف شعبوں کا جائزہ لیا جائے تو آج کی دنیا کے بہت سے قوانین وہ ہیں، جو شریعت اسلامی سے مستفاد ہیں، مجھے یاد آتا ہے کہ جسٹس کرشنا ایرّ نے اپنے ایک خطاب میں کہا تھا کہ اگر ہندوستان میں یکساں سیول کوڈ نافذ ہوا تو یقیناً وہ زیادہ تر مسلم پرسنل لا سے ماخوذ ہوگا، اور سابق وزیر اعظم اٹل بہاری واجپائی نے اپنے وزارت عظمیٰ کے دور میں کہا تھا کہ مجھے اسلامی شریعت کی یہ بات بہت اچھی لگتی ہے کہ اس میں عورت کو خود اپنا نکاح کرنے کا حق دیا گیا ہے

اور کسی لڑکی کی رضامندی کے بغیر اس کا نکاح نہیں ہوسکتا۔

اس لئے یہ خوش فہمی اور مذہبی خوش اعتقادی نہیں ہے؛ بلکہ روشن حقیقت ہے کہ اسلامی قانون میں ہر عہد کی ضرورتوں اور تقاضوں کو پورا کرنے اور انسانی زندگی کے مصالح کو روبہ عمل لانے کی پوری صلاحیت ہے اور مشرق ومغرب کا کوئی قانون نہیں، جس نے اس چشمۂ فیض سے کسبِ فیض نہ کیا ہو اور کیوں نہ ہو کہ یہ مخلوق کا نہیں؛ بلکہ خالق کا بھیجا ہوا قانون ہے، جس سے بڑھ کر کوئی ذات انسانی ضرورتوں اور مصلحتوں سے باخبر نہیں ہوسکتی۔

محترمانِ ما! اسلامک فقہ اکیڈمی جہاں عصر حاضر میں پیدا ہونے والے مسائل کو اجتماعی طور پر حل کرنے کے لئے بین الاقوامی سیمینار منعقد کرتی ہے —— اور اس سلسلہ کا سیمینار خود اس یونیورسٹی میں فاضل گرامی پروفیسر مولانا سعود عالم قاسمی (شعبۂ دینیات) کی دعوت پر منعقد ہو چکا ہے، جس میں بہت سے اہم سماجی اور طبی مباحث طے ہوئے تھے، اس موقع پر یونیورسٹی کی طرف سے شایانِ شان ضیافت کی حلاوت ابھی بھی ہم لوگ فراموش نہیں کر پائے ہیں، —— وہیں فکری اور تربیتی سیمینار، سمپوزیم اور ورکشاپ بھی منعقد کئے جاتے ہیں اور اب تک اس نوعیت کے ۲۵ پروگرام منعقد ہو چکے ہیں، یہ پروگرام بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، جس کا مقصد اسلامی قانون کی اہمیت، عصر حاضر میں اسلامی قانون سے متعلق خدمات، بعض پہلوؤں سے ہندوستان کے دستور اور قوانین کا تجزیہ، اسلامی قوانین کی معنویت و نافعیت، ہندوستان میں اس کی تنفیذ کی ممکنہ کوشش اور قانون کی تعلیم کے سلسلہ میں غور وفکر اور مسلمان طلبہ کو اس کی طرف توجہ دہانی وغیرہ جیسے موضوعات کو زیر بحث لایا جارہا ہے، اس سے ایک طرف ہمیں خود احتسابی کا موقع ملے گا، دوسری طرف اسلامی قانون سے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے میں مدد ملے گی، اور تیسری طرف ہم اپنے نوجوان طلبہ کو توجہ دلاسکیں گے کہ وہ شعبۂ قانون کی طرف آئیں اور اس میں محنت کریں؛ تاکہ ملک کی اعلیٰ عدالتوں میں مسلمان قانون دانوں کا جو خلا پایا جاتا ہے، اسے دور کیا جاسکے؛ کیوں کہ ہم سے اس سلسلہ میں جو بے توجہی ہوئی ہے اور جس کا ہم شدید نقصان اُٹھا رہے ہیں، اس کی کچھ نہ کچھ تلافی ہوسکے۔

حضرات! یہ حقیر، اکیڈمی اور اس کے ذمہ داروں کی طرف سے آپ سبھی حضرات کا بے حد شکر گزار ہے کہ انھوں نے اس اہم پروگرام کی میزبانی کی اور ان کے اشتراک وتعاون سے یہ پروگرام منعقد ہو رہا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پروگرام کو کامیاب بنائے، اسے مفید اور نتیجہ خیز فرمائے اور یہ اس کی رضاء وخوشنودی اور اس کے دین کی تائید وتقویت کا ذریعہ ثابت ہو۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان .

○ ○ ○

انسانی حقوق ☆

خالدسیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين و الصلاة و السلام على سيد المرسلين و على آله و أصحابه أجمعين ، و من تبعهم بإحسان إلى يوم الدين .

صدر عالی قدر، دانشوران گرامی اور بزرگانِ محترم ! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے لئے بے حد خوشی ومسرت اوراس کے ساتھ ساتھ شرف وسعادت کی بات ہے کہ وہ برصغیر کی اس تاریخی اور تاریخ ساز دانش گاہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں نہایت اہم اور وقت کے سلگتے ہوئے مسئلہ پر سیمینار منعقد کررہی ہے، اللہ تعالیٰ اسے اپنے مقصد میں کامیابی سے ہم کنار کرے اور انسانی حقوق کے سلسلہ میں انسانیت کے ضمیر کو بیدار کرنے اور اسلام کی صاف وشفاف تعلیمات کولوگوں تک پہنچانے کا ذریعہ بنائے۔

حضرات ! خالق کائنات نے اپنی اس دنیا کو بے شمار مخلوقات کا مسکن بنایا ہے، ایک سے ایک طاقتور، خوبصورت اور مختلف صلاحیتوں کے حامل حیوانات اس دنیا میں بستے ہیں، ان کے مفادات میں باہم ٹکراؤ بھی پایا جاتا ہے، ایک محدود جنگل سے سب کو اپنا چارہ حاصل کرنا ہے اور ایک ہی چشمہ سے مختلف جانوروں کو پانی لینا ہے؛ لیکن یہ بات نہیں سنی گئی کہ مفادات کا یہ تصادم ان کے درمیان باہمی جنگ وجدال کا باعث بن گیا ہو، مثلاً ایک علاقہ کے گھوڑوں نے اپنی فوج بنا کر دوسرے علاقہ کے گھوڑوں پر ہلہ بول دیا ہو، اس کے نتیجہ میں سینکڑوں گھوڑوں کی جان چلی گئی ہو اور بہت سے زخمی ہوگئے ہوں، ایسا کوئی واقعہ دنیا میں پیش نہیں آیا؛ بلکہ یہ کیفیت دو مختلف جانوروں کے درمیان بھی پیش نہیں آئی، ایسا نہیں ہوا کہ جنگل کے شیروں نے مل کر اپنا ایک لشکر ترتیب دیا ہو اور اجتماعی طور پر ہرنوں پر ٹوٹ پڑے ہوں؛ تاکہ اس جنگل سے ان کا صفایا کردیا جائے؛ لیکن عجیب بات ہے کہ انسانوں کی بستی میں یہ واقعات پیش آتے رہتے ہیں اور کم وبیش ہر روز پیش آتے ہیں، انسان دوسرے انسان کو نقصان پہنچانے کے لئے اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی فطری طاقت ہی کو کافی نہیں سمجھتا؛ بلکہ اپنے ہم جنسوں کو ہلاک کرنے کے لئے تباہی

☆ ''انسانی حقوق'' کے موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے دہلی میں ایک نمائندہ سیمینار کا اہتمام کیا تھا، یہ اس پروگرام کا کلیدی خطبہ ہے۔

وبربادی کے نئے نئے ہتھیار بھی بناتا ہے، دوسرے انسانوں کو نقصان پہنچا کر اور تکلیف دے کر اسے بے حد خوشی ہوتی ہے اور فاتحانہ جذبات سے سرشار ہو کر وہ اپنی طاقت اور غلبہ کا اعلان کرتا رہتا ہے، آج پوری دنیا میں ہلاکت خیز ہتھیاروں کی بہتات، انسان کی بہترین ذہانتوں کا اس تخریبی کام میں خرچ ہونا، قدرت کے انمول وسائل کو اس انسانیت سوزی کی صفت میں صرف کرنا اور کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کو ہلاک کر دینے کی ٹکنالوجی کو فروغ دینا اس کی واضح مثال ہے۔

غالباً اسی لئے آج جانوروں کے حقوق، ماحولیات کے تحفظ، نباتات کے بقاء اور زمین وفضا میں موجود قدرت کے اَن دیکھے خزانوں کے تحفظ کی بجائے یا اس سے بڑھ کر انسانی حقوق کی ادائیگی اور انسانیت کے تحفظ پر گفتگو کرنا ایک مجبوری بن گئی ہے؛ تاکہ عقل وشعور کی دولت سے مالا مال، سمندر کی تہوں کو فتح کرنے والی اور فضاؤں میں تیرتے ہوئے سیاروں پر کمندیں ڈالنے والی اس مخلوق کو آداب انسانیت سکھائے جائیں اور انھیں بتایا جائے کہ قدرت کی دی ہوئی بہترین صلاحیتوں کو وہ تخریب کی بجائے تعمیر میں اور ضرر رسانی کی بجائے نفع رسانی میں استعمال کرے۔

اسلام کا تصور یہ ہے کہ انسان اس کائنات کی سب سے اشرف وافضل مخلوق ہے: ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ '' (الاسراء: ۷۰) خدا نے بہترین تخلیقی ڈھانچہ سے اس کو نوازا ہے: ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِيْ أَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ '' (التین: ۴) تخلیقی ڈھانچہ کی طرح اخلاقی کمالات کے اعتبار سے بھی انسان کو سب سے اونچا بنایا گیا ہے؛ چنانچہ خیر البشر حضرت محمد ﷺ کے بارے میں فرمایا گیا: ''وَإِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ '' (القلم: ۴) اسے علم وتحقیق کی نعمت اور اختراع وایجاد کی صلاحیت سے نوازا گیا ہے: ''عَلَّمَ الْإِنْسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ '' (العلق: ۵) پوری کائنات اس کی خدمت کے لئے ہے اور وہ اس کا مخدوم ہے: ''هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُم مَّا فِيْ الْأَرْضِ جَمِيْعاً'' (البقرۃ: ۲۹) اسی لئے کائنات کی تمام چیزیں اس کے لئے مسخر ہیں: ''وسخرلكم ما فى السموات وما فى الأرض '' (لقمان: ۳۰) وہ اس کائنات میں حاکم کے درجہ پر ہے اور تمام مخلوقات اس کی رعایا کے درجہ میں ہیں، اسی کو قرآن مجید میں 'خلافت' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے: ''إِنِّيْ جَاعِلٌ فِيْ الْأَرْضِ خَلِيْفَةً '' (البقرۃ: ۳۰) اس لئے اس کے حقوق کو خاص اہمیت حاصل ہے؛ چنانچہ قرآن وحدیث میں کائنات کی دوسری موجودات کے حقوق کے بارے میں بہت کم کہا گیا ہے اور اللہ اور اس کے رسول کے بعد سب سے زیادہ کائنات کی جس ہستی کے حقوق ذکر کئے گئے ہیں، یا جن پر زور دیا گیا ہے وہ بنی نوع انسان ہے، انسان کے عمومی حقوق پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور قرابت وتعلق کے مختلف پہلوؤں سے خاص خاص لوگوں کے حقوق بھی واضح کئے گئے ہیں، نیز اسلام نے انسان کے بنیادی حقوق کو نسلی، جغرافیائی، لسانی اور مذہبی سرحدوں سے بالاتر رکھا ہے۔

حضرات ! حقیقت یہ ہے کہ انسان کی تاریخ جتنی قدیم ہے اس کے حقوق کی تاریخ بھی اتنی ہی قدیم ہے، قرآن مجید ہمیں بتاتا ہے کہ حقوقِ انسانی کو تلف کرنے کا جو پہلا واقعہ اس روئے ارض پر پیش آیا، وہ یہ تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں 'قابیل' نامی شخص نے اپنے بھائی کو قتل کر دیا، جس کا نام 'ہابیل' تھا، اس واقعہ کا ذکر بائبل میں بھی آیا ہے، رسول اللہ ﷺ نے اس واقعہ کے سلسلہ میں فرمایا کہ جب بھی کوئی شخص قتل کا مرتکب ہوتا ہے تو قاتل کے گناہ میں قابیل کو شریک رکھا جاتا ہے؛ کیوں کہ اس نے گناہ اور ظلم کے ایک طریقہ کی بنیاد رکھی ، (۱) اس سے انسانی حقوق کی اہمیت کا اشارہ ملتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایک انسان کی حق تلفی دراصل پوری انسانیت کے ساتھ حق تلفی ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ جس نے ایک شخص کو قتل کیا اس نے گویا پوری انسانیت کو قتل کیا اور جس نے ایک شخص کی زندگی بچائی، اس نے گویا پوری انسانیت کی زندگی بچائی: ''**مَن قَتَلَ نَفْساً بِغَيْرِ نَفْسٍ أَوْ فَسَادٍ فِي الْأَرْضِ فَكَأَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعاً وَمَنْ أَحْيَاهَا فَكَأَنَّمَا أَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعاً**'' (المائدۃ:۳۲) انسانی حقوق کی اہمیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ اسلام میں خالقِ کائنات کی تمام تر عظمت کے باوجود حقوق کے باب میں بہ مقابلہ اللہ تعالیٰ کے حقوق کے، انسانوں کے حقوق کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے، پیغمبر اسلام ﷺ کے ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے حقوق تو ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف کر دیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ بے حد رحیم وکریم ہیں؛ لیکن انسانوں کے حقوق معاف نہیں کئے جائیں گے اور انسان کو اس کی سزا مل کر رہے گی ، (۲) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کا کوئی امتیاز نہیں ؛ بلکہ آپ ﷺ نے صاف ارشاد فرمایا کہ اگر کسی غیر مسلم شہری کے ساتھ زیادتی روا رکھی گئی تو قیامت کے دن میں اس کی طرف سے فریق بن کر کھڑا ہوں گا: ''...... **أنا حجيجه يوم القيامة**''۔ (۳)

حضرات ! آج دنیا میں 'انسانی حقوق' کا جو نعرہ ہر سو بلند کیا جا رہا ہے، مغرب کی طرف سے اس کی تاریخ کو بہت مختصر کر کے اور اسلامی تاریخ کو نظر انداز کر کے انقلاب فرانس کے بعد ۱۷۹۱ء میں سترہ دفعات پر مشتمل اعلامیہ کو اس سلسلہ کی پہلی کوشش قرار دیا جاتا ہے اور اس کوشش کا اوجِ کمال ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوام متحدہ کی طرف سے پاس ہونے والے ۳۰ر دفعات پر مشتمل انسانی حقوق کے چارٹ کو سمجھا جاتا ہے، جس پر اُس وقت اڑتالیس ممالک نے دستخط کئے تھے اور بعد کو بتدریج بہت سے دوسرے ممالک نے بھی اس کو قبول کیا، یہ یقیناً ایک اہم قدم تھا؛ لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہیں سے انسانی حقوق سے متعلق جد وجہد کا آغاز ہوا ہے۔

انسانی حقوق کا یہ منشور دراصل مغرب کے لئے ایک مجبوری تھی ؛ کیوں کہ بیسویں صدی کا ابتدائی حصہ انسانی خوں آشامی کے لئے نہایت تکلیف دہ اور ناقابل فراموش زمانہ رہا ہے، جس میں معلوم تاریخ کی دو بڑی

(۱) سنن ابن ماجہ، حدیث نمبر: ۲۰۳۔ (۲) ترمذی، حدیث نمبر: ۲۴۲۰۔

(۳) أبوداود، حدیث نمبر: ۳۰۳۵۔

لڑائیاں ہوئیں، جو'جنگ عظیم' کے نام سے یاد کی جاتی ہیں، اس جنگ نے نئی دنیا امریکہ سے لے کر مشرقِ بعید جاپان تک کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا اور جنگ کا یہ عفریت اس وقت تک آسودہ خاطر نہیں ہوا جب تک کہ اس نے لاکھوں انسانوں کے خون سے اپنی تشنہ لبی کو دور کرنے کا سروسامان نہ کر لیا، کہا جاتا ہے کہ کوئی بھی شئی جب اپنی انتہاء کو پہنچ جاتی ہے تو مائل بہ زوال ہونے لگتی ہے؛ چنانچہ جب یہ جنگی جنون اپنی نہایت پر پہنچ گیا اور انسانیت بلبلا اُٹھی تو درندگی کی اسی شب تاریک سے آدمیت کی ایک کرن طلوع ہوئی، مختلف ممالک میں انسانی حقوق سے متعلق قانون سازی کا عمل شروع ہوا اور دنیا بھر کے سنجیدہ اور انصاف پسند لوگوں نے آواز اُٹھائی کہ کچھ ایسے بنیادی انسانی حقوق ہونے چاہئیں کہ جن کا احترام جنگ و امن ہر دو حالتوں میں ضروری ہو، بالآخر یہ خواب اس طرح شرمندۂ تعبیر ہوا کہ ۱۰ر دسمبر ۱۹۴۸ء کو اقوامِ متحدہ کی جنرل اسمبلی نے انسانی حقوق کا منشور مرتب کرنے اور پاس کرنے میں کامیابی حاصل کی، مگر اب بھی یہ منشور عملاً ایک کھلونے سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا؛ کیوں کہ رکن ممالک اول تو اس منشور پر دستخط کرنے اور نہ کرنے کے معاملہ ہی میں آزاد ہیں، دوسرے یہ منشور کسی فرد کو یہ حق نہیں دیتا کہ وہ اس سلسلہ میں اپنے مقدمہ کو بین الاقوامی عدالت میں لے جا سکے، تیسرے بڑی طاقتیں کھلے عام اس معاہدہ کو پامال کرتی ہیں اور کوئی ان کے گریباں تھام نہیں سکتا، زیادہ تر کمزور ممالک پر ظلم وزیادتی اور مداخلت کے لئے ان قوانین کو ذریعہ بنایا جاتا ہے، انصاف کے یہ دوہرے پیمانے عملاً انسانی حقوق کی پاسداری کے نام پر انسانی حقوق کے اتلاف کا سبب بنے ہوئے ہیں۔

حضرات ! حقیقت یہ ہے کہ انسانی حقوق کا بنیادی تصور اور اس کی تفصیلات دنیا کی معلوم تاریخ میں سب سے پہلے محمد رسول اللہ ﷺ اور شریعت محمدی کے ذریعہ دنیا کو ملی ہیں، اسلامی نقطۂ نظر سے دیکھیں تو انسانی حقوق کے سلسلہ میں اسلامی تصورات کی بنیاد چار باتیں ہیں :

اول یہ کہ انسان بنی ذات سے شرافت وتکریم کا مستحق ہے: ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ'' (الاسراء:۷۰) اس تکریم کا تقاضہ ہے کہ اس کی جان کی حفاظت ہو، خواہ اس کا تعلق کسی بھی جنس، مذہب یا علاقہ سے ہو، یہاں تک کہ اگر وہ مجرم بھی ہو اور اس کا جرم اس درجہ کا نہ ہو، جس کی وجہ سے وہ واجب القتل ہو جائے تو اس کی جان قابل حفاظت ہے — اس تکریم کا تقاضہ اس کے مال کی حفاظت ہے، تمام انسانوں کا مال یکساں قابل احترام ہے، زور زبردستی اور دھوکہ دے کر کسی کا مال حاصل کرنا جائز نہیں، یہاں تک کہ دشمنوں کا بھی نہیں: ''وَلاَ تَأْكُلُوْا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ '' (البقرۃ:۱۸۸) انسانی تکریم ہی کا پہلو یہ ہے کہ اس کو ارادہ واختیار کی آزادی ہو اور جب تک اس کا عمل دوسروں کے لئے نقصاندہ نہ ہو، اس کو اپنی رائے کے مطابق عمل کرنے کی آزادی ہو، یہاں تک کہ قرآن دین ومذہب کے بارے میں بھی دنیوی زندگی میں اسے فیصلہ کا اختیار دیتا ہے: '' لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ

الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ''(البقرۃ:۲۵۶)اور''**لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ** ''(الکافرون:۶)انسانی تکریم ہی میں یہ بات شامل ہے کہ انسان کی عزت وآبرو کا تحفظ ہو،کسی انسان کی نسبی شناخت کومتاثر کرنے کی کوشش نہ کی جائے؛اسی لئے اسلام کی نظر میں زنا نہایت سنگین جرم سمجھا گیا ہے،ان پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لئے شریعت اسلامی کے ماہرین نے لکھا ہے کہ شریعت کے تمام احکام کے بنیادی مقاصد پانچ ہیں: دین کی حفاظت، جان کی حفاظت، مال کی حفاظت، نسل کی حفاظت اور عقل کی حفاظت، ان پانچوں مقاصد کی حیثیت مرکزی عنوان کی ہے اوران مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے جواُمور مطلوب ہوں، وہ سب اسلام میں مطلوب ہیں اورغور کیا جائے تو یہ پانچ مقاصد تمام بنیادی انسانی حقوق کا احاطہ کرتے ہیں۔

دوسرا بنیادی تصورانسانی وحدت ومساوات کا ہے،قرآن نے یہ تصور پیش کیا کہ شرافت وکرامت کے لئے اتفاقات کو بنیاد نہیں بنایا جاسکتا؛ بلکہ اس کی بنیاد اکتسابات ہے،یعنی انسان کا کسی خاص خاندان میں پیدا ہونا،کسی خاص رنگ ونسل کا حامل ہونا اورکسی خاص علاقہ سے متعلق ہونا وغیرہ، اتفاقی چیزیں ہیں،اس میں انسان کے کسب اوراس کی کوشش کا دخل نہیں ہے؛اس لئے یہ باتیں وجہ فضیلت نہیں بن سکتیں، انسان کا عمل اوراس کا کردار وجہ فضیلت ہے؛چنانچہ آپ ﷺ نے ارشادفرمایا:''**لا فضل لعربي علی عجمي ولا لعجمي علی عربي ولا لأبيض علی أسود ولا لأسود علی أبيض إن أكرمكم عند الله أتقاكم** ''(۱)قرآن نے اس بات کوبھی واضح کردیا کہ تمام انسانیت کی پیدائش ایک ہی ماں باپ کے ذریعہ ہوئی ہے؛اس لئے نسلی اعتبار سے وہ ایک ہی جڑ کی شاخیں اورایک ہی درخت کی ٹہنیاں ہیں، نیز مرد وعورت بھی ایک ہی ماں باپ سے پیدا ہوئے ہیں اور بہ حیثیت انسان ان کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے:''**يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا** ''۔(النساء:۱)

تیسری چیز'وحدت قانون' ہے،یعنی جب تمام انسان ایک ہیں تو اللہ کے احکام بھی ان سبھوں کے لئے ایک ہیں،کسی خاص سبب کے بغیر دوافراد واشخاص کے درمیان قانون اوراس کی تنفیذ میں کوئی فرق نہیں کیا جاسکتا، خواہ انسان کا تعلق کسی بھی نسل سے ہو، وہ حاکم ہو یا محکوم،مرد ہو یا عورت اور سرمایہ دار ہو یا غریب ومزدور، ملک کے قوانین کا اطلاق ان پر مساوات وبرابری کے ساتھ ہوگا،رسول اللہ ﷺکو اس کا اس قدر پاس ولحاظ تھا کہ جب فاطمہ نامی ایک قریشی خاتون کی سزا کے بارے میں بعض صحابہ نے سفارش کی تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگراس کی جگہ فاطمہ بنت محمد ہوتی تو ان پربھی یہی سزا جاری ہوتی (۲) نیز آپ ﷺ نے فرمایا کہ بنی اسرائیل پر اسی لئے اللہ کا عذاب آیا کہ وہ غریبوں پرتو قانون کو نافذ کرتے تھے اور مال داروں اورسماج کے معزز لوگوں کو قابل عفو سمجھتے تھے۔(۳)

---

(۱) مسند احمد،حدیث نمبر:۲۲۳۹۱۔ (۲) بخاری،حدیث نمبر:۳۹۶۵۔ (۳) مسلم،حدیث نمبر:۴۴۱۰۔

چوتھے انسانی حریت کا تصور ہے، اسلام کا ایک بنیادی تصور یہ ہے کہ تمام انسان اپنی اصل کے اعتبار سے آزاد ہیں، انھیں کوئی غلام نہیں بنا سکتا، اس سلسلہ میں وہ تاریخی جملہ قابل ذکر ہے، جو ایک صحابی رسول نے رستم یونان کے دربار میں کہا تھا کہ ہم اس لئے بھیجے گئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کو انسانوں کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی میں داخل کریں —— انسانی آزادی کا یہ تصور اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا، جب تک انسان کو سوچنے، فکر کرنے اور اپنی رائے کو ظاہر کرنے کی اجازت حاصل نہ ہو، قرآن وحدیث میں بہت سے مواقع پر نہی عن المنکر یعنی برائیوں کو روکنے کی نہ صرف اجازت دی گئی ہے؛ بلکہ اس کا حکم دیا گیا ہے، اس میں یہ بات شامل ہے کہ انسان جس بات کو غلط سمجھے اس پر تنقید کرے اور شائستہ حدود میں اس کے خلاف احتجاج کرے۔

بنیادی انسانی حقوق کے سلسلہ میں پیغمبر اسلام ﷺ کی تعلیمات کو اگر کوئی شخص ایک جگہ دیکھنا چاہے تو حجۃ الوداع کا خطبہ اس کے سامنے ہونا چاہئے، یہ خطبہ انسانی حقوق کا بنیادی اور اولین منشور ہے، جس میں انسانی مساوات، جرم وسزا میں یکسانیت، انسانی زندگی کا احترام، معاشی استحصال کی ممانعت، مال وجائداد کا تحفظ، ہر شخص کی دوسرے کے جرم سے براءت، عورتوں کے حقوق، غلاموں کے حقوق اور سیاسی مساوات کا واضح اعلان واظہار ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اسلام انسانی حقوق کی پاسداری کا نقیب وترجمان ہے اور بالخصوص ایک تکثیری معاشرہ میں تمام گروہوں کے ساتھ مساویانہ اور منصفانہ سلوک کی اس نے تعلیم بھی دی ہے اور مسلمانوں نے اس کا عملی نمونہ بھی پیش کیا ہے، خود رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں 'میثاق مدینہ' جس میں مسلمان، مشرکین اور یہود شامل تھے، اس کی بہترین مثال ہے؛ اسی لئے جب انسانی حقوق کی بحث عالمی سطح پر ایک اہم موضوع بن گئی اور اسے انسانیت کے لئے مغرب کا بہت بڑا عطیہ سمجھا جانے لگا، نیز یہ غلط فہمی بھی پیدا کی گئی کہ گویا اسلام انسانی حقوق کے بارے میں بخل وناانصافی سے کام لیتا ہے، تو مختلف اہل علم نے اس موضوع پر قلم اُٹھایا، جس میں شیخ محمد الغزالی کی ''حقوق الإنسان وأحكام الشريعة الإسلامية'' ڈاکٹر صبحی محمصانی کی ''أركان حقوق الإنسان'' ڈاکٹر قطب محمد قطب کی ''الإسلام وحقوق الإنسان'' ڈاکٹر فتح دریبی کا مقالہ ''أصول حقوق الإنسان فى التشريع الاسلامي'' ڈاکٹر محمد احمد مفتی کی ''حقوق الإنسان فى الفكر السياسى والإسلامى'' احمد جمال عبدالعال کی ''حقوق الإنسان الإسلام'' اور محمد عمارہ کی ''الإسلام وحقوق الإنسان، ضرورات لا حقوق'' نیز مشہور صاحب نظر فقیہ ڈاکٹر محمد زحیلی کی ''حقوق الإنسان فى الإسلام'' خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ان تحریروں کے علاوہ المجلس الاسلامی کی طرف سے یونسکو میں ۱۹ ستمبر ۱۹۸۱ء کو ادارہ کے جنرل سکریٹری سید سالم عزام نے حقوقِ انسانی کا عالمی اسلامی چارٹ ''الإعلام الإسلامى العالمى لحقوق الإنسان'' بھی پیش کیا، جسے تمام دینی

حلقوں کی طرف سے قبول کیا گیا، یہ اعلامیہ ۲۳/دفعات پر مشتمل ہے اور اپنی جامعیت کے اعتبار سے اسلامی پس منظر میں بنیادی انسانی حقوق کو واضح کرتا ہے۔

دنیا کی مسلم آبادی کا بہت بڑا حصہ برصغیر میں ہے، جو قریب قریب پچاس فیصد مسلمانوں کی نمائندگی کرتا ہے، اس خطہ کے علماء نے ہمیشہ پوری دنیا کے مسلمانوں کی رہنمائی کی ہے، یہ علاقہ نہ صرف مسلم آبادی کے اعتبار سے؛ بلکہ افرادی وسائل کی کثرت کے لحاظ سے بھی اس وقت پوری دنیا میں امتیازی حیثیت کا حامل ہے؛ لیکن افسوس کہ انسانی حقوق کے سلسلہ میں اسلامی تعلیمات کو انسانیت کے سامنے پیش کرنے کی جو علمی وفکری کوشش ہونی چاہئے تھی، بانی اکیڈمی حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے محسوس کیا کہ اس جانب توجہ نہیں ہو رہی ہے، اسی پس منظر میں آپ نے انسانی حقوق سے متعلق اسلامی تصورات کو واضح کرنے کے لئے اس عنوان کا انتخاب فرمایا اور ملک بھر کے اصحابِ نظر علماء سے موضوع کے مختلف پہلوؤں پر مقالات لکھوائے، جس کا مجموعہ اس وقت ان شاء اللہ آپ حضرات کے سامنے آئے گا، قاضی صاحبؒ کی خواہش تھی کہ اس موضوع پر علماء اور اصحابِ دانش جمع ہوں اور اس پر بحث کریں، یہ بحث ان مسائل کی تحقیق پر بھی مبنی ہو، جن میں اختلاف رائے ہے، ان آراء کی تطبیق بھی پیش نظر ہو، جو فقہاء نے کسی خاص دور میں اس عہد کے سیاسی حالات کے تحت اختیار کی تھیں اور اب حالات بدل چکے ہیں، یہ مذاکرہ اسلام کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ازالہ بھی کرے اور اسلام کی روشن تعلیمات کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کا ذریعہ بھی بنے، وہ بہت خواہش مند تھے کہ ان کی زندگی میں یہ اہم پروگرام منعقد ہو؛ لیکن عند اللہ یہ بات مقدر نہیں تھی، تاخیر ہوتی گئی اور تاخیر کا سلسلہ اتنا دراز ہوتا گیا کہ آج یہ پروگرام منعقد ہو رہا ہے، جو ان شاء اللہ ''دیر آید درست آید'' کا مصداق ہوگا۔

دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس پروگرام کو کامیاب بنائے، اسے مفید اور نتیجہ خیز فرمائے اور یہ اس کی رضاء وخوشنودی اور اس کے دین کی تائید وتقویت کا ذریعہ ثابت ہو۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان .

○ ○ ○

اسلام کا سیاسی نظام ☆

خالد سیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين ،
وعلى آله وأصحابه اجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين .

صدر عالی قدر، علماء کرام، دانشوران ذی احترام اور اساتذہ وطلباء !

اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک ایسی جاندار اور ذی شعور مخلوق بنایا ہے، جس کی فطرت میں تمدن ہے، اس کی ضروریات ایک دوسرے سے متعلق ہیں اور اس کے مزاج میں یہ بات داخل ہے کہ وہ مختلف لوگوں کے ساتھ مل کر زندگی گذارے اور مسائل کو حل کرے، مسائل زندگی کی تنظیم کے بنیادی طور پر دو دائرے ہیں، ایک دائرہ اپنے گھر اور خاندان کا ہے، اس کی تنظیم کو علماء فلسفہ نے 'تدبیر منزل' سے تعبیر کیا ہے، دوسرا دائرہ ایک پورے شہر یا ملک کو شامل ہے، جس کی تنظیم کو 'سیاست مدن' سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہ کہنا دشوار ہے کہ انسانی تمدن میں پہلی بار کوئی سلطنت کب وجود میں آئی اور کسی سیاسی نظام نے کب عملی شکل اختیار کی؛ لیکن زمانۂ قدیم سے سیاست کو ایک علمی وفنی شکل دینے کی جو کوشش ہوتی رہی ہے، اس کا سراغ ضرور ملتا ہے اور اس سلسلے میں سب سے پہلے 'سقراط' کا نام لیا جاتا ہے، جس نے گرچہ اس موضوع پر قلم نہیں اُٹھایا؛ لیکن اس نے اپنے شاگرد 'افلاطون' کو زبانی تعلیم دی، پھر افلاطون نے اپنے استاذ کی فکر کو لے کر اور اس میں اپنے افکار کا اضافہ کر کے ''جمہوریہ'' (Republic) تالیف کی، جو چار سو سال قبل مسیح کی کتاب بتائی جاتی ہے اور جسے سیاست کے موضوع پر اولین کتاب مانا گیا ہے، پھر افلاطون کے شاگرد ارسطو آئے اور اپنے استاذ کے سائنسی اور فکری افادات کو مختلف شعبوں میں مرتب کیا، جس میں ایک کتاب سیاست کے موضوع پر ''سیاست'' ہی کے نام سے ہے، اس لئے علم سیاست کے ماہرین قریب قریب اس پر متفق ہیں کہ علم سیاست پر بعد میں جو کچھ لکھا گیا یا سوچا گیا، اس کا سرچشمہ افلاطون اور خاص طور سے ارسطو کی یہی تالیف ہے۔

☆ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ قانون کے اشتراک سے اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے ''اسلام کا سیاسی نظام'' کے موضوع پر ایک سیمینار منعقد کیا تھا، یہ اس کا کلیدی خطبہ ہے۔

یہ بات اس لحاظ سے تو قابل تسلیم ہے کہ خاص اس موضوع پر جو قدیم ترین فکری ماخذ اہل علم کے سامنے موجود ہے، وہ یہی ہے؛ لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہوگا کہ اس سے پہلے انسان علم سیاست سے بالکل بے بہرہ تھا؛ کیوں کہ پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام ہی سے وحی کا نزول شروع ہو چکا تھا، انبیاء پیدا ہوتے رہے اور آسمانی کتابیں بھیجی جاتی رہیں، اللہ کی طرف سے انسان کو جو دین عطا کیا گیا ہے، وہ زندگی کے تمام انفرادی واجتماعی مسائل کا احاطہ کرتا رہا ہے، ان آسمانی کتابوں میں قدیم زمانہ سے بہت سے عادل اور ظالم حکمرانوں کا بھی ذکر آیا ہے، بعض ایسے فرمانرواؤں کا بھی ذکر آیا ہے، جن کو اللہ کی طرف سے حکومت کی ذمہ داری سونپی گئی، گرچہ انسانی زندگی کے اس طویل دورانیہ میں نظام حکومت کی تفصیل نہیں ملتی؛ لیکن حکومتوں کا وجود اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس دور میں بھی کوئی نظام ضرور موجود تھا اور یقیناً ان آسمانی کتابوں اور پیغمبروں کے ذریعہ نظام سیاست سے متعلق اساسی افکار اور بنیادی خدوخال واضح کئے گئے ہوں گے۔

دنیا میں اس وقت جو مذاہب موجود ہیں، ان میں سے اکثر پر ایک ایسا دور گذر چکا ہے، جب سیاست کو مذہب کے تابع بنا دیا گیا تھا، مگر بدقسمتی سے اس کو زیادہ تر مذہبی گروہوں نے عوام کے استحصال کے لئے استعمال کیا، ہندوستان میں ذات پات کی بنیاد پر تفریق کا اصل مقصد یہی تھا کہ چھتری عوام پر حکومت کریں، برہمن ان حکمرانوں کے حکمراں ہوں اور بقیہ لوگوں کا کام خدمت کرنا ہو، اس طرح برہمن پوری قوم کا استحصال کیا کرتے تھے اور انھوں نے مذہب کو آلۂ کار بنا کر اپنے لئے تقدس اور تفوق کا مقام حاصل کرلیا تھا، یہودی ربّیوں کا حال یہ تھا کہ جن علوم کے بارے میں تورات میں صراحت موجود نہیں ہوتی، وہ ان میں اپنے مفادات کے مطابق قانون بناتے اور اس کی نسبت خدا کی طرف کرتے کہ ''یہووا'' (خدا) نے انھیں بتایا ہے، عیسائیت میں مذہبی رہنماؤں نے بتدریج اپنی ایک متوازی حکومت قائم کر لی تھی، وہ ایک طرف حکمرانوں کے واسطہ سے عوام پر حکومت کرتے تھے، دوسری طرف لوگوں سے مغفرت نامے فروخت کرتے تھے، یہاں تک کہ کلیسا اور حکومت کی وہ سرد جنگ پیش آئی، جو بالآخر کلیسا کی شکست پر منتج ہوئی، اسی پس منظر میں قرآن مجید نے کہا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے علماء کو رب کا درجہ دے دیا ہے: ''اتَّخَذُوْا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَاباً مِّن دُونِ اللهِ''۔(التوبۃ:۳۲)

اللہ تعالیٰ کا شکر ہے کہ اُمت محمدیہ دنیا میں وہ واحد مذہبی گروہ ہے، جس کے پاس محفوظ شکل میں آسمانی کتاب بھی موجود ہے اور نبی کا اُسوہ بھی، جو زندگی کے دوسرے مسائل کی طرح نظام سیاست کے بارے میں بھی ہماری رہنمائی کرتا ہے، اسلام نے ہمیں دو بنیادی تصورات دیئے، اول یہ کہ اصل میں حاکمیت اللہ تعالیٰ کا حق ہے: ''إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلهِ'' (الانعام:۵۷) اور اس کی وجہ بھی بتائی گئی کہ انسان سمیت اس کائنات کا خالق اللہ ہے اور جو خالق ہوگا؛ چوں کہ وہ اپنی تمام مخلوقات کے نفع وضرر اور مصالح ومفاسد سے واقف بھی ہوگا؛ اس لئے وہی اس لائق

ہوسکتا ہے کہ ان کے لئے احکام بھی جاری کرے: ''أَلاَ لَهُ الْخَلْقُ وَالأَمْرُ ''۔(الاعراف:۵۴)

اسی لئے قرآن مجید میں حکمراں کو 'خلیفہ' کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ؛ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا: ''إِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَةً فِیْ الْأَرْضِ ''(ص:۲۶) یہاں خلیفہ کے معنی یہ ہیں کہ وہ اللہ کی زمین پر اللہ کے احکام کو نافذ کرنے میں اللہ تعالیٰ کے نائب ہیں ؛ پس اسلام کی نظر میں قانون کا اصل سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے ، ہاں ! جن احکام کے بارے میں کتاب وسنت میں کوئی ہدایت نہیں ملتی یا جن احکام کا تعلق ملک کے انتظامی اُمور سے ہے، ان میں انسان کے لئے قانون سازی کی گنجائش ہے ؛ بشرطیکہ وہ شریعت کے بنیادی اُصول ومقاصد کے موافق ہو، اس سے متصادم نہ ہو، یہاں تک کہ قرآن کے بیان کے مطابق اللہ کے نبیوں اور پیغمبروں کو بھی، اپنی طرف سے کسی بات کو حلال وحرام کرنے کا حق نہیں تھا: ''لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَکَ''۔(التحریم:۱)

بہ قول شاعر حق شناس علامہ اقبالؒ :

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی ، باقی بتانِ آزری

دوسرے: شریعت اسلامی میں حکومت کا مقصود صرف یہی نہیں ہے کہ ملک کے تمام شہریوں کو ایک نظم کے تحت لے آیا جائے ،عوام کے لئے معاشی وسائل فراہم کئے جائیں، امن وامان قائم کیا جائے اور ملک کی سرحدوں کی حفاظت کی جائے ؛ بلکہ اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد بھلائیوں کی ترویج اور برائیوں کا سد باب ہے :

الَّذِیْنَ إِن مَّکَّنَّاهُمْ فِیْ الْأَرْضِ أَقَامُوْا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّکَاةَ وَأَمَرُوْا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنکَرِ وللّٰهِ عَاقِبَةُ الْأُمُوْرِ . (الحج:۴۱)

نیکی کی ترویج اور برائی کی روک تھام میں ایک حکمراں کے لئے بنیادی اہمیت عدل وانصاف قائم کرنے کی ہے ؛ چنانچہ حضرت داؤد علیہ السلام سے فرمایا گیا کہ انھیں خلیفہ اس لئے بنایا جارہا ہے کہ وہ لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کریں :

یَا دَاوُوْدُ إِنَّا جَعَلْنَاکَ خَلِیْفَةً فِیْ الْأَرْضِ فَاحْکُم بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ . (ص:۲۶)

رسول اللہ ﷺ نے اس کا عملی نمونہ پیش فرمایا، عرب کی ایک معزز خاتون کے خلاف آپ نے چوری کے جرم میں ہاتھ کاٹنے کا فیصلہ دیا، بعض رفقاء نے ایک معزز قبیلہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر سزا کی تبدیلی کے لئے سفارش کی تو آپ نے ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا: خدا کی قسم! اگر بالفرض فاطمہؓ بنت محمد ﷺ نے بھی چوری کی ہوتی تو اس پر بھی یہی سزا نافذ کی جاتی: ''والله لو أن فاطمة بنت محمد سرقت لقطعت یدها ''۔(۱)

---

(۱) بخاری، قبیل کتاب المناقب، حدیث نمبر: ۳۴۷۵۔

غرض کہ اسلام کے نظام سیاست میں حکومت کا بنیادی مقصد احکام خداوندی کو نافذ، عدل قائم کرنا، ظلم کو روکنا، بھلائیوں کورواج دینااور برائیوں کومٹانا ہے؛ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا کہ:

''وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُم بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ إِنَّ اللهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ''۔(المائدۃ:۴۲)

حضرات ! یہ افسوس ناک حقیقت ہے کہ اگر چہ کہ قرآن وحدیث اور خلفاء راشدین کے طرز عمل میں ایک عادل حکومت کے لئے واضح اُصول اور بہترین معیارات کی نشاندھی کردی گئی ہے ؛ لیکن اسلام کا معیاری نظام خلافت رسول اللہ ﷺ کے بعد تیس سال کے مختصر عرصہ سے زیادہ نہیں رہ سکا؛ اگر چہ بہت سے منصف مزاج اور خدا ترس سلاطین بھی پیدا ہوئے اور انھوں نے بڑی حد تک قرآن وحدیث کے منشاء کے مطابق حکومت کرنے کی کوشش کی ؛ لیکن خزاں کے درمیان بہار کے یہ جاں فزا جھونکے ایک مستحکم سیاسی نظام کا نتیجہ نہیں تھے ؛ بلکہ شخصی صلاح اوراخلاقی تعلیمات سے متاثر ہونے کا اثر تھا؛ اسی لئے ایسے بہت سے عدل پرور حکمراں گذرے ہیں کہ جن کے جانشیں اسی درجہ ظالم وجابر واقع ہوئے تھے۔

اس کا دوسرا نقصان یہ ہوا کہ نظام سیاست کے بارے میں فقہی کاوشیں بھی نسبتاً کم انجام پائیں، جہاں ہمیں عبادات کے موضوع پر بے شمار کتابیں ملتی ہیں اور خاندانی نظام اور مالی معاملات کے بارے میں دقت نظر کے ساتھ تمام امکانات پر غور کیا گیا ہے اوران ممکنہ صورتوں سے متعلق احکام متعین کئے گئے ہیں، وہیں نظام سیاست پر بمشکل انگلیوں پر گنی جانے والی چند کتابیں ملتی ہیں، اوراس شعبہ سے متعلق فقہاء کے اجتہادات میں تسلسل نہ پائے جانے کی وجہ سے مختلف گوشوں میں تشنگی کا احساس بھی ہوتا ہے۔

حضرات ! شریعت اسلامی میں سیاسی نظام کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ شریعت کے بہت سے احکام کا نفاذ ایک اسلامی حکومت کے وجود پر موقوف ہے، نہ صرف حدود وتعزیرات، نظام قضاء، احتساب، دفع مظالم، مذہبی اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ، بین قومی تعلقات وغیرہ جیسے اہم اُمور حکومت سے متعلق ہیں؛ بلکہ عبادات میں بھی حکومت کو بہت کچھ دخل ہے، جمعہ وعیدین کی نمازیں اذنِ سلطان کے ساتھ مشروط ہیں، رمضان وعید اور حج کے لئے رؤیت ہلال کا اعلان سلطان یا اس کا نمائندہ کرے گا، اموال ظاہرہ جانوروں وغیرہ کی زکوٰۃ اور عشر وصول کرنا حکومت کا حق ہے، حج سلطان یا اس کے نائب کی امارت میں انجام دیا جائے گا، نماز اور نماز جنازہ کی امامت کا اولین مستحق سلطان ہے، اوقاف کی تولیت، نکاح کی ولایت اور زوجین میں تفریق وغیرہ کی ذمہ داری بھی بعض صورتوں میں سلطان سے متعلق ہوگی، غرضیکہ نہ صرف سلطنت کے انتظام، تعزیرات کے نفاذ، دفاع، خارجہ تعلقات اور داخلی امن وسلامتی وغیرہ میں حکومت کا بنیادی رول ہے؛ بلکہ عبادات اور خاندانی زندگی میں بھی حکومت کا دخل ہے، ان سب کے باوجود چوں کہ عملی طور پر اسلامی خلافت کو پنپنے کا موقع نہیں ملا اور نظام سیاست کی جزئیات پر کام

کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی ، اس لئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مسلمان فقہاء نے اس جانب نسبتاً کم توجہ دی ، ضرورت ہے کہ موجودہ دور کے علماء اس کمی کی تلافی کریں اور عصر حاضر کے تناظر میں ایک آئیڈیل اسلامی نظام کا عملی خاکہ پیش کریں۔

جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی ، اس وقت دنیا پر بادشاہی کا نظام مسلط تھا ، جزیرۃ العرب کے چاروں طرف روم وایران اور یمن میں یہی نظام کارفرما تھا ، اس کے علاوہ اس عہد میں جن ملکوں کی تاریخ ملتی ہے ، جیسے ہندوستان اور چین ، وہاں بھی یہی شاہی نظام قائم تھا ، اسلام نے ملوکیت کے اس نظام کو قبول نہیں کیا اور خلافت کا تصور پیش کیا ، جس میں توارث کی بنیاد پر حکمرانی کا استحقاق تسلیم نہیں کیا گیا ؛ بلکہ لیاقت ، اخلاق وکردار اور عام مسلمانوں کے انتخاب کی بنیاد پر خلیفہ منتخب کئے جانے کا حکم دیا گیا ، خود رسول اللہ ﷺ نے قیصر وکسریٰ کی سنت پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا اور ملوکیت کے تصور کو ختم کرنے کے لئے نہ آپ نے اپنے خاندان کے کسی فرد کو آئندہ کے لئے خلیفہ نامزد فرمایا اور نہ کسی اور رفیق کو ، آپ ﷺ نے بعض اشارے ضرور دیئے اور حضرت ابوبکر ؓ کو نماز کی امامت پر مقرر فرمایا ، مگر آپ ﷺ نے صریح ہدایت نہیں دی اور اس کو اپنے رفقاء کی صوابدید پر چھوڑ دیا۔

حضرت ابوبکر ؓ نے اپنے بعد صحابہ کے مشورہ سے حضرت عمر ؓ کو نامزد فرمایا تھا ؛ لیکن اپنی اولاد میں سے کسی کو اس ذمہ داری پر مقرر نہیں کیا ، حضرت عمر ؓ کے سامنے بعض لوگوں نے عبداللہ بن عمر ؓ کو سربراہ حکومت بنانے کا مشورہ بھی پیش کیا ؛ کیوں کہ وہ ورع وتقویٰ میں امتیازی شان رکھتے تھے ؛ لیکن حضرت عمر ؓ نے اسے قبول نہیں فرمایا اور چھ افراد کے نام پیش کئے کہ مسلمان ان میں سے کسی کو اپنا امیر منتخب کرلیں ، حضرت عثمان ؓ کی شہادت کے بعد اکابر صحابہ نے حضرت علی ؓ کے ہاتھ پر بیعت کی ، حضرت علی ؓ حضرت حسن ؓ کو آئندہ کے لئے حکمراں نامزد کرسکتے تھے اور وہ اپنی شرافت اور نسبی وجاہت کے اعتبار سے اکابر صحابہ کے لئے سب سے زیادہ قابل قبول بھی تھے ؛ لیکن حضرت علی ؓ نے ایسا نہیں کیا اور آپ ؓ کی شہادت کے بعد لوگوں نے اپنی مرضی سے حضرت حسن ؓ کے ہاتھ پر بیعت کی ، غرض کہ تمام خلفاء راشدین کا اُسوہ یہی رہا ہے کہ انھوں نے اپنے بعد اپنی اولاد میں سے کسی کو جانشین مقرر نہیں فرمایا ، اس طرح یہ بات واضح کردی گئی کہ اسلام میں ملوکیت کا نظام قابل قبول نہیں ہے ، علامہ ابن حزم نے لکھا ہے کہ اس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ حکمرانی میں توارث جائز نہیں : ''**ولا خلاف بين أحد من أهل الإسلام في أنه لا يجوز التوارث فيها**''۔(۱)

بعض حضرات کو غلط فہمی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کے بعد حضرت سلیمان علیہ السلام کو حکمراں بنایا ، اس سے ملوکیت کا جواز معلوم ہوتا ہے ؛ لیکن ظاہر ہے کہ امر الٰہی پر امر انسانی کو قیاس نہیں کیا جاسکتا ، حضرت سلیمان علیہ السلام

(۱) الفصل في الملل والنحل:۵،ص:۱۲،قبيل ''الكلام في عقد الامامة بماذا يصح''۔

کو حضرت داؤد علیہ السلام نے حکمراں نامزد نہیں کیا تھا؛ بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس منصب پر فائز فرمایا تھا، اس کے علاوہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی لیاقت کے اعتبار سے بھی تمام لوگوں پر فائق تھے؛ کیوں کہ وہ نبی تھے اور نبی علم و فضل اور عمل و اخلاق کے اعتبار سے تمام لوگوں پر فائق ہوتا ہے اور اس کی حیثیت زمین پر اللہ کے نمائندہ کی ہوتی ہے۔

اسی طرح حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یا حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد چھ افراد کو جو نامزد فرمایا، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیشہ نامزدگی کے ذریعہ حکمراں منتخب کیا جائے، اگر اس نامزدگی میں توارث نہیں ہو، تب بھی اس سے آمریت جنم لیتی ہے، اس وقت دنیا میں جتنے امراء اور ڈکٹیٹر موجود ہیں، سب ایسے ہی ہیں کہ یا تو انھوں نے اپنے کسی قرابت دار سے اقتدار حاصل کیا ہے یا انھیں سابق حکمراں فوج یا خود ساختہ حکمرانوں کی ٹولی نے کرسیٔ اقتدار پر فائز کیا ہے، پھر تاریخی روایات کا جائزہ لیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے صرف اپنی رائے سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نامزد نہیں کیا؛ بلکہ صحابہ کے مشورہ سے کیا اور صرف اس نامزدگی کی وجہ سے نامزد شخص کو خلافت حاصل نہیں ہوئی، اگر ایسا ہوتا تو بیعت کی ضرورت نہیں پڑتی؛ بلکہ جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں پر بیعت کی گئی، تب وہ خلیفہ قرار پائے، گویا نامزدگی کی حیثیت مشورہ کی تھی نہ کہ واجب الطاعۃ حکم کی؛ کیوں کہ کسی امیر کا حکم اس کی زندگی میں ہی واجب العمل ہوتا ہے، اس کی وفات کے بعد واجب العمل باقی نہیں رہتا:

''إن إمامة معهود إليه تنعقد بعد موته باختيار أهل الوقت''۔(۱)

اس لئے حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت اسلام کے سیاسی تصورات سے ہم آہنگ نہیں ہے؛ البتہ امن عامہ اور روز مرہ کے مسائل کے حل کے لئے نظم مملکت کا قائم رہنا ضروری ہوتا ہے؛ ورنہ معاشرہ بدامنی اور شر و فساد کا شکار ہو جائے گا، اس لئے فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص زور زبردستی سے اقتدار پر مسلط ہو جائے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی صورت میں اندیشہ ہو کہ یہ مہم ناکام ہو جائے گی اور اس سے مزید فتنہ و فساد پھیلے گا تو ایسی صورت میں اس اقتدار کو تسلیم کر لینے کی گنجائش ہے، اسی کو بعض فقہاء نے 'امارت قاہرہ' سے تعبیر کیا ہے، اسی بنیاد پر علماء نے بادشاہوں کی اطاعت کی ہے، اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ آئیڈیل طرز حکومت ہے اور اسلام کی نظر میں قابل قبول ہے؛ بلکہ اس کا منشاء صرف ایک ضرورت کی تکمیل اور فتنہ و فساد کو روکنا ہے، اس کی بنیاد پر زور زبردستی سے لائی گئی ملوکیت یا آمریت کو جائز نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

حضرات! موجودہ دور میں جو سیاسی نظام سکہ رائج الوقت بن چکا ہے، جسے مقبول نظام حکومت کا درجہ حاصل ہے اور جو اس وقت عالم اسلام اور عالم عرب پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے مرحلہ میں ہے، وہ ہے جمہوریت، یہ یقیناً اسلام کے سیاسی نظام سے چند جہتوں میں بے حد مختلف ہے، اول یہ کہ اس نظام میں کسی اُمیدوار کے صرف

---

(۱) الاحکام السلطانیۃ لأبی یعلی: ۲۶۔

عددی اکثریت حاصل کرنے کو ہی کافی سمجھا جاتا ہے؛ لیکن اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ کسی ذمہ داری کے حوالہ کئے جانے میں ضروری ہے کہ وہ اس کا اہل بھی ہو، اور اہلیت میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں، ایک یہ کہ وہ مفوضہ کام کی صلاحیت رکھتا ہو، صاحب علم و دانش ہو، دوسرے اس سے اپنی ذمہ داریوں کے بارے امانت و دیانت کی اُمید رکھی جاسکتی ہو: ''إِنَّ خَيْـرَ مَنِ اسْتَأْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْأَمِيْنُ ''(القصص:۲۶) اورحکمراں بھی اپنی ذمہ داری کے اعتبار سے رعایا کا اجیر ہی ہوتا ہے، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لاَ يَـنَـالُ عَهْدِيْ الظَّالِمِيْنَ ''(البقرۃ:۱۲۴) پس اسلامی نظام میں یہ ضروری ہے کہ حکمرانوں اور عوامی نمائندوں کے لئے علم و عمل اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے ایک معیار مقرر ہو، صرف 51% تائید حاصل کر لینا کافی نہیں۔

دوسرا اہم فرق یہ ہے کہ جمہوری نظام میں ایک شخص اپنے آپ کو اُمیدوار بناتا ہے؛ لیکن اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے آپ کو عہدہ و اقتدار کے لئے اُمیدوار بنانا جائز نہیں، رسول اللہ ﷺ نے اس سے منع کیا ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ جو عہدہ کا اُمیدوار ہوگا، اسے میں عہدہ نہیں دوں گا۔

تیسرا فرق یہ ہے کہ جمہوریت میں قانون کا سرچشمہ عوام کو مانا گیا ہے، مثلاً اگر 51% فیصد عوام چاہتے ہوں کہ شراب کے کارخانے بنائے جائیں اور شراب پر کوئی پابندی نہ ہو تو شراب کی تمام تر اخلاقی اور طبی مضرتوں کے باوجود اس کی اجازت دی جائے گی، اسلام کی نظر میں قانون کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے، انسان کا کام قانون کی تشریح و توضیح ہے نہ کہ قانون سازی؛ اس لئے کتاب و سنت کے مقابلہ میں کوئی قانون سازی نہیں ہوسکتی۔

تاہم جمہوری نظام چوں کہ ایک بندھا ٹکا اور متعین و محدود نظام نہیں ہے؛ بلکہ مختلف ملکوں نے اپنے اپنے مصالح اور عوامی رجحانات کے اعتبار سے اس کو اختیار کرنے میں فرق بھی کیا ہے؛ اس لئے اسے اسلام سے ہم آہنگ بھی کیا جاسکتا ہے، مثلاً سربراہوں اور پارلیمنٹ کے ممبروں کے لئے ایک معیار مقرر کیا جاسکتا ہے کہ اس معیار کے حامل لوگ ہی منتخب کئے جاسکتے ہیں، ایسا ہوسکتا ہے کہ لوگ خود اپنے آپ کو اُمیدوار نہ بنائیں، پارٹیاں ان کو اُمیدوار بنائیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ دستور میں کتاب و سنت کو بنیاد قرار دیتے ہوئے پارلیمنٹ کو صرف ایسے اُمور میں قانون سازی کی اجازت دی جائے، جو انتظام و انصرام سے متعلق ہوں نہ کہ حلال و حرام سے، اس طرح یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ موجودہ جمہوری نظام اسلام کے تصور خلافت سے قریب تر ہے، آج اگر کسی خطہ میں اسلامی طرز حکومت کو وجود میں لانے کا موقع میسر ہو تو اس کی صورت یہی ہوسکتی ہے کہ رائے عامہ سے شوریٰ کے ارکان منتخب ہوں اور یہ ارکان سربراہ حکومت کا انتخاب عوامی نمائندوں کی حیثیت سے کریں یا یہ کہ عوام شوریٰ کے لئے ارکان کا بھی انتخاب کریں اور براہ راست صدر مملکت کا بھی؛ تا کہ ملوکیت اور آمریت کے چنگل سے عالم اسلام کو آزادی نصیب ہو۔

حضرات ! اسلام کے نظام سیاست سے مربوط بعض مسائل فقہی نوعیت کے ہیں، جن پر موجودہ حالات

کے تناظر میں غور کرنے کی ضرورت ہے اور علماء کو چاہئے کہ ایک ایسے وقت میں جب کہ عالم اسلام میں انقلاب کی لہریں موجزن ہیں، ان کو فرضی مسئلہ تصور نہ کریں، ان پر گہری بصیرت کے ساتھ غور کریں اور وہ احکام جو کسی خاص زمانہ کے احوال اور مصالح کے تناظر میں فقہاء نے دیئے ہیں، بدلے ہوئے حالات میں شریعت کے بنیادی مقاصد اور اُصول کو سامنے رکھ کر ان کے بارے میں فیصلہ کریں۔

جیسے سربراہِ مملکت کے قریشی ہونے کا مسئلہ ہے، رسول اللہ ﷺ نے بے شک فرمایا ہے: ''**الأئمة من قريش**'' لیکن اس میں اختلاف رہا ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی تھی کہ قریش ایک عرصہ تک سربراہِ مملکت ہوتے رہیں گے یا یہ ارشاد بطور حکم کے تھا؟ اور اگر یہ حکم کے طور پر تھا تو یہ ایک خاص مصلحت کے تحت وقتی حکم تھا؛ کیوں کہ عربوں میں قریش کو تفوق کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور اس وقت قریشیوں کے علاوہ کسی اور کی قیادت پر لوگ متفق نہیں ہو سکتے تھے، یا قیامت تک کے لئے یہی حکم ہے؟ یہ بات قابل غور ہے؛ کیوں کہ ہمیں حضور ﷺ کا یہ ارشاد بھی ملتا ہے کہ اگر کوئی ناک کٹا حبشی غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے تو اس کی بھی اطاعت کرو، اسی طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنی وفات کے وقت اظہار حسرت کرتے ہوئے فرمایا کہ اگر معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ اس وقت زندہ ہوتے تو میں انھیں خلیفہ بنا دیتا، اور ابوحذیفہ رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام سالم رضی اللہ عنہ ہوتے تو انھیں خلیفہ بنا دیتا؛ حالاں کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ انصار میں تھے اور سالم موالی میں، نیز عباسیوں اور فاطمیوں کے بعد عجمی نژاد فرماں روا ہوئے اور سبھوں نے ان کی خلافت کو تسلیم کیا؛ اسی لئے فقہاء نے قریشی ہونے کی شرط کو مختلف فیہ قرار دیا ہے اور خود امام ابوحنیفہؒ کا ایک قول نقل کیا گیا ہے کہ ان کے نزدیک قریشی ہونا شرط کے درجہ میں نہیں تھا: ''**لا يشترط في صحة تولية السلطان أن يكون قريشيا**''۔(۱)

موجودہ دور میں لوگوں کی سوچ گذشتہ ادوار سے بالکل مختلف ہوگئی ہے، یعنی اُس زمانہ میں حکمرانوں کو قبول کرنے کے لئے خاندانی نسبت کو بے حد اہمیت حاصل تھی؛ لیکن ہمارے اِس عہد میں حکمرانی کو کسی خاندان میں محدود کر دینا لوگوں کے لئے ناقابل قبول ہے۔

دوسرا مسئلہ مدتِ حکومت کی تحدید کا ہے، خلافتِ راشدہ کے عہد میں جن شخصیتوں کو امیر منتخب کیا گیا، وہ تا وفات اپنی اس ذمہ داری پر قائم رہے، اگر واقعی ابوبکر وعمر، عثمان وعلی رضی اللہ عنہم جیسے لوگ اُمت کو ہر دور میں ملتے رہیں تو ان کی حیات کتنی بھی دراز ہو، اُمت کے لئے ان کی امارت قائم رہنے میں ہی خیر ہے؛ لیکن ہر حکمراں کے بارے میں یہ بات نہیں کہی جا سکتی، عام طور پر اقتدار کا تسلسل مزاج میں بگاڑ پیدا کر دیتا ہے، قرآن مجید میں جن ظالم حکمرانوں کا ذکر آیا ہے، ان کا معاملہ یہی تھا کہ طویل حکمرانی کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو عوام کا مالک یہاں تک کہ 'خدا'

---

(۱) شرح الحموی علی الأشباه والنظائر: ۲۶۶/۲، الفن الثالث۔

تصور کرنے لگے تھے،موجودہ دور میں کسی شخص کو پوری زندگی کے لئے فرماں روا بنا دیا جائے تو ظن غالب یہی ہے کہ وہ اپنے عہد کے حسنی مبارک ، معمر قذافی ، بشار الاسد اور صدام حسین بن جائیں اور پوری قوم کو اپنی زرخرید ملکیت تصور کرنے لگیں ؛اس لئے موجودہ عہد میں عوامی نمائندوں اور منتخب سربراہوں کے لئے بھی مدت کی تحدید ضروری ہے،اسکی فقہی اصل یہ ہے کہ اصل میں حکمراں کی حیثیت عوام کے وکیل کی ہوتی ہے،عوام انھیں انتظامی اُمور کی ذمہ داری سونپتے ہیں —— اسی بنیاد پر امیر کو ولایت عامہ حاصل ہوتی ہے —— اور مؤکل کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ اپنے وکیل کے لئے ایک مدت کا رمقرر کر دے یا اس کے اختیارات کی تحدید کر دے ۔

اسی طرح ایک مسئلہ'صدرِمملکت' کے اختیارات کا بھی ہے،اللہ تعالیٰ نے امیر کو لوگوں سے مشورہ کرنے کا حکم دیا ہے:''وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللهِ''(آل عمران:۱۵۹)لیکن مشورہ کی کیا حیثیت ہوگی ،امیر مشورہ کا پابند ہوگا یا خود فیصلہ کرے گا ؟اس کی وضاحت نہیں کی گئی ،ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں کہ امیر نے تنہا اپنے مشورہ پر عمل کیا ہے، جیسے حضرت ابوبکرؓ کا مانعین زکوٰۃ سے جہاد کرنا،اور ایسی مثال بھی موجود ہے کہ امیر نے اپنے آپ کو اکثریت کے مشورہ کا پابند رکھا جیسا کہ غزوۂ احد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے نوجوانوں کی رائے پر مدینہ سے باہر نکل کر جہاد کرنے کا فیصلہ کیا۔

عام طور پر فقہاء کا رجحان یہی محسوس ہوتا ہے کہ امیر شوریٰ کے مشورہ کا پابند نہیں ہے؛ یہ کہنا مشکل ہے کہ فقہاء کی یہ رائے مجبور کن حالات پر مبنی تھی ؛ کیوں کہ اس زمانہ میں حکمراں باضابطہ کوئی شوریٰ رکھتے ہی نہیں تھے،جس کے مشورہ پر عمل ہو،اور بادشاہ کے منشاء کے خلاف کوئی مشورہ پیش کرنے میں بھی جان کا جوکھم ہوتا تھا ، یا ان کے یہاں بنیادی حکم ہی یہی تھا؛لیکن بہرحال موجودہ دور میں کسی فرماں روا کو ایسا مطلق العنان بنا دینا قوم کے گلے میں غلامی کا طوق پہنا دینے کے مترادف ہوگا ،جس کا تجربہ خلافت راشدہ کے بعد مسلم حکومتوں کی طویل تاریخ میں کیا جا چکا ہے، جہاں امارت نے آمریت کی شکل اختیار کر لی اور جس کے منفی اثرات آج بھی مسلم ملکوں میں دیکھے جا سکتے ہیں ؛اس لئے جیسے دوسرے معاملات میں مؤکل اپنے وکیل کے اختیارات کو محدود کر سکتا ہے،اس معاملہ بھی اس کی گنجائش ہونی چاہئے کہ سربراہ مملکت کے اختیارات کو محدود رکھا جائے اور وہ عوام کے منتخب نمائندوں کے مشورہ کا پابند رہے۔

ایک اہم اور قابل غور مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہمارے فقہاء تو پوری دنیا میں ایک ہی خلیفہ اور امیر کا تصور رکھتے تھے، یعنی مسلم مملکت کی حدود چاہے دنیا کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پہنچ جائیں ؛لیکن وہ ایک ہی حکمراں کے تحت رہیں گے،اسلام کے قرن اول میں مسلمانوں کی حکومت ایشیاء سے نکل کر یورپ وافریقہ تک پہنچ چکی تھی ؛ لیکن یہ وسیع وعریض مملکت ایک ہی فرماں روا کے زیرسایہ قائم تھی اور اب تو مواصلات اور ابلاغ کے ذرائع اس قدر

ترقی کر گئے ہیں کہ یہ بات نسبتاً آسان ہوگئی ہے۔

تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ غالباً عباسی دور سے ہی مملکت اسلامیہ کی وحدت ختم ہوگئی تھی اور اس سے پہلے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں شام وعراق کی دو الگ الگ مملکتیں بن گئی تھیں اور دونوں سلطنتوں کو بعض اکابر صحابہ کی تائید حاصل تھی، غالباً اسی لئے ابتدائی دور سے ہی ایک گروہ ایک ہی وقت میں ایک سے زیادہ مسلم مملکتوں اور ہر مملکت کے لئے الگ الگ سربراہوں کا قائل تھا، اگرچہ علامہ ماوردی نے اپنی معروف کتاب 'الاحکام السلطانیہ' میں اسے قول شاذ قرار دیا ہے، ایک اور تصور بھی تھا کہ اگر مملکت کی وسعت نظم ونسق میں حارج ہو تو سلطنت کے انتظامات اور دفاع کے اُمور کو آسان بنانے کے لئے ایک سے زیادہ حکومتیں اور ان کے الگ الگ سربراہ ہو سکتے ہیں؛ چنانچہ علامہ عبدالقادر بغدادی فرماتے ہیں کہ ایک وقت میں دو سربراہ نہیں ہونے چاہئیں، سوائے اس کے کہ ان دونوں خطوں کے درمیان ایسا سمندر حائل ہو کہ ایک طرف کے لوگ دوسری طرف کے لوگوں کو اپنی مدد نہ پہنچاسکیں، ایسی صورت میں دونوں علاقوں کے لوگوں کے لئے الگ الگ امیر منتخب کئے جاسکتے ہیں :

...... إلا أن يكون بين البلدين مانع من وصول نصرة أهل كل واحد منهما إلى الآخر فيجوز حينئذ لأهل كل واحد منهما عقد الإمامة لواحد من أهل ناحيته .(۱)

اور یہی بات اسلامی نظام سیاست کے سب سے بڑے ماہر اور نامور مفکر امام الحرمین علامہ جوینیؒ نے بھی لکھی ہے۔(۲)

اس لئے ایک آئیڈیل اور مثالی اسلامی مملکت تو وہی ہوگی، جو پوری ملت اسلامیہ کو ایک لڑی میں پرو دے؛ لیکن آج کی دنیا کا پھیلاؤ اور قومی عصبیتوں کے مرض کی وجہ سے عملاً یہ بات ممکن نہیں ہے، اگر ایسی کوشش کی گئی تو خطرہ ہے کہ عالم اسلام میں ایک نہ ختم ہونے والی خونریز جنگ شروع ہو جائے گی، جو بعض خطوں میں پہلے ہی سے جاری ہے، جیسے بعض فقہاء نے ایک ہی شہر میں تعدد جمعہ کو منع کیا تھا؛ لیکن بعد میں بڑھتی ہوئی آبادی کے پس منظر میں اس کی اجازت دی گئی، اسی طرح موجودہ حالات میں تعدد مملکت کو قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔

موجودہ دور میں خواتین کے حقوق کی بازیابی اور ان کی آزادی کے پُرفریب نعرہ کی بازگشت پوری دنیا میں سنی جارہی ہے اور جن لوگوں نے عورتوں کے ناموس کو سامان تجارت بنادیا ہے، بدقسمتی سے وہی خواتین کے حقوق کے سب سے بڑے پاسدار سمجھے جارہے ہیں، اس تحریک نے جو مادی مقاصد کے لئے شروع کی گئی ہے، پوری دنیا کو متاثر کیا ہے، مسلمان بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں، اس پس منظر میں یہ سوال کھڑا ہوتا ہے کہ کیا خواتین کسی مسلمان

---

(۱) اصول الدین:۲۷۴۔ (۲) دیکھئے: تفسیر قرطبی:۱/۲۷۳۔

حکومت میں رکن پارلیمنٹ ہوسکتی ہیں؟ اگر چہ اس سلسلے میں دورائیں ہوسکتی ہیں؛ لیکن موجودہ صورت حال میں کہا جاسکتا ہے کہ فی الجملہ اس کی گنجائش ہے؛ کیوں کہ شریعت میں اس بات کو تو منع کیا گیا ہے کہ فیصلے کے تمام تر اختیارات عورتوں کے حوالہ کردیئے جائیں: ''**لن یفلح قوم ولوا أمرھم امرأة**''(۱) لیکن مشورہ دینا فیصلہ کرنا نہیں ہے اور خواتین سے مشورہ لینے میں کوئی مانع نہیں ہے؛ بشرطیکہ وہ ایسی مجلسوں میں شرعی حدود کی رعایت کے ساتھ شرکت کریں؛ چنانچہ یہ بات تاریخ کے صفحات پر موجود ہے کہ حضرت عمر فاروق ﷛ کی وفات کے بعد خلیفہ کے انتخاب کے سلسلے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ﷛ نے خواتین سے بھی مشورے کئے تھے۔

اسی طرح اس دور میں ایک اہم مسئلہ پارلیمنٹ میں مذہبی اقلیتوں کی نمائندگی کا بھی ہے، اس سلسلے میں بھی یہ بات ملحوظ رکھنے کی ہے کہ پارلیمنٹ کا ہر رکن اپنی انفرادی حیثیت میں صرف مشورہ دینے کا مجاز ہوتا ہے، فیصلہ کرنے کا نہیں، فیصلہ تو غلبہ آراء سے ہوگا، پس اگر مسلمان ملکوں میں مجلس شوریٰ میں غیر مسلم نمائندے ہوں، وہ اقلیتوں کے مسائل پر بحث میں حصہ لیں اور عام انتظامی اور مالیاتی مسائل میں مشورہ دیں تو اس میں کوئی حرج نظر نہیں آتا؛ البتہ جو شرعی مسائل احکام قطعیہ کے درجہ میں ہوں، ان میں تو مشورہ کی گنجائش ہی نہیں ہے اور جو اجتہادی مسائل ہیں، ان میں بھی فیصلہ کرنے کے مجاز علماء وفقہاء ہیں، صرف ان کی تنفیذ کے طریقہ کار پر مجلس شوریٰ میں بحث ہوسکتی ہے، ایسے مسائل میں انکا ووٹ مؤثر نہیں مانا جائے گا؛ کیوں کہ یہ مذہب سے مربوط مسلمانوں کے مسائل ہیں، اس طرح کہا جاسکتا ہے کہ عصر حاضر کے پس منظر میں اسلامی نظام سیاست کی تشکیل کرتے ہوئے حکومت میں اقلیتوں کو بھی حصہ دار بنایا جاسکتا ہے؛ بلکہ بنایا جانا چاہئے۔

حضرات! اس عہد میں ایک طرف ماہرین علم سیاست نے یہ تصور کرلیا کہ اسلام کے سیاسی تصورات موجودہ ترقی یافتہ دور میں قابل عمل نہیں ہیں، دوسری طرف علماء اور اصحابِ افتاء نے اس کو علم وفکر کی دنیا کا ایک بند باب سمجھ کر اس پر غور کرنا چھوڑ دیا؛ حالاں کہ جب رسول اللہ ﷺ پر نبوت کا سلسلہ تمام ہو چکا اور آپ کی ہدایات قیامت تک انسانیت کے لئے زندگی کے تمام مسائل میں رہنمائی کا فریضہ انجام دیتی رہیں گی تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ اجتماعی زندگی کا ایک ایسا شعبہ جس سے ہر فرد اپنی انفرادی اور اجتماعی حیثیت میں مربوط ہے اور جس پر بہت سے احکام شریعت کی تنفیذ موقوف ہے، پر غور وفکر نہ کیا جائے، یہاں تک کہ اس پر تبادلہ خیال کرنے سے بھی گریز کیا جانے لگے۔

اسی لئے اسلامک فقہ اکیڈمی نے اس اہم موضوع کو آپ اہل دانش اور اصحابِ فکر ونظر کی بارگاہ میں پیش کیا ہے؛ تاکہ اس فراموش کردہ موضوع پر شریعت اسلامی کے ماہرین متوجہ ہوں، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اس سیمینار میں

---

(۱) بخاری، کتاب الفتن، باب الفتنة التی تموج کموج البحر، حدیث نمبر: ۲۶۸۶۔

مطلوبہ اسلامی نظام سیاست پر گفتگو کی جارہی ہے، جس کی عملی طور پر مسلم اکثریت خطہ ہی میں تطبیق ہوسکتی ہے؛ لیکن اکیڈمی اس سے پہلے اپنے 'چودھویں سالانہ فقہی سمینار' میں ان سیاسی مسائل کو زیر بحث لاچکی ہے، جو مسلمان اقلیتوں کو درپیش ہیں، جو غالباً برصغیر میں اس موضوع پر پہلا نمائندہ سیمینار تھا اور اس کے فیصلوں کو توازن اور واقعیت کی وجہ سے ہر جگہ پزیرائی حاصل ہوئی۔

اس وقت جو سیمینار منعقد ہورہا ہے، انشاءاللہ اس میں بڑے اہم موضوعات زیر بحث آئیں گے ، جیسے یہ کہ ملوکیت کے بارے میں اسلامی تصور کیا ہے اور کیا اسلام موروثی نظام حکومت کو قبول کرتا ہے؛ تاکہ اس بات کا تجزیہ کیا جاسکے کہ مسلم ممالک میں بادشاہت کا طویل عہد دوسری اقوام سے متاثر ہونے کا نتیجہ ہے، یا شریعت اسلامی نے ان کو یہی تعلیم دی ہے؟ اسی طرح شوریٰ کی رائے کو اختیار کرنے کا مسئلہ ہے، جس کی طرف اس حقیر نے ابھی اشارہ کیا ہے، یہ موضوع بھی بڑا اہم ہے کہ موجودہ جمہوری نظام کے اصولوں پر کس طرح ایک اسلامی حکومت کی تشکیل عمل میں آسکتی ہے، اس طرح کے متعدد مسائل —— انشاءاللہ —— آپ کے مقالات اور مناقشات میں زیر بحث آئیں گے، جو عصری تناظر میں بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

حضرات ! علی گڑھ میں اس پروگرام کے انعقاد کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم نے جدید وقدیم اور علماء ودانشوروں کے درمیان جو مصنوعی دیوار کھڑی کردی ہے اور جو بہ تدریج اتنی اونچی ہوتی جارہی ہے کہ ہم ایک دوسرے کی طرف دیکھ بھی نہیں سکتے ، اسے 'دیوار برلن' کی طرح گرادیا جائے، ہم ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھائیں اور باہمی اشتراک کے ساتھ ملت کو سربلند کرنے کی کوشش کریں، مجھے اس موقع پر شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ کے وہ فقرے یاد آرہے ہیں، جو انھوں نے ۲۹/اکتوبر ۱۹۲۰ء کو علی گڑھ ہی میں فرمائے تھے، جس کا ایک ایک حرف دردوسوز میں ڈوبا ہوا ہے اور خونِ جگر میں قلم ڈبوکر لکھا گیا ہے :

> اے نونہالانِ وطن! جب میں نے دیکھا کہ میرے درد کے غمخوار (جس سے میری ہڈیاں پگھلی جارہی ہیں) مدرسوں، خانقاہوں میں کم اور اسکولوں اور کالجوں میں زیادہ ہیں تو میں نے اور میرے مخلص احباب نے ایک قدم علی گڑھ کی طرف بڑھایا اور اس طرح ہم نے ہندوستان کے دو تاریخی مقاموں دیوبند اور علی گڑھ کا رشتہ جوڑا۔

افسوس کہ شیخ الہند کی یہ تحریک کماحقہ آگے نہ بڑھ سکی، تاہم 'آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ' کے قیام نے عوامی سطح پر اور 'اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا' کے قیام نے فکری سطح پر جدید وقدیم کے درمیان خلیج کو کم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے، اُمید ہے کہ یہ اور اس طرح کے پروگرام اس کو مزید تقویت پہنچائیں گے کہ ہم سب اُمت کا اثاثہ ہیں اور ہم سب کا کعبۂ مقصود اللہ کی رضاء وخوشنودی اور اسلام کی سرفرازی وسربلندی ہے۔

میں بے حد شکر گزار ہوں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ اور بالخصوص اس کے شعبہ سیاسیات کا ،جس نے اسلامک فقہ اکیڈیا کے اشتراک سے یہ اہم سیمینار منعقد کیا ، مجھے اُمید ہے کہ یہ سیمینار نہ صرف اسلام کے سیاسی نظام کے خد وخال واضح کرنے میں معاون ثابت ہوگا اور اس پر غور وفکر اور بحث وتحقیق کا محرک بنے گا ؛ بلکہ علماء اور جدید تعلیم یافتہ حضرات کے درمیان فاصلوں کو سمیٹنے اور علمی وفکری مسائل میں ایک دوسرے سے افادۂ واستفادہ کو وسعت دینے میں بھی ایک اہم رول ادا کرے گا ، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس سیمینار کو صحیح نتائج پر پہنچنے کا ذریعہ بنائے۔

وباللہ التوفیق وھو المستعان .

○ ○ ○

غیرمسلم معاشرہ میں مسلمانوں اورغیرمسلموں کے روابط ☆

خالدسیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد المرسلين ،
وعلى آله و صحبه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين .

جناب صدر، بزرگان محترم! یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ ’’کل ہند مجلس تعمیر ملت‘‘ نے معروف قائد نیز جان پُرسوز، دل دردمند اور فکرار جمند کی مالک شخصیت اور تنظیم کے بانی جناب سید خلیل اللہ حسینیؒ سے منسوب سالانہ توسیعی خطبہ کے لئے ’’غیرمسلم معاشرہ میں مسلمانوں اور غیرمسلموں کے روابط‘‘ جیسے اہم موضوع کا انتخاب کیا ہے، یہ جہاں اپنے بزرگوں کو یاد رکھنے کا ایک بہتر طریقہ ہے، وہیں تنظیم کی بصیرت، شعور وآگہی اور زمانہ شناسی کی دلیل بھی ہے، نیز قائد محترم سے اس موضوع کی مناسبت بھی ظاہر ہے؛ کیوں کہ آصف جاہی حکومت کے سقوط کے بعد جناب سید خلیل اللہ حسینی صاحب مرحوم نے پوری جرأت اور بالغ نظری کے ساتھ مسلمانوں کی رہنمائی کی اور انھیں بتایا کہ وہ غیرمسلم اکثریت والے اقتدار کے زیرسایہ اپنے ملی تشخص کے ساتھ کس طرح زندگی بسر کریں اور کس طریقہ پر رواداری اور بھائی چارہ کو برقرار رکھنے کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کو تحلیل ہونے سے بھی بچائیں، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ’مجلس تعمیر ملت‘ نے اپنی عمر کے پچاس سال پورے ہونے پر شرعی نقطۂ نظر سے ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی، تہذیبی اور مذہبی مسائل پر غور کرنے کے لئے ایک اہم سیمینار منعقد کیا تھا، جو اس موضوع پر ملک میں غالباً پہلا سیمینار تھا، اس کے بعد متعدد تنظیموں اور اداروں نے اس موضوع پر مذاکرہ کی مجلسیں منعقد کیں، جس کو اسی سیمینار کی صدائے بازگشت کہا جاسکتا ہے، اس طرح آج کا توسیعی خطبہ تنظیم کی ان فکری کوششوں کا تسلسل ہے۔

حضرات! رسول اللہ ﷺ جس وقت اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت اکثر علاقوں میں مملکت کا مذہب متعین ہوتا تھا، دوسرے مذاہب کے لوگوں کو یا تو وہاں رہنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی یا کم سے کم انھیں اپنے مذہب کی تبلیغ واشاعت کی اجازت نہیں دی جاتی تھی، ایرانی حکومت کا مذہب آتش پرستی تھا، ان کے مذہبی تعصب کا حال یہ تھا کہ وہ رومیوں کے جن علاقوں پر قابض ہوتے تھے، وہاں عیسائیوں کے مذہبی مقامات کی ایک ایک اینٹ اُکھاڑ پھینکتے تھے،

☆ مجلس تعمیر ملت حیدرآباد کی دعوت پر سید خلیل اللہ حسینیؒ توسیعی خطبات کے پروگرام میں دیا جانے والا خطبہ۔

روم میں وہ عیسائیت نافذ تھی، جو در حقیقت سینٹ پال کی ایجاد تھی، یہاں بُت پرستوں کو تو رہنے کا موقع ہی نہیں تھا، یہودیوں کے لئے بھی عرصۂ حیات تنگ تھا؛ بلکہ عیسائیوں کے وہ فرقے جنھیں مرتد قرار دے دیا گیا تھا اور جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا ماننے کو تیار نہیں تھے، وہ بھی رومی سلطنت میں اس کی وسعت کے باوجود کوئی جائے پناہ نہیں پاتے تھے اور ایسے علاقوں کی پناہ حاصل کئے ہوئے تھے، جہاں باضابطہ کوئی حکومت نہیں تھی، جیسے حجاز وغیرہ کا علاقہ۔

جب مکہ سے دین حق کا سورج طلوع ہوا تو اسی مزاج کے تحت کفر کی تاریکیوں کے لئے یہ ایک ناقابل قبول واقعہ تھا؛ چنانچہ مسلمانوں پر ایسے مظالم توڑے گئے اور ناانصافیاں روا رکھی گئیں، جو نہ صرف انسانیت کے خلاف تھیں؛ بلکہ عربوں کی مسلّمہ قبائلی روایات کے بھی خلاف تھیں؛ اسی لئے بالآخر مسلمانوں کو ہجرت کا حکم دیا گیا اور رسول اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء ہجرت کرنے پر مجبور ہوئے، چنانچہ ایک طویل عرصہ تک عام معمول یہی رہا کہ جب کسی خطہ پر غیر مسلموں کا اقتدار مستحکم ہو جاتا تو مسلمان وہاں سے عالم اسلام کی طرف رخت سفر باندھتے؛ تاکہ وہ پوری آزادی کے ساتھ اپنے مذہب پر عمل کر سکیں، ہاں کہیں کہیں ایسا ضرور ہوا کہ مقامی حکمراں کے منصفانہ مزاج کو دیکھتے ہوئے اور ان کی طرف سے ملنے والی مذہبی آزادی کو ملحوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کا کوئی گروہ وہاں قیام پذیر ہو گیا؛ لیکن بڑے پیمانہ پر ایسے واقعہ کا ظہور غالباً سقوط اندلس کے بعد ہوا، جہاں مسلمانوں کے آخری فرمانروا نے اس معاہدہ کے ساتھ اقتدار کی کلید عیسائی فرمانروا کے حوالہ کی کہ جو مسلمان یہاں رہنا چاہیں، انھیں اپنے مذہب پر عمل کی پوری آزادی حاصل ہوگی، ان کی عبادت گاہیں قائم رہیں گی اور انھیں وہ تمام حقوق دیئے جائیں گے، جنھیں آج ''انسانی حقوق'' کہا جاتا ہے؛ چنانچہ قرطبہ، غرناطہ اور بلنسیہ وغیرہ میں مسلم آبادی کے چھوٹے چھوٹے جزیرے موجود تھے؛ جیسا کہ علامہ ابن ہمامؒ (م:۸٦١) اور دوسرے فقہاء کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے، افسوس کہ عیسائی حکمرانوں نے اس معاہدہ کا ذرا بھی پاس ولحاظ نہیں رکھا اور کچھ ہی عرصہ بعد ایسے روح فرسا مظالم ڈھائے کہ شاید ہی انسانی تاریخ میں انسانیت سوزی اور ظلم وجور کی ایسی مثال مل سکے، مسلمانوں کا نہ صرف قتل عام کیا گیا؛ بلکہ انھیں سمندر کی بے رحم موجوں کے حوالہ بھی کر دیا گیا اور بالآخر تھوڑے ہی عرصہ میں اسپین فرزندان توحید سے خالی ہو گیا اور مسلمان یا تو یہاں سے ہجرت کر گئے یا انھوں نے راہ حق میں دار ورسن کو گلے لگایا۔

حضرات! یورپ میں کلیسا اور حکومت کی طویل جنگ اور کلیسا کی شکست پر اس جنگ کے اختتام نے ایک نئے تصور کو جنم دیا کہ سلطنت کا اپنا کوئی مذہب نہ ہو جس پر ملک میں رہنے والے تمام شہری عمل کرنے کے پابند ہوں؛ بلکہ مذہب کو ایک نجی مسئلہ کا درجہ حاصل ہو اور ہر شہری کو نجی زندگی میں اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی آزادی ہو، اس تصور نے جہاں لادینیت کو فروغ دیا اور انسانیت کو اس سے ناقابل تلافی نقصان پہنچا، وہیں اس کا ایک مثبت پہلو یہ تھا کہ مغرب میں مذہبی جور وتشدد ختم ہوا اور پوری دنیا میں بڑے پیمانہ پر مذہبی اقلیتیں وجود میں آئیں؛ اسی لئے آج

دنیا میں مذہبی، تہذیبی اور لسانی اقلیتوں کے اعداد وشمار جمع کئے جائیں تو شاید وہ اکثریتی فرقے سے بھی بڑھ جائیں، یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا میں اقلیتوں کے حقوق کو خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی ہے، جو بین الاقوامی معاہدات کا ایک حصہ ہے، اور یہ ضروری بھی ہے؛ کیوں کہ اگر اکثریت ظلم وجور پر اُتر جائے اور فرقہ پرستی کا مظاہرہ کرنے لگے تو بعض اوقات ''اکثریتی آمریت''، شخصی آمریت سے بھی بڑھ جاتی ہے۔

خود مسلمان بھی بہ حیثیت اقلیت آج مشرق سے مغرب تک دنیا کے ہر علاقہ میں موجود ہیں اور کہا جاتا ہے کہ پوری دنیا کی مسلم آبادی کا قریب قریب پچاس فیصد حصہ غیر مسلم ممالک میں آباد ہے، بیسویں صدی میں بہ حیثیت اقلیت مسلمانوں کی کثرت کے بہت سے اسباب ہیں، جن میں چند خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

اول: یہ کہ مغرب کی استعماری طاقتوں نے جب عالم اسلام پر قبضہ کیا تو وہ مزدور اور کارکن کی حیثیت سے بڑی تعداد میں زیر قبضہ ممالک سے مسلمانوں کو اپنے یہاں لے گئے، جیسے فرانس میں بڑی تعداد میں موجود جزائری مسلمان یا جنوبی افریقہ میں ملئے نسل کے لوگ۔

دوسرے: مغربی ملکوں نے ایک پالیسی یہ بھی اختیار کی کہ مسلمان ملکوں میں اپنے پسندیدہ اقتدار کو مستحکم کرنے کے لئے وہاں کی مسلمان آبادی کو مغربی ملکوں میں منتقل ہونے کی ترغیب دی جائے؛ چنانچہ فلسطین اور بوسنیا وغیرہ سے بڑی تعداد میں مسلمانوں کو مغربی ملکوں میں پناہ دی گئی۔

تیسرے: مسلمان حکومتوں میں جمہوریت اور انسانی حقوق سے محرومی اور سیاسی مخالفین کے ساتھ مظالم کے باعث بھی بہت سے مسلمان یورپ اور امریکہ کی طرف منتقل ہوئے، ان تارکین وطن کو اظہار رائے کی آزادی حاصل ہوئی اور مغربی ملکوں کو یہ فائدہ ہوا کہ انھیں اپنے یہاں ان حکومتوں کے ایک اپوزیشن گروپ کو رکھنے اور ان کی پرورش کرنے کا موقع ملا؛ تاکہ بوقت ضرورت ان ملکوں کی حکومت کو غیر مستحکم کیا جاسکے اور وہاں اپنی پسند کے حکمراں رکھے جاسکیں، عراق، افغانستان اور مغربی کنارہ (فلسطین) کے حکمراں اس کی واضح مثال ہیں۔

چوتھے: مغرب کی صنعتی ترقی کی وجہ سے وہاں کارکنوں کی ضرورت بڑھی اور مغرب میں شرح پیدائش کی کمی نے اس ضرورت میں مزید اضافہ کردیا، دوسری طرف چوں کہ مغرب نے عالم اسلام پر جدید ٹکنالوجی کا راستہ بند کررکھا ہے، یہ ممالک صنعتی ترقی کے اعتبار سے عام طور پر بہت پیچھے ہیں، اور یہاں کے ہنرمندوں اور مزدوروں کو مقامی طور پر حسبِ ضرورت کسب معاش کے مواقع فراہم نہیں ہیں؛ اس لئے ایک بڑی تعداد ایشیائی ملکوں سے مغرب کی طرف منتقل ہورہی ہے۔

زیادہ تر یہی اسباب ہیں، جن کی وجہ سے غیر مسلم ممالک میں مسلمان اقلیتوں کی اچھی خاصی تعداد ہے، اس کے علاوہ ادھر چند دہوں سے عالم اسلام سے بہت سے مسلمان دعوتی نقطۂ نظر سے بھی مغرب منتقل ہوئے ہیں

اور وہاں اسلام قبول کرنے کا رجحان بڑھ رہا ہے، خاص کر نائن الیون کے بعد سے؛ لیکن افسوس کہ دعوتی نقطۂ نظر سے ہجرت کرنے والے تارکین وطن اور ان کی کوششوں سے اسلام قبول کرنے والے نومسلموں کی تعداد ابھی بھی بہت تھوڑی ہے؛ البتہ ہندوستان کی نوعیت شاید پوری دنیا سے مختلف ہے، جہاں مسلمانوں نے تقریباً ایک ہزار سال حکومت کی اور وہاں تارکین وطن کے بجائے مقامی اور پشتینی مسلمان آباد ہیں، پھر بھی وہ اقلیت میں ہیں، اسلامی تاریخ میں شاید ہی اس کی کوئی مثال ملے کہ مسلمان کسی خطہ میں اتنے طویل عرصہ تک برسر اقتدار رہنے کے باوجود اقلیت میں رہے ہوں، یقیناً دعوت دین سے بے توجہی نے انھیں اس صورتِ حال سے دوچار کیا ہے۔

حضرات! عام طور سے کثیر مذہبی معاشرہ کا بانی مغرب کو سمجھا جاتا ہے؛ لیکن اگر غور کیا جائے تو اس کی بنیاد اسلام نے رکھی ہے، رسول اللہ ﷺ ہجرت سے پہلے چاہتے تھے کہ اہل مکہ اگر اسلام قبول نہ بھی کریں تو کم سے کم مسلمانوں کو اسلام پر عمل کرنے اور اس کی تبلیغ کرنے کی اجازت دے دیں؛ چنانچہ اہل مکہ نے رسول اللہ ﷺ کو صلح کے دو فارمولے پیش کئے، ایک یہ کہ ہم دِنوں کی تقسیم کرلیں، کچھ دن ہمارے دیویوں اور دیوتاؤں کی عبادت ہوا کرے، جس میں آپ بھی شریک ہوں، اور کچھ دن آپ کے خدا کی عبادت ہو اور اس میں ہم بھی شرکت کریں، دوسرا فارمولہ یہ تھا کہ دنوں کی تقسیم نہ ہو؛ بلکہ روزانہ آپ کے خدا کی بھی عبادت ہو اور ہماری دیویوں اور دیوتاؤں کی بھی، اور ان دونوں کی عبادت میں آپ کی بھی شرکت ہو اور ہم سب کی بھی، قرآن مجید نے بتایا کہ یہ دونوں فارمولے قابل عمل نہیں ہیں؛ چوں کہ توحید وشرک ایک دوسرے کی ضد ہیں، جس طرح دن ورات اور روشنی وتاریکی ایک ساتھ جمع نہیں ہوسکتے، اسی طرح توحید اور شرک کا جمع ہونا بھی ممکن نہیں؛ البتہ قرآن مجید نے ایک تیسرا فارمولہ پیش کیا کہ اگر اہل مکہ ایمان لانے پر تیار نہیں ہیں تو یہ بات قابل عمل ہوسکتی ہے کہ مشرکین اپنے دین پر عمل کریں اور مسلمانوں کو ان کے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت دیں ''لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ'' (الکافرون:۶) ــــ اس طرح ایک ایسا تکثیری معاشرہ وجود میں آسکتا ہے، جس میں مختلف مذاہب کے ماننے والے بقائے باہم کے اصول پر امن کے ساتھ زندگی گذاریں۔

حضرات! رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں اس کی دوسری مثال ہجرت حبشہ کا واقعہ ہے، حبشہ میں حکومت کا مذہب عیسائیت تھا، اگرچہ ۶ر ہجری کے بعد رسول اللہ ﷺ کے دعوتی مکتوب سے متاثر ہوکر حبشہ کے فرمانروا اِصحمہ نجاشی نے اسلام قبول کرلیا تھا؛ لیکن جس وقت مسلمانوں نے ہجرت کی اس وقت بادشاہ عیسائی تھا اور نجاشی کے اسلام قبول کرنے کے بعد بھی حبشہ کے لوگ یا پورے حکمراں گروہ کے ایمان لانے کا ذکر نہیں ملتا؛ اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے نجاشی کی وفات پر غائبانہ نماز جنازہ ادا فرمائی؛ البتہ نجاشی ایک عادل اور انصاف ور حکمراں تھا اور اس نے مسلمانوں کو مذہبی آزادی اور شہریوں کو حاصل ہونے والے دوسرے حقوق کے ساتھ حبشہ میں رہنے کی اجازت دی تھی، اسی لئے

حبشہ ہجرت کرنے والے صحابہ کرام ؓحکومت حبشہ کے ساتھ دلی ہمدردی رکھتے تھے اور جب ان پر بعض دشمنوں نے حملہ کیا اور جنگ کی نوبت آئی تو ان کے لئے دُعاء بھی فرماتے تھے۔

کثیر مذہبی معاشرہ کی تیسری نظیر ’میثاق مدینہ‘ ہے، جب آپ نے مدینہ ہجرت فرمائی تو اس وقت مدینہ میں تین قومیں آباد تھیں، مسلمان، یہودی اور مشرکین؛ چنانچہ آپ نے ایک معاہدہ کرایا، جس کا حاصل یہ تھا کہ مدینہ میں رہنے والے تمام گروہوں کو اپنے اپنے مذہب پر چلنے کی اجازت ہوگی؛ لیکن جب مدینہ پر کوئی بیرونی دشمن حملہ کرے گا تو سب مل کر مدینہ کا دفاع کریں گے، اس معاہدہ پر آپ نے یہودیوں اور عربوں کے تمام قبائل سے دستخط کروائے، پھر رفتہ رفتہ مدینہ کے مشرکین اپنی مرضی سے مسلمان ہوگئے اور یہودیوں کے ساتھ آپ نے اس معاہدہ کو اس وقت تک قائم رکھا، جب تک ان کی طرف سے کھلی ہوئی بدعہدی اور وعدہ خلافی کی نوبت نہیں آگئی۔

غرض کہ کم سے کم یہ تین مثالیں رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں ایک ایسے معاشرہ کی ملتی ہے، جس میں مختلف مذاہب کے لوگوں کو اپنے مذہب پر عمل کرتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ رہنے کا موقع فراہم کیا گیا، ان میں سے خاص کر مکہ اور حبشہ کی مثالیں مسلمان اقلیت کے اکثریت کے ساتھ تعلقات کی بنیاد فراہم کرتی ہیں، پھر اس تکثیری معاشرہ کے تصور کو آگے بڑھاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلم اقلیتوں کے حقوق مقرر فرمائے اور انھیں نہ صرف جان و مال، عزت وآبرو، معاشی جدوجہد وغیرہ میں آزادی عطا کی؛ بلکہ انھیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کا بھی پورا پورا حق دیا گیا، یہ اس طریقۂ عمل کے بالکل برعکس تھا، جو اس زمانہ کی حکومتوں میں مروج تھا اور جس میں مذہبی اقلیتوں کو کوئی حق حاصل نہیں ہوتا تھا، یہی وجہ ہے کہ تاریخ میں جتنی مسلم حکومتیں قائم ہوئیں، ان کے زیر سایہ مختلف مذاہب پر یقین رکھنے والے لوگوں نے امن وسکون کے ساتھ زندگی بسر کی اور اس حکومت کو اپنے لئے سایۂ رحمت سمجھا، شام سے لے کر اسپین تک ہر جگہ عیسائیوں کو پوری آزادی دی گئی، ہندوستان میں ہندو بھائیوں کے حقوق اور خاص کر ان کی مذہبی آزادی کا پورا پاس ولحاظ رکھا گیا، یہود جب عالم عیسائیت کے ظلم وجور کا نشانہ تھے اور انھیں مختلف علاقوں میں مارے مارے پھرنا پڑتا تھا، اس وقت ان کے لئے سب سے محفوظ پناہ گاہ عالم اسلام ہی تھی، جہاں وہ اپنے تمام تشخصات کے ساتھ باعزت طور پر زندگی گذارتے تھے؛ اس لئے شریعتِ اسلامی میں مسلمانوں کے لئے بہ حیثیت اقلیت برادرانِ وطن کے ساتھ زندگی گزارنے کے اُصول کی رہنمائی بھی ہے اور ایک ایسے کثیر مذہبی سماج کا تصور بھی، جس میں مسلمانوں کے زیر اقتدار غیر مسلم حضرات پوری آزادی، انسانی حقوق اور عزت نفس کے ساتھ زندگی بسر کرسکیں۔

حضرات! مسلمان جب کسی مشترکہ معاشرہ میں رہتے ہیں تو عموماً اور جب وہ اس معاشرہ میں اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں تو خصوصاً مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط کے سلسلہ میں تین بنیادی اُصولوں کو پیش

نظر رکھنا ضروری ہے، اول: انسانی وحدت، دوسرے: ہم وطنی کے حقوق اور تیسرے: اسلامی تشخصات کی حفاظت۔

انسانی وحدت

اسلام کا بنیادی عقیدہ ''وحدتِ اِلٰہ'' ہے، یعنی خدا ایک ہے اور وہی پوری کائنات کا خالق ہے، مخلوق خواہ کتنی بھی عظیم ہو وہ خدا نہیں ہوسکتی، یہ اسلام کے تمام افکار کی بنیاد اور احکامِ شریعت کی جڑ اور اصل ہے، ''وحدتِ اِلٰہ'' ہی سے دوسرا تصور ''وحدتِ انسانیت'' کا پیدا ہوتا ہے، یعنی جب تمام انسان خدا کی مخلوق اور اس کے محتاج ہیں تو وہ سبھی پیدائشی اعتبار سے درجہ ومرتبہ میں یکسانیت کے حامل ہیں؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے آخری خطبہ میں ان دونوں حقیقتوں کو جمع کرتے ہوئے فرمایا: ''**إن أباكم واحد ، وإن ربكم واحد وكلكم من آدم وآدم من تراب**''(۱) یعنی تم سب کا رب ایک ہے، اور تم سب کے باپ بھی ایک ہی ہیں، تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی ہے، قرآن مجید میں انسانی وحدت کے اس تصور کو واضح کرتے ہوئے فرمایا گیا :

> يَـآ أَيُّهَـا الـنَّـاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَّنِسَآءً . (النساء:۱)
>
> اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو، جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اُسی جان سے اس کا جوڑ ابنایا اور ان دونوں سے بہت مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیئے۔

ایک اور موقع پر ارشاد فرمایا گیا :

> وَهُوَ الَّذِىْ أَنْشَأَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ وَّمُسْتَوْدَعٌ . (الانعام:۹۸)
>
> اور وہی ہے جس نے ایک جان سے تم کو پیدا کیا پھر ہر ایک کے لئے ایک جائے قرار ہے اور ایک اس کے سونپے جانے کی جگہ۔

اسلام سے پہلے مختلف مذاہب نے خاندانی بنیاد پر برتری اور کہتری کا مصنوعی تصور قائم کر رکھا تھا، عرب عجم کو حقیر سمجھتے تھے، اسرائیلیوں کے نزدیک غیر اسرائیلی ایک کمتر درجہ کی مخلوق تھے اور اصل میں وہ بنی اسرائیل کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے تھے، ہندو مذہب میں تو سماجی تفریق اپنی انتہاء کو پہنچی ہوئی تھی، جہاں 'برہمن' معبودوں کا مقرب ترین گروہ تھا، وہیں 'شودر' ایسے بدقسمت تھے کہ ان کے کانوں کو 'ویدوں' کے سننے کی بھی اجازت نہ تھی، اسی طرح ایرانی اپنے آپ کو ایک بالاتر مخلوق تصور کرتے تھے، ان کے نزدیک آریائی حکومت کرنے ہی کے لئے پیدا کئے گئے تھے اور شاہی خاندان کے بارے میں تو ان کا خیال تھا کہ ان کی رگوں میں خدا کا خون دوڑتا ہے، ان

---

(۱) سنن أبي داود ، كتاب الأدب ، باب في التفاخر بالأحساب، حدیث نمبر:۵۱۱۶، عن أبي هريرةؓ۔

حالات میں شریعتِ محمدی (ﷺ) دنیا میں آئی اور قرآن نے اعلان کیا کہ خاندان تعارف اور پہچان کے لئے ہے، اس سے عظمت وحقارت کا تعلق نہیں ہے اور نہ ان کو تفاخر کا سبب سمجھنا جائز ہے :

إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ أُنْثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَّقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا . (الحجرات:۱۳)

ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں؛ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔

اسلام نے ایک بنیادی اور انقلابی فکر دی کہ جو چیزیں بطور اتفاق کے انسان کو حاصل ہوتی ہیں، جیسے کسی کا سفید فام یا سیاہ فام ہونا، یا عربی اور عجمی ہونا، ان کی وجہ سے ایک انسان کو دوسرے انسان پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہوتی؛ بلکہ فضیلت اور عزت ومرتبت کا معیار اکتسابی چیزیں ہیں، جن کے حاصل کرنے میں انسان کی محنت اور اس کے اختیار کو دخل ہوتا ہے، چنانچہ ارشاد نبوی (ﷺ) ہے :

لا فضل لعربی علی عجمی ولا لأبیض علی أسود ، إن أکرمکم عند الله أتقاکم .

کسی عربی کو عجمی پر اور گورے کو کالے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، اللہ کے نزدیک تم سے سب سے زیادہ باعزت وہ ہے، جو سب سے زیادہ تقویٰ اختیار کرنے والا ہو۔

انسانی وحدت کا یہ تصور عالمگیر انسانی اُخوت اور بھائی چارہ کو وجود میں لاتا ہے، اس لئے کوئی شخص مسلمان ہو یا غیر مسلم 'انسانی اُخوت' اسے ایک ڈوری میں پرو دیتی ہے، اسلامی تصور کے تحت وہ ایک دوسرے کا بھائی ہے، سارے انسان انسانیت کے وسیع کنبہ کا حصہ اور ایک وسیع تر انسانی خاندان کے افراد ہیں؛ اسی لئے قرآن نے بحیثیت انسان ہر ابن آدم کو قابل احترام قرار دیا ہے :

وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ . (بنی اسرائیل:۷۰)

ہم نے انسان کو معزز بنایا ہے۔

نیز اس کے نزدیک تخلیق کے اعتبار سے انسانی ڈھانچہ بہترین قالب ہے :

لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنْسَانَ فِیْ أَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ . (التین:۴)

ہم نے انسان کو بہترین قالب میں پیدا کیا ہے۔

یہ تکریم واحترام تمام بنی نوعِ انسانی سے متعلق ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے عملی طور پر اس حقیقت کو واضح فرمایا، ایک بار ایک یہودی کا جنازہ جارہا تھا، آپ ﷺ کھڑے ہوگئے، لوگوں نے عرض کیا کہ یہ یہودی کا جنازہ ہے، آپ ﷺ

نے فرمایا کہ جان تو اس میں بھی ہے،(۱) غزوۂ احزاب کے موقع سے ایک مشرک مسلمانوں کے ہاتھوں مارا گیا، اہل مکہ نے خواہش کی کہ اس کی قیمت لے کر نعش ان کے حوالہ کر دیں، تو آپ ﷺ نے کوئی قیمت لئے بغیر نعش واپس کر دی؛ کیوں کہ انسانی نعش کی قیمت وصول کرنا انسانی احترام کے مغائر ہے، اسلام سے پہلے جنگ کا کوئی قانون نہیں تھا اور لوگ مقتول کے اعضاء تراش کر ہار پہنتے اور اپنی آتش انتقام بجھاتے تھے، اسلام نے ایک تو حتی المقدور جنگ سے بچنے کا حکم دیا؛ لیکن اگر اس کی نوبت آ ہی جائے تو جنگ کے مہذب قوانین مقرر کئے، من جملہ ان کے یہ ہے کہ اگر کوئی شخص گرفت میں آ جائے تو ایذاء پہنچا پہنچا کر قتل نہ کیا جائے اور جو مارے جائیں، ان کے اعضاء کاٹے نہ جائیں کہ یہ احترامِ انسانیت کے خلاف ہے۔

کافر و ذمی کا لفظ اہانت آمیز نہیں

اسلام بحیثیتِ انسان کسی غیر مسلم کی توہین وتحقیر کو بھی رَوا نہیں رکھتا، بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہے کہ غیر مسلم کے لئے ''کافر'' اور ''ذمی'' کا لفظ استعمال کر کے ان کی تحقیر کی گئی ہے، اسی طرح آج کل بعض غیر مسلم بھائی ''کافر'' کے لفظ کو اہانت آمیز اور حقارت انگیز خیال کرتے ہیں، یہ محض غلط فہمی اور پروپیگنڈہ ہے، ''کفر'' کے معنی انکار کے ہیں، قرآن مجید میں یہ لفظ انکار ہی کے معنی میں استعمال ہوا ہے، چنانچہ منکرین آخرت کے بارے میں ارشاد ہوا: ''وَ هُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كَافِرُوْنَ ''(یوسف:۳۷) اہل مکہ کو ان باتوں سے انکار تھا، جن کی دعوت رسول اللہ ﷺ دیا کرتے تھے؛ اس لئے وہ کہتے تھے: ''اِنَّا بِمَا اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كَافِرُوْنَ ''(الزخرف:۲۴) یعنی: ''آپ جس دین کو لے کر بھیجے گئے ہیں، ہم اس کا انکار کرتے ہیں'' اسی طرح جادو کے انکار پر بھی کفر کا اطلاق کیا گیا ہے، چنانچہ بعض انبیاء علیہم السلام کے مخالفین کا قول نقل گیا ہے :

قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّ اِنَّا بِهٖ كَافِرُوْنَ . (الزخرف:۳۰)

انھوں نے کہہ دیا کہ یہ تو جادو ہے اور ہم اس کو ماننے سے انکار کرتے ہیں۔

پس ''کافر'' کے معنی انکار کرنے والے، یعنی ایسے شخص کے ہیں، جو توحید اور اسلامی تعلیمات کو قبول نہیں کرتا ہو، گویا یہ غیر مسلم "Non Muslim" کا ہم معنی لفظ ہے، پس یہ ایک حقیقت کا اظہار ہے نہ کہ کسی شخص کی توہین، اس کی واضح دلیل یہ ہے کہ قرآن مجید میں متعدد مواقع پر اس عہد کے غیر مسلموں کو ''کافر'' کے لفظ سے مخاطب کیا گیا ہے؛ لیکن انھوں نے اس کا برا نہیں مانا، اگر یہ لفظ اہانت آمیز ہوتا تو یقیناً انھوں نے اس طرزِ تخاطب پر اعتراض کیا ہوتا، پھر باوجودیکہ یہ لفظ اہانت آمیز نہیں ہے، فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی کو ''اے کافر!'' کہنے سے ایذاء ہوتی ہو، تو اس شخص کو اس طرح خطاب نہ کیا جائے اور اگر کرے گا، تو گنہگار ہوگا :

(۱) بخاری، حدیث نمبر: ۱۳۱۲، باب من قام لجنازة يهودی۔

ولو قال لذمي يا كافر! يأثم إن شق عليه . (۱)

اگر کسی نے کسی ذمی کو اے کافر کہہ کر پکارا اور اس پر یہ گراں گذرتا ہو تو اے کافر کہنے والا شخص گناہ گار ہوگا۔

اسی طرح عربی زبان میں ''ذمۃ'' کے معنی ''عہد'' کے ہیں، ''ذمی'' اس شخص کو کہا جاتا ہے، جس کی حفاظت کا عہد کیا جائے، چنانچہ عربی زبان کی مشہور لغت ''لسان العرب'' میں ہے :

رجل ذمی ، معناه له عهد . (۲)

''مردِ ذمی'' کے معنی ایسے شخص کے ہیں، جس کے لئے عہد کیا گیا ہو۔

اسی طرح علامہ ابن اثیرؒ اس بات پر روشنی ڈالتے ہوئے کہ غیر مسلم اقلیت کو اہل ذمہ کیوں کہا جاتا ہے؟ رقمطراز ہیں :

سمی أهل الذمة لدخولهم في عهد المسلمين وأمانهم . (۳)

اہل ذمہ اس لئے نام رکھا گیا ہے کہ وہ مسلمانوں کے عہد اور ان کی امان میں داخل ہوجاتے ہیں۔

اس لئے یہ محض غلط فہمی ہے کہ قرآن مجید اور حدیثِ نبوی ﷺ میں غیر مسلموں کے لئے اہانت آمیز تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

ہم وطنوں کی حیثیت

حضرات! انسان دنیا میں اپنے لئے ایسی جگہ کا محتاج ہوتا ہے، جہاں اس کا مستقل قیام ہوسکے اور انسانی فطرت یہ ہے کہ وہ جہاں پیدا ہوتا ہے اور بود وباش اختیار کرتا ہے، اس سرزمین سے اسے ایک محبت اور خصوصی نسبت سی ہوجاتی ہے، یہ محبت کوئی مذموم عمل نہیں ہے؛ چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کو سرزمین مکہ سے بڑی محبت تھی، جب آپ نے مکہ سے ہجرت کی تو مکہ سے نکلتے ہوئے ارض مکہ کو خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

ما أطيبک من بلد ، وأحبک إليّ ، ولو لا أن قومي أخرجوني منک ماسكنت غيرک . (۴)

---

(۱) الأشباه والنظائر:۲/۲۵۷۔

(۲) لسان العرب:۵/۵۹۔ (۳) النهاية:۲/۱۶۸۔

(۴) ترمذی ، کتابالمناقب ، مسند أبي يعلى :۵/۶۹،وصحيح ابن حبان :۳۷۰۹، وقال الهيثمی في مجمع الزوائد:۳/۶۱۵،رواه أبويعلى ورجاله ثقات۔

تو کتنا پاکیزہ اور مجھے کس قدر محبوب شہر ہے، اگر میری قوم نے مجھے تیری زمین سے نکالا نہ ہوتا تو میں کہیں اور مقیم نہ ہوتا۔

پھر جب آپ نے مدینہ منورہ کو اپنا وطن بنایا تو دُعاء فرمائی :

اللهم حبب إلينا المدينة كما حببت مكة أو أشد . (۱)

اے اللہ! جیسے مکہ کی محبت آپ نے میرے اندر پیدا فرمائی تھی، ویسی ہی؛ بلکہ اس سے بڑھ کر محبت ہمارے دل میں مدینہ کی پیدا فرمادے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کو مدینہ سے ایسی محبت ہوئی کہ جب آپ سفر سے واپس تشریف لاتے اور مدینہ کے کنارے پر واقع کوہِ اُحد پر نظر پڑتی تو آپ کا روئے انور چمک اُٹھتا اور سواری کی رفتار تیز ہو جاتی؛ یہاں تک کہ مکہ کے فتح ہو جانے کے بعد بھی آپ نے مدینہ کو اپنا وطن باقی رکھا؛ بلکہ مکہ میں نماز سفر ادا فرمائی اور حج وعمرہ کے موقع سے جب بھی مکہ تشریف آوری ہوئی، آپ نے وہاں حسبِ ضرورت ہی قیام فرمایا، غرض کہ وطن سے محبت اگر شرعی حدود میں ہو اور ناانصافی اور تعصب کا باعث نہ بنے تو بری بات نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ جب وطن سے محبت ہوگی تو اہل وطن سے محبت ہونا بھی فطری بات ہے اور ان میں مسلمان اور غیر مسلم دونوں ہوں گے؛ اسی لئے اسلام میں جس طرح اُخوت کا ایک دائرہ مسلمانوں کے درمیان ہے، اسی طرح جو ہم وطن ہیں، وہ بھی ہمارے بھائی ہیں، — بعض حضرات کو خیال ہوتا ہے کہ غیر مسلموں کو کیسے بھائی کہا جاسکتا ہے؟ لیکن قرآن مجید کی تعبیر کو دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال درست نہیں ہے اور ہم وطنوں کے ساتھ بھی مسلمان ''وطنی اُخوت'' کا رشتہ رکھتے ہیں، اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انبیاء کو ان کی ہم وطن قوموں کا بھائی قرار دیا گیا، اس سلسلہ میں یہ آیتیں ملاحظہ کی جاسکتی ہیں :

○ **كَذَّبَتْ قَوْمُ نُوحِ نِ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ نُوحٌ أَلاَ تَتَّقُوْنَ .** (الشعراء:۱۰۵-۱۰۶)

قومِ نوح نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی نوح نے ان سے کہا تھا ''کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟''

○ **كَذَّبَتْ عَادُ نِ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوهُمْ هُوْدٌ أَلاَ تَتَّقُوْنَ .** (الشعراء:۱۲۳-۱۲۴)

---

(۱) بخاری، کتاب المرضی، باب من دعا برفع الوباء والحمی، ومسلم، کتاب الحج، ومسند احمد، حدیث السیدة عائشہؓ۔

عاد نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی ہود نے ان سے کہا تھا'' کیا تم ڈرتے نہیں؟''

○ كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوْهُمْ ، صَالِحٌ أَلاَ تَتَّقُوْنَ . (الشعراء:۱۴۱-۱۴۲)

ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی صالح نے ان سے کہا تھا'' کیا تم ڈرتے نہیں؟''

○ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطِ نِ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ أَخُوْهُمْ ، لُوْطٌ أَلاَ تَتَّقُوْنَ . (الشعراء:۱۶۰-۱۶۱)

لوط کی قوم نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ ان کے بھائی لوط نے ان سے کہا تھا '' کیا تم ڈرتے نہیں؟''

اس سلسلہ میں یہ نکتہ خاص طور پر غور کئے جانے کے لائق ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے دو قوموں میں دعوت حق کا فریضہ انجام دیا، ایک مدین نامی شہر کے باشندوں میں، جس سے آپ کا وطنی تعلق تھا، دوسرے اصحابِ ایکہ میں، تو قرآن نے جہاں اہل مدین میں حضرت شعیب کی دعوت کا ذکر کیا ہے وہاں خاص طور پر رشتۂ اُخوت کا ذکر فرمایا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

وَإِلٰى مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْباً. (الأعراف:۸۵،ھود:۸۴،العنکبوت:۳۶)

اور مدین کی طرف ہم نے ان کے بھائی شعیب کو بھیجا۔

—— اور جہاں اصحابِ ایکہ میں دعوت کا ذکر ہے وہاں رشتۂ اُخوت کا ذکر نہیں کیا گیا ہے؛ کیوں کہ حضرت شعیب علیہ السلام وہاں کے رہنے والے نہیں تھے :

كَذَّبَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ الْمُرْسَلِيْنَ ، إِذْ قَالَ لَهُمْ شُعَيْبٌ أَلاَ تَتَّقُوْنَ . (الشعراء:۱۷۶-۱۷۷)

اصحاب الایکہ نے رسولوں کو جھٹلایا، یاد کرو جب کہ شعیب نے ان سے کہا تھا'' کیا تم ڈرتے نہیں؟''

غرض کہ جیسے انسانی اُخوت کا عالمگیر رشتہ پوری دنیا کے انسانوں کے درمیان وسیع تر بھائی چارہ کی تشکیل کرتا ہے، اسی طرح ایک دائرہ وطنی اُخوت کا بھی ہے، جو تمام ہم وطنوں کو بھائی بھائی قرار دیتا ہے، خواہ مذہب کے اعتبار سے ان کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہو۔

اسلامی تشخصات کی حفاظت

بزرگانِ محترم! مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، ضروری ہے کہ ان پر دین کی محبت تمام محبتوں؛ یہاں تک کہ خونی رشتوں پر بھی مقدم ہو؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَاءَ كُمْ وَاِخْوَانِكُمْ اَوْلِيَاءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ . (التوبۃ:۲۳)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، اپنے باپوں اور بھائیوں کو بھی اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں، تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔

اسی لئے کسی مسلمان کے لئے قطعاً اس بات کی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ وہ کسی بھی دوسرے تعلق پر دین کے تعلق کو قربان کردے، یہی وجہ ہے کہ جب بھی انبیاء اور ان کے متبعین کے لئے اپنے وطن میں رہ کر دین حق پر عمل کرنا مشکل ہوگیا، انھیں وہاں سے ہجرت کر جانے کا حکم دیا گیا، سیدنا حضرت ابراہیم، حضرت شعیب، حضرت موسیٰ، حضرت لوط اور حضرت صالح —علیہم الصلوٰۃ والسلام— وغیرہ کی ہجرت کے واقعات قرآن مجید میں تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں، نیز تحفظ دین ہی کے لئے مسلمانوں کو بھی مکہ سے ہجرت کرنے کا حکم فرمایا گیا؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قُلْ اِنْ كَانَ آبَاؤُكُمْ وَاَبْنَاؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ ، وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا ، وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا ، وَمَسَاكِنُ تَرْضَوْنَهَا اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ ، فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللهُ بِاَمْرِهٖ ، وَاللهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ . (التوبۃ:۲۴)

اے نبی! کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ اور تمہارے بیٹے اور تمہارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمہارے عزیز واقارب اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں، تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔

اس لئے اسلام مسلمانوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ کثیر مذہبی معاشرہ میں رہتے ہوئے بھی اپنی شناخت اور پہچان کو باقی رکھیں اور برادرانِ وطن کے ساتھ اپنی پہچان کو گم نہ کرلیں، یہی روح ہے اس بات کی کہ رسول اللہ ﷺ نے

دوسری اقوام کی مشابہت اختیار کرنے سے منع فرمایا ہے؛ چنانچہ حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما سے مروی ہے :

لَيْسَ مِنَّا مَنْ تَشَبَّهَ بِغَيْرِنَا ، لَا تَشَبَّهُوا بِالْيَهُوْدِ وَ لَا بِالنَّصَارىٰ الخ .(۱)

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: جو دوسروں کی مشابہت اختیار کرے وہ ہم میں سے نہیں ہے، یہودیوں اور عیسائیوں سے مماثلت اختیار نہ کرو۔

اس تشبّہ اور مماثلت کے چار مدارج ہو سکتے ہیں :

(الف) دوسری قوموں کے مذہبی شعائر میں مماثلت اختیار کی جائے، جیسے مسلمان صلیب یا زنار پہننے لگیں، یا سکھوں کے جو مخصوص شعائر ہیں، ان کو استعمال کریں، فقہاء نے اسے باعثِ کفر قرار دیا ہے؛ چنانچہ مجوسی خاص قسم کی ٹوپی پہنا کرتے تھے، فقہاء نے اس کے بارے میں کہا ہے :

وَ لَوْ وَضَعَ عَلٰى رَأْسِهٖ قَلَنْسُوَةَ الْمَجُوْسِ كَفَرَ . (۲)

اگر اپنے سر پر مجوسیوں کی خاص ٹوپی پہنے تو یہ کفر ہے۔

فقہاء کے یہاں زنار کے بارے میں بھی اسی طرح کی صراحت ملتی ہے، ہندوستان میں قشقہ لگانے کا حکم بھی یہی ہے؛ کیوں کہ وہ ہندو بھائیوں کے مذہبی شعائر میں سے ہے۔

(ب) غیر مسلم مذہبی تہواروں میں شرکت —— یہ اگر یوں ہی ہو یا اس کا مقصد اپنے گمان کے مطابق رواداری ہو، تب بھی جائز نہیں اور اگر ان کے مذہبی معتقدات اور افعال پر خوشنودی و رضامندی کا اظہار اور تائید وتحسین مقصود ہو، تو کفر ہے: ''إِنَّمَا الرِّضَا بِالْكُفْرِ مُسْتَحْسِنًا كُفْرٌ''(۳) —— کوئی شخص جس مذہب پر عقیدہ نہ رکھتا ہو اور اپنے عقیدہ کے مطابق اس کو نادرست خیال کرتا ہو، اس میں شرکت اور اس پر رضامندی وخوشنودی کا اظہار کھلی ہوئی دو عملی اور نفاق کی بات ہے؛ اس لئے اسلام نہ مسلمانوں کے لئے اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ ایسا منافقانہ رویہ اختیار کریں اور نہ غیر مسلموں سے خواہش کرتا ہے کہ وہ اسلامی شعائر کو اختیار کریں اور مسلمانوں کے مذہبی تہواروں میں شریک ہوں۔

(ج) تیسرا درجہ 'تہذیبی تشبّہ' کا ہے، یعنی ایسی وضع قطع اور لباس، جو کسی خاص قوم کی شناخت بن گئی ہو اور اس کا مذہب سے تعلق نہ ہو، کو اختیار کرنا، جیسے ہندوستان میں دھوتی، کہ اس کا مذہب سے تعلق نہیں؛ لیکن یہ ہندو بھائیوں کی پہچان سی بن گئی ہے، اگر کسی کو دھوتی میں ملبوس دیکھا جائے تو ذہن اسی طرف جاتا ہے کہ وہ ہندو ہے، ایسی مشابہت اور مماثلت اختیار کرنا مکروہِ تحریمی ہے، علامہ ابن تیمیہؒ نے اس پر تفصیل سے گفتگو کی ہے۔(۴)

---

(۱) الجامع للترمذی، حدیث نمبر: ۲۶۹۵، کتاب الاستیذان۔ (۲) الملتقط فی الفتاوی الحنفیة: ۲۴۵۔
(۳) الملتقط: ۲۴۵۔ (۴) دیکھئے: اقتضاء الصراط المستقیم: ۱/۹۴۔

لیکن تشبّہ کی اس جہت میں تبدیلی آتی رہتی ہے؛ کیوں کہ اگر کوئی وضع ایک عہد میں کسی قوم کی پہچان بن گئی ہواور بعد کواس کا استعمال عام ہوجائے اور وہ کسی خاص مذہبی گروہ کی شناخت باقی نہ رہ جائے تو پھر تشبّہ کی کیفیت ختم ہوجائے گی اور اس کا استعمال جواز کی حد میں آ جائے گا، حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے کوٹ، پینٹ کے بارے میں(۱)اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ نے ساری کے متعلق یہی لکھا ہے۔(۲)

(د) جوملبوسات اور تقریبات کسی خاص مذہبی گروہ کی پہچان نہیں ہیں، ان کے اختیار کرنے اور ان میں شریک ہونے کی گنجائش ہے، بہ شرطیکہ کسی اور سبب سے شریعت نے ان کو منع نہیں کیا ہو، اسی طرح انتظام وانصرام سے متعلق اُمور، جیسے طرزِ تعمیر، دفتری نظم ونسق، تجارتی طور وطریق وغیرہ میں غیر مسلم بھائیوں کے طریقۂ کار سے استفادہ کرنے میں کچھ حرج نہیں، حضرت عمرؓ نے حساب وکتاب کے نظام میں روم وایران کے طریقوں سے استفادہ کیا تھا،(۳) آپ ﷺ نے غزوۂ احزاب میں حضرت سلمان فارسیؓ کے مشورہ پر اہل فارس کے طریقہ پر خندق کھودوائی تھی۔(۴)

یہ اس بات پر دلیل ہے کہ ایسے اُمور میں غیر مسلم بھائیوں کے تجربات سے فائدہ اٹھانے میں کوئی حرج نہیں۔

تشبّہ اور مماثلت سے بچنے کا جواصولی حکم شریعتِ اسلامی میں دیا گیا ہے، وہ تعصب اور تنگ نظری پر مبنی نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ شناخت کی حفاظت ایک فطری عمل ہے، غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کی صورت اور آواز کو ایک دوسرے سے ممتاز رکھا ہے، انسان کے اندر شناخت کی حفاظت کا جذبہ اتنا بے پناہ ہے کہ ہر ملک اور ہر قوم اپنی شناخت الگ رکھنا چاہتی ہے، اپنے تمدن کی حفاظت کرتی ہے، اپنے جھنڈے الگ رکھتی ہے، ہر اسکول اپنا مستقل یونیفارم رکھتا ہے، گورنمنٹ کے مختلف محکموں کے الگ الگ یونیفارم ہوتے ہیں، یہ سب شناخت ہی سے متعلق ہیں؛ اس لئے اپنی شناخت کی حفاظت کوئی مذموم عمل نہیں ہے اور نہ اس میں دوسروں کی مخالفت اور ان کے تئیں تنگ نظری کا اظہار ہے، اسلام چاہتا ہے کہ مسلمان اپنی پہچان کو باقی رکھیں اور جہاں اسلامی نظام نافذ ہو، وہاں غیر مسلم بھائیوں کو بھی اس بات کی پوری آزادی فراہم کی جائے کہ وہ اپنی مذہبی وتہذیبی شناخت کے ساتھ زندگی گذاریں۔

مذہبی شناخت کی حفاظت ہی سے متعلق ایک اہم مسئلہ شریعت اسلامی پر عمل کا بھی ہے۔

---

(۱) امداد الفتاویٰ :۲۶۸/۴سوال نمبر۳۴۵۔

(۲) کفایت المفتی:۱۶۱/۹۔

(۳) الفاروق :۱۳۰/۲۔

(۴) البدایة والنهایة:۹۵/۴۔

شریعت اسلامی پر عمل

مسلمان جہاں کہیں بھی ہوں، مسلم ممالک میں یا غیر مسلم ممالک میں، دین کے چار شعبوں میں ان کے لئے قانونِ شریعت کا التزام ضروری ہے، اعتقادات، عبادات، احوالِ شخصیہ اور معاملات۔

اعتقادات سے مراد وہ احکام ہیں، جن کا تعلق قلب وضمیر سے ہو، جیسے: توحید، رسالت، آخرت کا یقین وغیرہ۔

''عبادات'' سے وہ احکام مراد ہیں، جن کا تعلق براہِ راست خدا اور بندے کے باہمی ارتباط سے ہے، جیسے: نماز، روزہ وغیرہ۔

''احوالِ شخصیہ'' سے مراد Parasnal Law ہے، اس میں نکاح و طلاق کے علاوہ میراث، وصیت اور مختلف اقارب سے متعلق حقوق وفرائض بھی آجاتے ہیں۔

''معاملات'' سے مراد مالی بنیاد پر دو افراد کے تعلقات ومعاہدات ہیں: تجارت، اجارہ، ہبہ وغیرہ اس شعبہ کے تحت آتے ہیں اور سود وقمار جیسے حرام معاملات بھی اسی دائرہ میں ہیں۔

یہ تمام قوانین وہ ہیں کہ چاہے مسلم اکثریت ملک ہو یا غیر مسلم اکثریت ملک، اور کلیدِ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں ہو یا نہیں ہو، مسلمانوں کے لئے ان قوانین میں شریعتِ اسلامی کی اطاعت واجب ہے، جو قوانین اجتماعی نوعیت کے ہوں، یا جرم وسزا سے متعلق ہوں، جیسے حدود، قصاص، نظامِ مملکت وغیرہ، ان شعبوں سے متعلق شرعی قوانین وہیں قابل نفاذ ہیں، جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو اور باگِ اقتدار ان کے ہاتھوں میں ہو، پس غیر مسلموں سے تعلقات ان قوانین پر عمل آوری کے حق سے دست برداری اور محرومی کی قیمت پر استوار نہیں کئے جاسکتے اور اس سلسلہ میں کسی تبدیلی کو قبول کرنے کا مطالبہ فی نفسہٖ نامعقول بھی ہے؛ کیوں کہ مسلمانوں کے ان پر عمل کرنے اور نہ کرنے سے غیر مسلم بھائیوں کو نہ کوئی فائدہ ہے اور نہ کوئی نقصان۔

یہ تین بنیادی اُصول ہیں، انسانی وحدت کا تصور، وطنی اُخوت کا تصور اور مذہبی شناخت کی حفاظت —— ان کی روشنی میں مسلمان اقلیت کے غیر مسلموں سے تعلقات کے بارے میں غور کیا جاسکتا ہے، یہاں اس بات کی وضاحت بھی مناسب ہوگی کہ غیر مسلم اقلیت (ذمی) کے ساتھ حسن سلوک کے بارے میں اسلام میں جو تعلیمات دی گئی ہیں اور جن کا فقہاء نے ذکر کیا ہے وہ غیر مسلم اکثریت کے ساتھ روابط کے سلسلہ میں بھی ہمیں رہنمائی کرتی ہیں؛ کیوں کہ غیر مسلم اقلیت کے ساتھ جس حسن سلوک کی دعوت دی گئی ہے اس میں تو احسان اور حسن سلوک پیش نظر ہے اور غیر مسلم اکثریت کے ساتھ روابط سے قومی، ملی اور مذہبی مفادات کا تحفظ بھی متعلق ہے، اس لئے ان کے ساتھ تو بدرجۂ اولیٰ ہمیں بہتر روابط رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

باہمی روابط وتعلقات

برادرانِ اسلام! جہاں تک مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی روابط کی بات ہے تو اس موضوع کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے: سماجی تعلقات، معاشی تعلقات، سیاسی تعلقات اور مذہبی تعلقات، تعلقات کے ان تمام دائروں کے سلسلے میں قرآن وحدیث سے ہمیں تفصیلی رہنمائی ملتی ہے۔

سماجی تعلقات

سماجی تعلقات کے سلسلہ میں بنیاداللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے :

لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْ الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ ، اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ . (الممتحنة:۸)

جولوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے اور نہ انھوں نے تم کوتمہارے گھر سے نکالا ہے، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ حسن سلوک کرنے اور انصاف برتنے سے نہیں روکتے، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔

یہ آیت بنیادی اہمیت کی حامل ہے اوراس سے یہ بات واضح ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں سے برسر پیکار نہ ہوں، مسلمانوں پر ان کے ساتھ حسن سلوک کا برتاؤ کرنا ضروری ہے، قرآن نے صاف کہا ہے کہ کسی قوم کا ہدایت کے راستہ پر آنا اور دین حق کو قبول کرنا اللہ تعالیٰ کی توفیق پر منحصر ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے کسی گروہ کے ساتھ بے تعلقی کا معاملہ کرنا اور حسن سلوک سے رک جانا درست نہیں، مسلمان ان کے ساتھ جو بہتر سلوک کریں گے، انھیں بہر حال اس کا اجر مل کر رہے گا :

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَ لٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ، وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ ، وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَ اَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ . (البقرة:۲۷۲)

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اور تم جو کچھ مال خرچ کرتے ہو، وہ اپنے ہی لئے، اور خرچ نہیں کرتے ہو مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں، اور جو بھی خرچ کروگے تم کو پورا پورا دیا جائے گا، (یعنی اس کا اجر ملے گا) اور تم پر ظلم نہیں ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ بعض انصار کی بنوقریظہ اور بنونضیر کے یہودیوں سے

قرابت تھی، انصار ان پر اس لئے صدقہ نہیں کیا کرتے تھے کہ جب ضرورت مند ہوں گے تو اسلام قبول کریں گے، (۱) اللہ تعالیٰ نے ان کے اس رویہ کو پسند نہیں کیا اور فرمایا گیا کہ ان کی ہدایت کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے؛ لیکن تم کو اس کی وجہ سے اپنا دستِ تعاون نہ کھینچنا چاہیے؛ کیوں کہ تم کو تمہارے انفاق کا اجر مل کر رہے گا۔

آپ اللہ ﷺ اور آپ کے رفقاء نے عملی طور پر اس کو برت کر دکھایا، مکہ میں شدید قحط پڑا، لوگ مردار وغیرہ کھانے پر مجبور ہوگئے ، یہ زمانہ مسلمانوں اور مشرکین مکہ کے درمیان شدید اختلاف اور گرما گرمی کا تھا، اس کے باوجود آپ ﷺ نے مکہ کے قحط زدہ مشرکین کے لئے پانچ سو دینار بھیجے؛ حالاں کہ اس وقت خود مدینہ کے مسلمان سخت مالی دقتوں اور فاقہ مستیوں سے دوچار تھے، نیز آپ ﷺ نے یہ رقم سردارانِ قریش ابوسفیان اور صفوان بن اُمیہ کو بھیجی، جو مسلمانوں کی مخالفت میں پیش پیش تھے اور مشرکین مکہ کی قیادت کررہے تھے۔ (۲)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بوڑھے غیر مسلم کو دیکھا کہ وہ بھیک مانگ رہا ہے، جب حضرت عمرؓ نے وجہ پوچھی تو کہا کہ ہمیں جزیہ ادا کرنا ہے، حضرت عمرؓ نے بیت المال سے اس کا وظیفہ مقرر فرمایا اور کہا: ہم نے تمہاری جوانی کو کھایا اور اب پھر تم سے جزیہ وصول کریں، یہ انصاف کی بات نہیں ہے''**ما أنصفناک أکلنا شیبتک، ثم نأخذ منک الجزیة**'' (۳)؛ چنانچہ فقہاء کے یہاں اس پر تو قریب قریب اتفاق ہے کہ صدقاتِ نافلہ غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے، حنفیہ کے نزدیک راجح یہ ہے کہ زکوۃ کے علاوہ دوسرے صدقاتِ واجبہ بھی غیر مسلموں کو دیے جاسکتے ہیں۔ (۴)

غرض کہ مسلمانوں کا رویہ اپنی غیر مسلم اکثریت کے ساتھ حسن سلوک کا ہونا چاہئے، اور مالی اعانت وغمخواری میں ان کو بھی شریک کرنا چاہئے۔

انسانی زندگی کا احترام وتحفظ

سماجی زندگی میں سب سے اہم مسئلہ امن وامان کا ہے اور امن وامان کا تعلق جان ومال اور عزت وآبرو سے ہے؛ چنانچہ شریعتِ اسلامی میں غیر مسلموں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو وہی اہمیت دی گئی ہے، جو مسلمانوں کی جان ومال اور عزت وآبرو کو حاصل ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے یہ اصولی بات ارشاد فرمائی ہے کہ ان کے خون ہمارے خون کی طرح اور ان کے مال ہمارے مال کی طرح ہیں :

دِمَائُهُمْ كَدِمَائِنَا ، وَ أَمْوَالُهُمْ كَأَمْوَالِنَا . (۵)

---

(۱) تفسیر قرطبی:۳۳۷/۳۔ (۲) ردّالمحتار:۳۰۲/۳،باب المصرف۔

(۳) نصب الرایة:۴۵۴/۳۔

(۴) دیکھئے:الدر المختار علی هامش ردالمحتار:۳۰۱/۳۔

(۵) نصب الرایة:۳۶۹/۴۔

چنانچہ قرآن مجید نے مطلق نفس انسانی کے قتل سے منع کیا ہے، ارشاد ہے :

لَا تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ اِلَّا بِالْحَقِّ . (بنی اسرائیل:۳۳)

کسی نفس کو جس کے قتل کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے، ناحق قتل نہ کرو۔

ایک اور موقع پر کسی معقول سبب کے بغیر ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل قرار دیا گیا :

مَنْ قَتَلَ نَفْساً بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِیْ الْاَرْضِ فَکَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعاً . (المائدہ:۳۲)

جس نے کسی نفس انسانی کو کسی دوسرے کے بدلے یا زمین میں فساد کے بغیر قتل کیا تو گویا اس نے پوری انسانیت کو قتل کر دیا۔

کیوں کہ اگر کوئی شخص ایک بے قصور شخص کو قتل کرسکتا ہے تو وہ انسانیت کے کسی بھی فرد کو قتل وغارت گری کا نشانہ بنا سکتا ہے؛ اس لئے گویا وہ پوری انسانیت کا قاتل ہے، ان آیات میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی قید نہیں ہے؛ بلکہ مطلقاً کسی بھی انسان کے قتل کو منع فرمایا گیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایسے غیر مسلم —— جس سے امن اور بقاءِ باہم کا معاہدہ ہو —— کے قاتل کے بارے میں فرمایا کہ وہ جنت کی بو سے بھی محروم رہے گا :

مَنْ قَتَلَ مُعَاهِدًا لَمْ یَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ ، وَ اِنَّ رِیْحَهَا یُوْجَدُ مِنْ مَسِیْرَةِ أَرْبَعِیْنَ عَامًا . (۱)

جس نے کسی معاہد (وہ غیر مسلم جس سے پرُ امن زندگی گزارنے کا معاہدہ ہو) کو قتل کیا، وہ جنت کی خوشبو بھی نہیں پائے گا؛ حالاں کہ اس کی بو چالیس سال کے فاصلہ سے محسوس کی جاسکتی ہے۔

اگر کوئی مسلمان غیر مسلم کو قتل کردے تو مسلمانوں کو بھی اس کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا؛ کیوں کہ قرآن مجید نے علی الاطلاق قصاص کا یہی اصول بتلایا ہے، جو شخص دوسرے شخص کا قاتل ہو، وہ اس کے بدلے قتل کیا جائے گا: ’’اَلنَّفْسُ بِالنَّفْسِ‘‘ (المائدہ:۴۵) اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے عہد میں ایک غیر مسلم (ذمی) کے قصاص میں ایک مسلمان کو قتل کیا گیا، (۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں مروی ہے کہ انھوں نے ’’ذمی‘‘ کے بدلے مسلمان کے قتل کا حکم دیا، (۳)

---

(۱) بخاری عن عبداللّٰہ بن عمروؓ، حدیث نمبر:۳۱۶۶۔

(۲) مصنف عبد الرزّاق:۱۰/۱۰۱۔ (۳) مصنف عبد الرزّاق:۱۰/۱۰۱۔

امام شافعیؒ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی نقل کیا ہے کہ انھوں نے بعض اہل ذمہ کو قتل کرنے والے مسلمانوں کو قتل کرنے کا حکم فرمایا۔(۱)

اگر مقتول کے ورثاء سزاءِ قتل کو معاف کردیں، یا قتل کے واقعہ میں قصد وارادہ کو دخل نہ ہو؛ بلکہ غلطی سے قتل کا ارتکاب ہوا ہو تو ان صورتوں میں قصاص کے بدلہ خون بہا (دیت) واجب ہوتا ہے؛ چنانچہ خون بہا بھی مسلمان اور غیر مسلم کا یکساں ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے غیر مسلم کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا کی، (۲) حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوہریرہ، حضرت اسامہ بن زید اور مختلف صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ مسلمان اور غیر مسلم کی دیت برابر ہوگی، علامہ زیلعیؒ نے تفصیل سے ان روایتوں کو نقل فرمایا ہے۔(۳)

ظاہر ہے کہ جان اور زندگی کے احترام میں اکثریت اور اقلیت کا کوئی فرق نہیں ہے؛ بلکہ بہ حیثیت انسان ہر شخص کی زندگی کا احترام واجب ہے، سوائے اس کے کہ کسی شخص نے اپنی مجرمانہ حرکتوں کی وجہ سے اپنے اس حق کو کھودیا ہو۔

املاک کا احترام

رسول اللہ ﷺ نے جو اصول مقرر فرمایا کہ غیر مسلموں کی جانیں مسلمانوں کی جانوں کی طرح ہیں اور ان کے مال مسلمانوں کے مالوں کی طرح ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی املاک بھی اسی طرح قابل احترام ہیں جیسا کہ مسلمانوں کی، بغیر رضامندی کے نہ کسی مسلمان کا مال لیا جاسکتا ہے نہ کسی غیر مسلم کا ''**إِلَّا اَنْ تَـكُـوْنَ تَجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ**''۔(النساء:۲۹)

فتح خیبر کے موقع سے بعض مسلمان فوجیوں نے یہودیوں کے جانور ذبح کردیئے اور کچھ پھل کھالئے، رسول اللہ ﷺ کو اطلاع ہوئی تو آپ ﷺ نے اس موقع پر خطاب کیا، اس عمل پر ناگواری ظاہر کی اور فرمایا کہ یہ تمہارے لئے حلال نہیں ہے۔(۴)

متعدد صحابہ رضی اللہ عنہم سے آپ ﷺ کا یہ ارشاد منقول ہے :

أَلاَ مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا أَوْ انْتَقَصَهُ أَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهِ أَوْ أَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسٍ ، فَأَنَا حَجِيْجُهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ .(۵)

---

(۱) مسندِ امام شافعی ، السنن البیہقی:۴۳/۱۲۔ (۲) سنن دارقطنی ، کتاب الحدود۔
(۳) دیکھئے:نصب الرایہ:۳۶۸/۴-۳۶۹۔ (۴) أبوداود،حدیث نمبر:۳۰۵۰۔
(۵) ابوداؤد،حدیث نمبر:۳۰۵۳۔

آ گاہ ہو جاؤ! جس نے کسی معاہد پر ظلم کیا، اس کی حق تلفی کی یا اسے اس کی طاقت سے زیادہ کا مکلّف کیا یا اس سے کوئی چیز اس کی رضا مندی کے بغیر لے لی، تو میں قیامت کے دن اس کا فریق ہوں گا۔

اسلامی قانون کی رو سے چوری کی سزا ہاتھ کاٹنا ہے، جیسے مسلمان کا مال چوری کرنے میں ہاتھ کاٹا جائے گا، اسی طرح اگر کوئی مسلمان چور غیر مسلم کا مال چوری کر لے تو اس صورت میں بھی اس کا ہاتھ کاٹا جائے گا، علامہ ابن قدامہ مقدسیؒ نے یہ لکھتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ یہ مسئلہ فقہاء کے یہاں متفق علیہ ہے، (۱) اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی نظر میں مسلمان اور غیر مسلم کی ملکیت یکساں قابل احترام ہے۔

عزت وآبرو کی حفاظت

یہی معاملہ عزت وآبرو اور عفت وعصمت کی حفاظت کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے بلا تفریقِ مذہب ہر بڑے کی توقیر کا حکم دیا ہے اور ہر چھوٹے کے ساتھ شفقت اور محبت کی تلقین کی ہے، مؤمنوں سے خطاب کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ عَسىٰ أَن يَكُونُوا خَيْراً مِّنْهُمْ وَلَا نِسَاءٌ مِّن نِّسَاءٍ عَسَى أَن يَكُنَّ خَيْراً مِّنْهُنَّ وَلَا تَلْمِزُوا أَنفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوا بِالْأَلْقَابِ . (الحجرات:۱۱)

اے ایمان والو! ایک گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے، ممکن ہے کہ وہ ان سے بہتر ہو اور نہ عورتیں دوسری عورتوں کا تمسخر کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں، نہ ایک دوسرے پر طعن کرو اور نہ ایک دوسرے کو برے القاب دو۔

اسی طرح مردوں سے فرمایا گیا ہے کہ وہ اپنی نگاہوں اور شرمگاہوں کی حفاظت کریں اور یہی حکم مسلمان عورتوں کو بھی دیا گیا، (النور:۳۱) یہ حکم مطلق ہے اور اس میں مسلمان اور غیر مسلم کی تفریق نہیں ہے، معلوم ہوا کہ غیر مسلموں کی عزت وآبرو کی بھی وہی اہمیت ہے، جو مسلمانوں کی ہے، عفت وعصمت کو مجروح کرنے والی چیزیں حرام ہیں، خواہ مسلمانوں کے ساتھ کی جائیں یا غیر مسلموں کے ساتھ، جو سزا کسی مسلمان عورت کی آبرو ریزی کی ہے، وہی سزا غیر مسلم عورت کی آبرو ریزی کی ہے، غرض کہ عزت وآبرو کے اعتبار سے غیر مسلم بھائیوں کو وہی درجہ حاصل ہے، جو مسلمانوں کو حاصل ہے۔

---

(۱) المغنی لابن قدامه:۱۲/۴۵۱، مع تحقيق : عبدالله بن عبد المحسن وغيره.

خوشی وغم میں شرکت

سماجی تعلقات کے دائرہ میں کھانا،کھلانا، پڑھنا، پڑھانا، باہمی ملاقات،خوشی وغم کے موقع پر دلداری وغیرہ اُمور بھی آتے ہیں،اسلام نے ان تمام شعبوں میں غیر مسلموں کے ساتھ بھی خوش گوار برتاؤ کا حکم دیا ہے،رسول اللہ ﷺ نے غیر مسلموں کی دعوت قبول فرمائی ہے، (۱) خود غیر مسلموں کو دعوت دی ہے (۲) انھیں اپنا مہمان بنایا ہے (۳) اپنے رفقاء کو غیر مسلم بزرگوں کی تجہیز وتکفین کے انتظام کا حکم دیا ہے (۴) نیز غیر مسلموں کی عیادت کی ہے، (۵) رسول اللہ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں فقہاء نے غیر مسلموں سے متعلق جو احکام دیے ہیں،ان میں سے چند یہ ہیں :

- مجوسی کا ہر قسم کا کھانا جائز ہے،سوائے ذبیحہ کے۔
- مسلمان اور مشرک رشتہ دار کے ساتھ صلہ رحمی کرنا درست ہے، وہ نزدیک کا ہو یا دور کا، اور ذمی ہو یا حربی،حربی سے مراد وہ شخص ہے، جو دشمن ملک کا شہری ہو۔
- مسلمانوں کے لئے عیسائی پڑوسی سے مصافحہ کرنا درست ہے۔
- یہودی اور عیسائی کی عیادت کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔
- جب کسی غیر مسلم کی وفات ہوجائے تو اس کے عزیز سے عیادت کے لئے یہ الفاظ کہے جائیں :

اَخْلَفَ اللّٰہُ خَیْرًا مِّنْہُ وَأَصْلَحَکَ . (ھندیۃ:۳۸۴/۵)

اللہ تجھ کو اس کا نعم البدل عطا فرمائے اور تمہاری حالت کو بہتر کرے۔

آج ضرورت ہے کہ سماجی زندگی سے متعلق تقریبات میں غیر مسلم بھائیوں کو مدعو کیا جائے اور اگر وہ دعوت دیں تو ان کی دعوت میں شرکت کی جائے ؛ کیوں کہ سماجی تعلقات ہی خوشگوار تعلقات کے قیام میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

معاشی تعلقات

محترم حضرات ! معاشی تعلقات کے معاملہ میں بھی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان کوئی تفریق نہیں،

(۱) صحیح بخاری،حدیث نمبر:۲۶۱۷،باب قبول الھدیة من المشرکین۔

(۲) الدر المنشور:۱۸۱/۵۔

(۳) الخصائص الکبریٰ:۱۲۳/۱۔

(۴) اعلاء السنن:۲۸۲/۸،باب ما یفعل المسلم اذا مات له قریب کافر۔

(۵) صحیح البخاری،حدیث نمبر۵۶۵۷،باب عیادۃ المشرک۔

نبوت کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کا ابوسفیان اور جبیر بن مطعم کے ساتھ مضاربت کرنا منقول ہے، اسی طرح خیبر کے فتح ہونے کے بعد آپ ﷺ نے وہاں کی اراضی یہودیوں کے قبضہ میں ہی رہنے دیں اور ان سے بٹائی پر معاملہ طے کرلیا، جس کا بخاری اور مختلف کتبِ احادیث میں ذکر موجود ہے، (۱) مسلمانوں کے لئے یہ بات درست ہے کہ وہ کسی غیر مسلم کے یہاں ملازمت کریں، چنانچہ حضرت علی ؓ نے ایک یہودی کے یہاں مزدوری کی ہے، کتبِ احادیث میں اس کا ذکر ہے، (۲) حضرت خباب ؓ لوہاری کے فن سے واقف تھے، انھوں نے عاص بن وائل کے لئے کام کیا، اس کا ذکر بھی احادیث میں موجود ہے: ''**خباب کان قینا فعل للعاص بن وائل**''. (۳)

اسی طرح یہ بات بھی درست ہے کہ مسلمان غیر مسلموں کو اپنے یہاں ملازمت کا موقع دیں، عرب میں سڑکوں کا کوئی باضابطہ نظام نہیں تھا اور پورا خطۂ عرب ریت سے ڈھکا ہوا تھا، اسی لئے راستہ کی شناخت دشوار ہوتی تھی اور جن لوگوں کو شناخت نہیں ہوتی تھی، وہ سفر میں کسی راہ بتانے والے کو ساتھ لے جاتے تھے، ان کو 'دلیل' کہا جاتا تھا، جس کے معنی راہبر کے ہیں، رسول اللہ ﷺ نے جب مدینہ کی طرف ہجرت فرمائی تو ایک مشرک کو اپنے لئے بطورِ 'دلیل' اجرت دے کر ساتھ رکھا، (۴) اسی لئے فقہاء اس بات پر متفق ہیں کہ مسلمان غیر مسلم کو اپنے یہاں ملازم رکھ سکتے ہیں: **یجوز أن یکون الأجیر ذمیا و المستأجر مسلما بلاخلاف**۔ (۵)

چنانچہ مسلم عہدِ حکومت میں غیر مسلم حضرات بڑے اونچے اور کلیدی عہدوں پر فائز رہے ہیں، حضرت امیر معاویہ ؓ کے زمانے میں حمص کا فینانشیل کمشنر اور حاکم ابن اُثال نامی ایک عیسائی تھا، عبدالملک بن مروان کا کاتب ابن سرجون تھا، یہ بھی عیسائی تھا، کاتب کی اہمیت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ اسی سے فرامینِ سلطنت کی مراسلت متعلق تھی اور بقول علامہ شبلیؒ وہ وزیر اعظم کے برابر یا اس سے دوسرے درجہ پر خیال کیا جاتا تھا، عباسی دور میں ابواسحاق صابی اس منصب پر فائز تھا، سلطنت دیلم کے تاجدار عضدالدولہ جیسے عظیم فرمانروا کا وزیر اعظم بھی ایک عیسائی تھا، جس کا نام نصر بن ہارون تھا، یہ تمام فرمانروا نہ صرف اپنی طاقت وحکمرانی میں ممتاز تھے؛ بلکہ مذہب سے بھی ان کا خاص تعلق تھا؛ لیکن ان کی مذہبیت غیر مسلم بھائیوں سے سلطنت کے اہم اور کلیدی شعبوں میں خدمت لینے میں حارج نہیں ہوئی۔ (۶)

---

(۱) صحیح البخاری، حدیث نمبر: ۴۲۴۸، باب معاملة النبی علی اهل خیبر۔

(۲) کنز العمال: ۳۲۱/۲۔

(۳) بخاری، حدیث نمبر: ۲۳۷۵، مسلم، حدیث نمبر: ۲۰۶۲۔

(۴) احکام أهل الذمة لابن قیم: ۲۰۷۔

(۵) الموسوعة الفقهیة: ۱۰۵، مادہ: اجارہ۔

(۶) تفصیل کے لئے دیکھئے: مقالاتِ شبلی: ۲۱۷/۲-۲۱۹۔

معاشی تعلقات میں اضافہ خاص کر غیر مسلم اکثریت کے ساتھ ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مفاد میں ہے اور تعلقات ہمیشہ دوطرفہ بنیادوں پر قائم ہوتے ہیں، اگر مسلمان غیر مسلم تاجروں اور کاروباریوں سے تعلقات رکھنے اور کاروبار کرنے میں گریز سے کام لیں تو اس سے اکثریتی فرقہ میں بھی تعصب کے جذبات پروان چڑھیں گے اورانجام کار یہ چیز خود مسلمانوں کے حق میں نقصاندہ ہوگی، اس لئے ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ ایسا ماحول پیدا نہ ہو، اس کی نظیر خود حیات طیبہ میں موجود ہے کہ مشرکین مکہ نے تو مسلمانوں کا معاشی اور سماجی بائیکاٹ کیا؛ لیکن مسلمانوں نے اہل مکہ کا بائیکاٹ نہیں کیا اور بعض ایسے علاقے جہاں سے مکہ کی تجارتی رسد روکی جاسکتی تھی، کو بھی روکا نہیں گیا، اسی طرح مدینہ میں یہودی قبائل کے اچھے خاصے مارکٹ موجود تھے اور مسلمان بھی بلا امتیاز وہاں سے مال خریدتے تھے اوران سے کاروباری تعلق رکھتے تھے۔

سیاسی تعلقات

حضرات! انسان جس خطہ میں رہتا ہو، وہاں کے سیاسی حالات سے بے تعلق نہیں رہ سکتا، کیوں کہ سیاسی مد وجزر اوراتار چڑھاؤ کا اثر زندگی کے تمام شعبوں پر پڑتا ہے اور بڑی حد تک سماج کا امن وامان بھی ان حالات سے متعلق ہوتا ہے؛ چنانچہ اسلام میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی روابط کی گنجائش رکھی گئی ہے، سیاست کا مقصد ملک میں قانون کی حکمرانی کو قائم رکھنا اور مستحکم بنانا ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت حجاز کے علاقہ میں کوئی باضابطہ حکومت موجود نہیں تھی؛ البتہ قبائلی روایات اور دستور کے مطابق تحفظ ہوا کرتا تھا اورلوگوں کے باہمی تعلقات قائم رہتے تھے۔

سیاسی اشتراک

اسی زمانہ میں مکہ میں ایک واقعہ پیش آیا کہ مکہ کے ایک شخص نے ایک بیرونی شخص کا حق ادا کرنے سے انکار کردیا، چوں کہ اُس کا تعلق مکہ سے نہیں تھا اور مکہ میں اس کے ہم قبیلہ لوگ بھی نہیں تھے، اس لئے ممکن نہ تھا کہ وہ بزورِ طاقت اپنا حق حاصل کرسکے، اس غریب الوطن شخص نے صحن کعبہ میں اہل مکہ کو اپنی بپتا سنائی اور ان کے ضمیر سے انصاف کے طلب گار ہوئے، اس موقع سے کچھ لوگ اس کی مدد کے لئے کھڑے ہوئے اور عبداللہ بن جدعان کے مکان پر ایک نشست ہوئی، اس میں آپ ﷺ نے بھی پوری سرگرمی سے شرکت کی اوراس طرح ''**حلف الفضول**'' نامی ایک تنظیم قائم ہوئی، جس کا مقصد انصاف کو قائم کرنا، ظلم کو روکنا اور ظالم کے خلاف مزاحمت کرنا تھا، یہ واقعہ نبوت سے پہلے کا تھا؛ لیکن رسول اللہ ﷺ کو یہ کام اس قدر پسند تھا کہ آپ ﷺ بعد میں بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر مجھے آج بھی اس کی طرف بلایا گیا تو میں اس پر لبیک کہوں گا: ''**لَوْ اُدْعٰى بِهٖ فِيْ الإسْلاَمِ لَأَجَبْتُ**''۔(۱)

---

(۱) البداية والنهاية:۹۱/۲۔

بنواُمیہ کے دور میں حضرت حسین رضی اللہ عنہ اور ولید بن عتبہ بن ابی سفیان کے درمیان ایک مسئلہ پر نزاع پیدا ہوگئی، جس میں ولید کی زیادتی تھی، حضرت حسین رضی اللہ عنہ نے اس سلسلہ میں اسی حوالہ سے لوگوں کی مدد چاہی، یکے بعد دیگرے کئی صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس پر لبیک کہا، بالآخر ولید کواپنے ارادہ سے باز آنا پڑا،(۱) یہ واقعہ اس بات کے لئے بنیاد فراہم کرتا ہے کہ سیاسی جدوجہد میں مسلمان اور غیر مسلم ایک دوسرے کے ساتھ اشتراک کرسکتے ہیں اور سیاسی تعلقات میں اصولوں کی بنیاد پر غیر مسلموں کا تعاون کیا جاسکتا اور ان سے تعاون لیا جاسکتا ہے، نیز ایسی سیاسی تنظیموں میں جو خالص مسلم تنظیم نہ ہو، مسلمان شریک ہوسکتے ہیں۔

قرآن مجید نے حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ تفصیل سے ذکر کیا ہے، مصر میں اس وقت مشرکین ہی کی حکومت تھی، حضرت یوسف علیہ السلام نے ملکی مفادات اور مصالح کو سامنے رکھتے ہوئے وزارتِ خزانہ طلب فرمائی، ''قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَائِنِ الْاَرْضِ ''(یوسف:۵۵) حضرت یوسف علیہ السلام کی خواہش قبول کی گئی اور انھوں نے اس فریضہ کو بہت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیا، اس سے معلوم ہوا کہ ایسے اقتدار میں شریک وسہیم ہونا بھی درست ہے، جس میں غیر مسلموں کو غلبہ حاصل ہو۔

مبنی برانصاف قوانین کی اطاعت

غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کے سیاسی تعلقات دو اصولوں پر مبنی ہوں گے، اوّل ان قوانین کی اطاعت پر، جو مبنی برانصاف ہوں؛ کیوں کہ آپ جب کسی ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں، تو یہ زبانِ حال سے اس ملک کے دستور کی پاسداری اور فرمانبرداری کا اقرار ہے اور ایک طرح کا عہد ہے، جو ہم نے اس ملک کے ساتھ کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ عہد کو پورا کرو: ''اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ''(المائدۃ:۱) ایک اور موقع پر فرمایا گیا: ''اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ''(الاسراء:۳۴) یعنی معاہدات اور وعدوں کی پاسداری کرو، قانون شکنی کو اسلام جائز نہیں قرار دیتا؛ بشرطیکہ وہ صریحاً عدل کے خلاف نہ ہوں۔

یہ بات پیش نظر رہنی چاہئے کہ اسلام میں معاہدات کو ایسی اہمیت حاصل ہے کہ ان کی وجہ سے بعض عمومی قوانین میں استثنائی صورت اختیار کی جاتی ہے؛ چنانچہ قرآن مجید کا یہ ارشاد قابل توجہ ہے :

> إِنَّ الَّـذِيْـنَ آمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللهِ ، وَالَّـذِيْـنَ آوَوْا وَّنَـصَـرُوْا أُوْلٰـئِكَ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَآءَ بَعْضٍ ، وَالَّذِيْنَ آمَنُوْا وَلَـمْ يُهَـاجِـرُوْا مَـالَـكُـمْ مِّـنْ وَّلاَ يَتِهِمْ مِّنْ شَيْئٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا ، وَإِنِ اسْتَـنْـصَـرُوْكُـمْ فِـي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلٰى قَـوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ . (الانفال:۷۲)

---

(۱) سیرت ابن هشام:۱/۱۳۵۔

جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانیں لڑائیں اور اپنے مال کھپائے اور جن لوگوں نے ہجرت کرنے والوں کو جگہ دی اور ان کی مدد کی، وہی دراصل ایک دوسرے کے ولی ہیں، رہے وہ لوگ جو ایمان تو لے آئے مگر ہجرت کرکے (دارالاسلام میں) آنہیں گئے تو ان سے تمہارا ولایت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک کہ وہ ہجرت کرکے نہ آجائیں، ہاں اگر وہ دین کے معاملہ تم سے مدد مانگیں تو ان کی مدد کرنا تم پر فرض ہے؛ لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جس سے تمہارا معاہدہ ہو۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے غیر مسلم اکثریت کے ساتھ زندگی گزارنے والے مسلمانوں کی مدد کے بارے میں فرمایا ہے کہ بشرطیکہ تمہارے درمیان اور ان کے درمیان پہلے سے کوئی معاہدہ موجود نہ ہو، خود رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بھی اس کی مثالیں ملتی ہیں، رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے کہ ''مسلمانوں کی شان یہ ہے کہ وہ دوسرے مسلمان پر ظلم بھی نہ کریں اور اسے ظلم ہوتا ہوا چھوڑے بھی نہیں'' — لیکن صلح حدیبیہ کے موقع سے جب حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ پابہ زنجیر خون میں لہولہان ہوکر آئے اور مسلمانوں سے التجاء کی کہ وہ انھیں اپنے ساتھ مدینہ لے چلیں اور حضور ﷺ کی خواہش بلکہ اپیل کے باوجود اہل مکہ اس کے لئے تیار نہیں ہوئے تو آپ نے انھیں ساتھ لینے پر اصرار نہیں فرمایا اور تلقین کی کہ صبر کرو، اللہ تمہارے لئے کوئی راستہ نکالیں گے، غرض کہ حضرت ابوجندل رضی اللہ عنہ کی گزارش اور اس آزمائش کے مقابلہ آپ نے طے شدہ معاہدہ پر عمل کرنے کو ترجیح دی۔

اسی طرح غزوۂ بدر میں مسلمانوں کے پاس فوجیوں کی تعداد کم تھی اور ایک ایک فوجی کی اہمیت تھی، اسی درمیان حضرت حذیفہ بن یمان اور ان کے والد اہل مکہ کی فوج کی جانب سے آئے، اہل مکہ نے انھیں گرفتار کرلیا اور اس شرط پر چھوڑا کہ وہ جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ شریک نہ ہوں، پھر یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور جہاد میں شرکت کے لئے اجازت کے خواستگار ہوئے؛ لیکن رسول اللہ ﷺ نے انھیں یہ کہہ کر شریک جہاد ہونے سے منع فرمایا کہ تم اپنا وعدہ پورا کرو، اللہ ہماری مدد کرے گا — اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ غیر مسلموں کے ساتھ طے پانے والے معاہدات کی کسی قدر اہمیت ہے!

غرض کہ جب ہم کسی ملک کی شہریت قبول کرتے ہیں تو یہ اس ملک کے قوانین کی پابندی کا عہد ہوتا ہے اور دستور کی وساطت سے ہم صرف حکومت ہی کے ساتھ نہیں؛ بلکہ ملک کے تمام شہریوں کے ساتھ بھی ایک معاہدہ میں بندھے ہوتے ہیں، اس لئے ہم پر ملکی قانون کا پاس ولحاظ رکھنا نہ صرف قانوناً واجب ہے؛ بلکہ شرعاً بھی واجب ہے، بشرطیکہ وہ صریح طور پر اسلامی شریعت سے متصادم نہ ہو۔

ظلم کی مخالفت

سیاسی اشتراک کی دوسری بنیاد ظلم کی مخالفت اور اس کے سدِّ باب میں باہمی تعاون ہے، قرآن مجید میں متعدد مقامات پر مُنکَر کو روکنے کا حکم دیا گیا ہے، ''مُنکَر'' میں تمام برائیاں شامل ہیں اور یقیناً ظلم بھی اس میں داخل ہے، رسول اللہ ﷺ نے منکر کو روکنے کے طریقہ کے سلسلہ میں یہ اُصول بتایا کہ اس کے لئے قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے طاقت کا استعمال کرسکتا ہو تو اس کا استعمال کرے، اگر طاقت کا استعمال نہیں کرسکتا تو زبان سے اس کے خلاف احتجاج کرے اور اگر زبان کے استعمال سے بھی عاجز ہے تو دل سے اس کو برا مانے اور عزم رکھے کہ جب بھی ممکن ہوگا، وہ ظلم کو دفع کرنے کی کوشش کرے گا۔

مَنْ رَأیٰ مِنْکُمْ مُنْکَرًا فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ ، فَإِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ ، فَإِنْ لَمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ ، وَ ذٰلِکَ أَضْعَفُ الْإِیْمَانِ . (مسلم، حدیث نمبر:۴۹)

تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے تو چاہیے کہ بزورِ بازو اسے بدلنے کی کوشش کرے، اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو زبان سے روکے اور اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے برا سمجھے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔

''ید'' ایک علامتی لفظ ہے اور ہاتھ سے مراد طاقت ہے، اس زمانہ میں ووٹ اور پُرامن احتجاج بھی ایک طاقت ہے، اسی طرح زبان سے منکر کو روکنے میں زبان کے ذریعہ ظلم کے خلاف احتجاج بھی شامل ہے؛ اسی لئے قرآن مجید نے بری بات کو زبان پر لانے اور علی الاعلان کہنے کو منع کیا ہے، لیکن ظلم کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کی اجازت دی ہے:

لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ . (النساء:۱۴۸)

اللہ تعالیٰ بری بات کے زور سے کہنے کو پسند نہیں کرتے، سوائے اس کے کہ وہ مظلوم ہو۔

حدیث میں احتجاج کے بعض اور طریقے بھی منقول ہیں۔(۱)

غرض کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان سیاسی اشتراک درست ہے؛ البتہ سیاسی اشتراک خود مسلمانوں کا باہمی طور پر ہو یا مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان ہو، اس کا مقصد صرف اقتدار میں ساجھے داری نہ ہو؛ بلکہ انصاف کو قائم کرنا اور ظلم کو روکنا بھی ہو۔

مذہبی تعلقات

سامعین کرام! مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تعلقات کے سلسلہ میں سب سے اہم موضوع مذہبی

---

(۱) مجمع الزوائد:۱۲۰/۸،باب ماجاء فی أذی الجار۔

تعلقات کا ہے،اس سلسلہ میں اسلامی تعلیمات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ مذہب کے معاملہ میں دو باتیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں،اپنے دین پر استقامت اور دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام،ان میں سے پہلے نکتہ یعنی دین پر استقامت کے سلسلہ میں گفتگو ہو چکی ہے۔

دوسرے مذاہب کا احترام اور عدم مداخلت

مذہبی تعلقات کی دوسری بنیاد دوسرے مذاہب کا احترام اور ان کے مذہبی امور میں عدمِ مداخلت ہے، قرآنی تعلیمات کا نچوڑ عقیدۂ توحید کی دعوت ہے،اسلام میں توحید سے زیادہ کوئی چیز مطلوب ومحمود نہیں اور شرک سے زیادہ کوئی چیز قابل ترک اور مذموم نہیں؛لیکن اس کے ساتھ ساتھ اس نے حد درجہ مذہبی رواداری کی تعلیم دی ہے، قرآن مجید نے صاف کہا ہے کہ ہر شخص کو عقیدہ کی آزادی حاصل ہے اور کسی مذہب کے قبول کرنے کے لئے جبر وتشدد جائز نہیں :

لاَ اِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ . (البقرۃ:۲۵۶)

دین میں کوئی جبر نہیں،ہدایت گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا گیا :

اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ . (یونس:۹۹)

کیا آپ لوگوں کو اس بات پر مجبور کر دیں گے کہ وہ ایمان لائیں؟

عقیدہ کے علاوہ غیر مسلموں کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی بھی مکمل آزادی حاصل ہے،قرآن مجید نے صاف طور پر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا:'' **لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَ لِيَ دِيْنٌ** '' (الکافرون:۶) ''تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین'' رسول اللہ ﷺ کی رَواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رُخ کر کے مسجدِ نبوی میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، (۱)فقہاء نے لکھا ہے کہ :

اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے،گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہے۔(۲)

اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے،یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔(۳)

---

(۱) احکام الذمة:۳۱۶/۱۔ (۲) احکام أهل الذمة:۳۱۶/۱۔ (۳) حوالۂ سابق۔

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے؛ حالاں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے؛ لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

وَلَا تَسُبُّوْا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ . (الانعام:۱۰۸)

وہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

عبادت گاہوں کا احترام

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملہ میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج:۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں خواہ کسی مذہب کی ہوں، ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے بنونجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی امور میں کوئی مداخلت کی جائے گی، (۱) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابویوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔ (۲)

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازئ تحریر کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور رَوادار بھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہ در تہ دبیز پردے ڈال دیے گئے ہیں، مذہبی معاملات کے سلسلہ میں یہ اُصول غیر مسلم اکثریت کے ساتھ بھی اسی طرح قابل عمل ہیں، جیسے غیر مسلم اقلیت کے ساتھ۔

حضرات! یہ تو مسلمانوں اور غیر مسلموں کے روابط کے بارے میں بعض تفصیلات تھیں؛ لیکن اس موقع سے میڈیا کے پروپیگنڈہ کی وجہ سے مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان روابط میں پیدا ہونے والی کرواہٹوں کی نسبت سے دو غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ضروری محسوس ہوتا ہے۔

---

(۱) أبوداود، حدیث نمبر:۳۰۴۱۔

(۲) موسوعة الخراج:۱۴۳۔

جہاد — حقیقت اور غلط فہمی

اول یہ کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات کے موضوع پر شکوک وشبہات کے کانٹے آج کل جس عنوان سے بوئے جاتے ہیں، وہ ہے جہاد، جہاد کی ایسی تصویر پیش کی جاتی ہے کہ گویا ہر مسلمان تلوار تھامے گھر سے نکلتا ہے اور جس غیر مسلم کو پاتا ہے اسے تہ تیغ کر دیتا ہے، اسی لئے آج کل دہشت گردی اور جہاد کو ہم معنی الفاظ سمجھ لیا گیا ہے؛ حالاں کہ جہاد ایک قانونی عمل ہے اور دہشت گردی غیر قانونی فعل۔

جہاد تمام غیر مسلموں سے نہیں ہے؛ بلکہ ان غیر مسلموں سے ہے جو مسلمانوں سے برسر پیکار ہوں؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللهِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَ لَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللهَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ . (البقرۃ:۱۹۱)

اللہ کے راستہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو، جو تم سے جنگ کر رہے ہیں اور حد سے تجاوز نہ کرو، بیشک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے۔

اس آیت میں ''حد سے تجاوز کرنے'' کو منع کیا گیا ہے، حد سے تجاوز کرنے کا کیا مطلب ہے؟ اوّل یہ کہ جو لوگ تم سے برسر پیکار نہ ہوں، تم بھی ان سے جنگ نہ کرو، دوسرے یہ کہ جب جنگ ہو تو انسانی تقاضوں اور جنگ کے مہذب قوانین کو ملحوظ رکھو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور معذوروں، نیز جنگ میں حصہ نہ لینے والوں اور مذہبی پیشواؤں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ کہ رسول اللہ ﷺ اور خلفاءِ راشدین نے جنگ میں ان لوگوں کو نشانہ بنانے سے منع فرمایا ہے۔(۱)

ایک اور موقع پر قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کرتے ہوئے، جن سے جہاد کا حکم ہے، کہا ہے :

اَلَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَ صَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللهِ . (سورۂ محمد:۱)

جن لوگوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستہ سے روکا۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ محض کفر کی وجہ سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا؛ بلکہ کفر کے ساتھ ساتھ ان کی ظلم وزیادتی اور جبر واستبداد کے سبب جہاد کا حکم فرمایا گیا، قرآن نے اس مضمون کو ایک سے زیادہ مواقع پر بہت ہی صراحت اور وضاحت کے ساتھ بیان کیا ہے کہ جو غیر مسلم حضرات مسلمانوں سے آمادۂ پیکار نہ ہوں اور صلح جو ہوں، مسلمانوں کو بھی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھانا چاہئے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

فَاِنِ اعْتَزَلُوْکُمْ فَلَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ وَاَلْقَوْا اِلَیْکُمُ السَّلَمَ فَمَا جَعَلَ اللهُ لَکُمْ عَلَیْهِمْ سَبِیْلاً . (النساء:۹۰)

---

(۱) سنن أبي داود، حدیث نمبر ۲۶۱۴۔

اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں، پس تم سے جنگ نہ کریں اور تمہاری طرف صلح کی پیش کش کریں تو اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے ان کے خلاف دست درازی کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے۔

وَإِن جَنَحُواْ لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا ۔ (الأنفال:۶۱)

اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی اس کے لئے آمادہ ہو جاؤ۔

ان آیات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ جنگ، جنگجوؤں اور شدت پسندوں سے ہے، نہ کہ صلح جوؤں اور امن پسندوں سے؛ بلکہ اگر کسی غیر مسلم گروہ سے امن کا معاہدہ ہو اور وہ کسی مسلمان گروہ کے درپئے آزار ہوں، تو سیاسی طور پر اور پرامن طریقوں سے تو مسلمانوں کی مدد کی جائے گی اور سیاسی و اخلاقی دباؤ ڈالا جائے گا؛ لیکن ان کے خلاف قتال کرنا اور عہد کو توڑ دینا پھر بھی درست نہیں ہوگا، اس سلسلہ میں قرآن مجید کی یہ صراحت گذر چکی ہے :

وَإِنِ اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلاَّ عَلَى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيْثَاقٌ وَاللّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۔ (الانفال:۷۲)

اور اگر وہ (مسلمان) تم سے دین کے معاملہ میں مدد کے طلب گار ہوں تو تم پر ان کی مدد کرنا واجب ہے؛ لیکن ایسی قوم کے خلاف نہیں کہ تمہارے اور ان کے درمیان معاہدہ ہو اور تم جو کچھ کرتے ہو، اللہ اسے دیکھ رہے ہیں۔

قرآن مجید کے ان ارشادات کو سامنے رکھ کر یہ اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جہاد کا حکم کن لوگوں سے ہے؟ صرف ان لوگوں سے، جو مسلمانوں سے جنگ کرنے پر تلے ہوئے ہوں، جن لوگوں سے مسلمانوں کا معاہدۂ امن ہو یا جو لوگ غیر جانبدار ہوں، نہ ان سے جنگ ہو اور نہ ان سے کوئی معاہدہ ہو، ایسے لوگوں سے جہاد کا حکم نہیں دیا گیا، اور یہ بات ظاہر ہے کہ یہ انصاف کے عمومی اُصول اور تقاضے کے عین مطابق ہے کہ ظالموں کا پنجہ تھاما جائے اور انھیں ظلم سے باز رکھا جائے، جو لوگ مسلمانوں سے جنگ نہ کرتے ہوں اور انھیں مشرکین مکہ کی طرح وطن سے بے وطن ہونے پر مجبور نہ کر رہے ہوں، ان کے ساتھ جنگ کی بجائے حسن سلوک اور صلح وآشتی کا حکم دیا گیا ہے؛ چنانچہ ارشاد ہے :

لاَ يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ لَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ فِيْ الدِّيْنِ وَ لَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْهُمْ وَ تُقْسِطُوْا اِلَيْهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۔ (الممتحنۃ:۸)

جو لوگ تم سے دین کے معاملہ میں جنگ نہیں کرتے ہیں اور تم کو تمہارے گھروں سے نہیں نکال رہے ہیں، اللہ تعالیٰ تم کو ان کے ساتھ بہتر سلوک کرنے اور انصاف کرنے سے نہیں روکتے، بیشک اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند فرماتے ہیں۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی مدنی زندگی میں مسلمانوں اور غیرمسلموں کے درمیان تصادم کے کل بیاسی (۸۲) واقعات پیش آئے ہیں اور زیادہ تر جنگیں مدینہ کے قریب ہوئی ہیں، جو اس بات کی علامت ہے کہ اس میں مسلمان حملہ آور نہیں تھے، ان بیاسی واقعات میں کل ۱۰۱۸/افراد دونوں طرف سے کام آئے اور اوسطاً ایک جنگ میں گیارہ جانیں گئیں، یہی وہ تعداد ہے، جس کی وجہ سے اسلام کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی جاتی ہے کہ اسے تلوار کے زور سے پھیلایا گیا ہے، جب کہ مہابھارت کی ''مقدس جنگ'' میں لاکھوں افراد خود ہندو مذہبی مآخذ کے مطابق مارے گئے اور عیسائی مذہبی عدالت کے حکم پر ایک کروڑ بیس لاکھ افراد کو سزائے موت دی گئی اور ان میں ایک بہت بڑی تعداد وہ تھی، جن کو زندہ جلا دیا گیا؛ لیکن افسوس کہ مغربی اقوام — جن کی پوری تاریخ غارت گری، خوں آشامی اور استعماریت کی داستانوں سے بھری ہوئی ہے، — نے ''چور مچائے شور'' کے مصداق بڑی ہوشیاری کے ساتھ مسلمانوں کی تاریخ پر لکھ دیا :

بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے

غیرمسلموں سے دوستی

دوسری غلط فہمی جو اس وقت عالمی سطح پر پائی جاتی ہے، یہ ہے کہ اسلام نے غیرمسلموں کو دوست بنانے سے منع کیا ہے؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ :

يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا الْكَافِرِيْنَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ، أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطَاناً مُّبِيْنًا . (النساء:۱۴۴)

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو، مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق نہ بناؤ، کیا تم چاہتے ہو کہ اللہ کو اپنے خلاف صریح حجت دے دو؟

اس سلسلہ میں غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کیا اس سے وہ مشرکین مراد ہیں جو رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں مسلمانوں سے آمادۂ پیکار تھے یا قیامت تک آنے والے تمام غیرمسلم اس میں شامل ہیں؟ قرآن کی تعبیر اور آیت کے سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ اس سے عہد نبوی کے وہ غیرمسلم مراد ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ نہایت ظالمانہ رویہ روا رکھے ہوئے تھے؛ اس لئے کہ ایک تو قرآن نے اکثر ''کافرین'' کے لفظ سے ''مشرکین مکہ'' کو مراد لیا ہے، دوسرے: خود قرآن مجید میں دوسرے مقام پر اس بات کی صراحت آگئی ہے کہ ان لوگوں کی دوستی منع ہے، جنھوں نے مسلمانوں سے جنگ کی، ان کو ان کے وطن سے نکالا اور ان کے بے وطن کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی؛ چنانچہ ارشاد ہے :

اِنَّمَا يَنْهَاكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ قَاتَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَأَخْرَجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ

وَظَاهَرُوْا عَلٰى إِخْرَاجِكُمْ أَنْ تَوَلَّوْهُمْ ، وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ فَأُوْلٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ .(الممتحنة:۸-۹)

وہ تمہیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملہ میں جنگ کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے اور تمہارے اخراج میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے، ان سے جو لوگ دوستی کریں وہی ظالم ہیں۔

اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ آیت میں عہد نبوی کے ان مشرکین کی دوستی سے منع کیا گیا ہے جو مسلمانوں کے ساتھ انتہائی درجہ معاندانہ رویہ اختیار کئے ہوئے تھے اور آج بھی جو لوگ اس طرح کا رویہ اختیار کریں ان کے لئے یقیناً یہی حکم ہوگا، عام غیر مسلموں کے لئے یہ حکم نہیں ہے، خود اس آیت میں غور کیجئے کہ اس میں ''مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ '' کے الفاظ موجود ہیں، یعنی غیر مسلموں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں اور ان کو چھوڑ کر دوست نہ بنالو۔

پھر یہ بات بھی قابل توجہ ہے کہ اولیاء بنانے سے کیا مراد ہے؟ عام دوست کو ولی نہیں کہتے ہیں، ولی ایسے قریب ترین شخص کو کہا جاتا ہے جس سے بے حد قربت ہو، یہاں تک کہ کوئی راز اس سے راز نہ رہے، اس لئے والد، دادا اور سرپرست کو ''ولی'' کہتے ہیں، پس آیت کا منشا یہ ہے کہ مسلمانوں کا راز ان غیر مسلموں کے پاس نہ چلا جائے جو تم سے برسر پیکار ہیں اور یہ بات ظاہر ہے کہ ہر ملک اپنے راز کی باتوں کو چھپانا چاہتا ہے؛ تاکہ دشمن اس سے فائدہ نہ اُٹھا سکے، عام دوستانہ تعلقات اس میں مراد نہیں ہیں۔

اس پر ایک اور طرح سے غور کیا جاسکتا ہے کہ شریعت اسلامی میں مسلمانوں کو یہودی اور عیسائی عورت سے نکاح کی اجازت دی گئی ہے، اس لئے مسلم سماج میں غیر مسلم ماں اور غیر مسلم بیوی کا وجود ہوسکتا ہے اور یہ بات معلوم ہے کہ تمام رشتوں میں سب سے زیادہ محبت کا رشتہ ماں اور بیوی کا ہوتا ہے، تو اگر غیر مسلموں سے محبت اور دوستی کی مطلقاً ممانعت ہوتی تو ان سے اس طرح کا رشتہ کیسے جائز ہوتا؟ غرض کہ غیر مسلموں کو دوست بنانے کی ممانعت کا تعلق ان غیر مسلموں سے ہے، جو صرف مذہبی اعتبار سے مسلمانوں سے اختلاف ہی نہ رکھیں؛ بلکہ ان کا سلوک بھی معاندانہ ہو، نیز دوستی سے مراد ایسی دوستی ہے جو مسلم مملکت کے محفوظ راز کے افشاء ہوجانے کا سبب بن سکتی ہو، یا بعض مفسرین کے اقوال کے مطابق دوسرے اہل مذاہب سے مذہبی اثرات اور طور وطریق کو قبول کرنے کا ذریعہ بن سکتا ہو، عام دوستی، محبت اور تعلق جو سماج کے ایک شخص کی دوسرے شخص سے ہوتی ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

حضرات! اخیر میں یہ بات عرض کرنی ہے کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان —— خواہ مسلمان

اکثریت میں ہوں یا اقلیت میں — تمام روابط اور تعلقات کی اساس یہ ہے کہ مسلمان داعی ہیں اور غیر مسلم مدعو، مسلمان خیرِ اُمت ہیں اور غیر مسلم ان کی تبلیغی کوششوں کا میدان، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ . (آلِ عمران:۱۱۰)

اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت واصلاح کے لئے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو۔

یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ بقول حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ: ''جیسے رسول اللہ ﷺ اس اُمت کی طرف مبعوث ہیں، اسی طرح یہ اُمت پوری انسانیت کی طرف مبعوث ہے'' جو ان کو بھلائی کی دعوت دینے اور برائی سے روکنے پر مامور ہے اور سب سے بڑی بھلائی ایمان اور سب سے بڑی برائی کفر ہے؛ لہٰذا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں ایمان کی دعوت اور کفر سے ان کو بچانے کی کوشش یقیناً داخل ہے، اس لئے جو اوصاف بحیثیت داعی رسول اللہ ﷺ کے ذکر کئے گئے ہیں اور جو سلوک آپ نے اپنے زمانہ کی غیر مسلم اکثریت کے ساتھ اختیار کیا تھا، وہی اس اُمت سے بھی مطلوب ہے، قرآن مجید نے رسول اللہ ﷺ کے سلوک کو اس طرح بیان کیا ہے :

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللهِ لِنتَ لَهُمْ ، وَلَوْ كُنتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لاَ انفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ . (آلِ عمران:۱۵۹)

(اے پیغمبر!) یہ اللہ کی بڑی رحمت ہے کہ تم ان لوگوں کے ئے بہت نرم مزاج واقع ہوئے ہو، ورنہ اگر کہیں تم تندخو اور سنگ دل ہوتے تو یہ سب تمہارے گردوپیش چھٹ جاتے۔

یعنی آپ اپنے مخاطب کے لئے نرم گفتاری اور نرم خوئی اختیار فرمایا کرتے تھے، یہی چیز ہے، جو آپ کے جانی دشمنوں کو بھی آپ کے جانثاروں میں داخل کر دیتی تھی، قرآن مجید نے خاص طور پر مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ لوگوں سے بہتر طور پر گفتگو کرو: ''قُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنا'' . (البقرہ:۸۳)

نیز رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے :

خالق الناس بخلق حسن .(۱)

لوگوں کے ساتھ بہتر اخلاق سے پیش آوَ۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو جب فرعون کو دعوت دینے پر مامور کیا گیا تو بطور خاص تاکید کی گئی :

---

(۱) صحيح البخاري ، كتاب الإيمان ، باب حلاوة الإيمان۔

فَقُوْلاَ لَهُ قَوْلاً لَّيِّناً . (طٰہٰ:۴۴)

فرعون سے نرم گفتگو کرنا۔

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے ماں باپ اپنی اولاد سے یکطرفہ لطف ومحبت اورحسن سلوک کرتے ہیں، اسی طرح داعی گروہ کے لئے ضروری ہے کہ مدعو کے ساتھ اس کا رویہ انتہائی درجہ محبت اور حسن سلوک پر مبنی ہو اور وہ اپنی طرف سے تعلقات کو خوشگوار اور معتدل رکھنے کی پوری کوشش کرے، یہاں تک کہ مدعو کی زیادتی بھی ان کو عدل اور اعتدال کے راستہ سے ہٹنے نہیں دے :

لاَ يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَانُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوْا . (المائدة:۸)

کسی گروہ کی دشمنی تم کو اتنا مشتعل نہ کردے کہ انصاف سے پھر جاؤ اور عدل کرو۔

یہ بات لمحۂ فکر یہ ہے کہ ہندوستان میں ۱۹۴۷ء کے بعد سے مسلمان مسلسل ابتلاء وآزمائش سے گذر رہے ہیں اور بہ ظاہر ظلم وجور کی داستان دراز سے دراز تر ہوتی جارہی ہے، اس کے باوجود مسلمان اللہ کی نصرت سے محروم ہیں اور ان کی بددُعائیں بھی اثر سے خالی ہیں، شاید یہ قرآن مجید کے اس ارشاد کے مطابق ہے کہ جو لوگ دین حق سے بے خبر ہوں اور جن تک خدا کا پیغام پہنچایا نہیں گیا ہو، ان پر اللہ کا عذاب نہیں آتا؛ کیوں کہ یہ ظلم ہے :

ذٰلِكَ أَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَأَهْلَهَا غَافِلُوْنَ . (الانعام:۱۳۱)

یہ شہادت ان سے اس لئے لی جائے گی کہ یہ ثابت ہوجائے کہ تمہارا رب بستیوں کو ظلم کے ساتھ تباہ کرنے والا نہ تھا جب کہ ان کے باشندے حقیقت سے ناواقف ہوں۔

اسی طرح ایک اور موقع پر فرمایا گیا :

وَمَا كَانَ رَبُّكَ مُهْلِكَ الْقُرٰى حَتّٰى يَبْعَثَ فِيْ أُمِّهَا رَسُوْلاً يَّتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيَاتِنَا ، وَمَا كُنَّا مُهْلِكِي الْقُرٰى اِلَّا وَأَهْلُهَا ظَالِمُوْنَ . (القصص:۵۹)

اور تیرا رب بستیوں کو ہلاک کرنے والا نہ تھا، جب تک کہ ان کے مرکز میں ایک رسول نہ بھیج دیتا جو ان کو ہماری آیات سناتا اور ہم بستیوں کو ہلاک کرنے والے نہ تھے، جب تک کہ ان کے رہنے والے ظالم نہ ہوجاتے۔

موجودہ حالات میں اور بالخصوص ہندوستان میں ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم برادرانِ وطن سے جہاں تک ممکن ہو اپنے تعلقات کو خوشگوار رکھنے کی کوشش کریں، اسوۂ نبوی کو سامنے رکھیں اور اس حقیقت کو یاد رکھیں کہ ہم ایک داعی اُمت ہیں اور برادران وطن ہمارے مدعو ہیں، خاص کر ہندوستان کے برادرانِ وطن کے بارے میں اس حقیقت کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہندو قوم خدا سے محبت رکھتی ہے؛ لیکن خدا کی معرفت سے محروم ہے، اس

کے دل میں مذہب کی عظمت ہے؛ لیکن وہ دین حق کی پہچان سے محروم ہے، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم ان کے ساتھ باہمی روابط میں اس پہلو کو ضرور ملحوظ رکھیں اور ان روابط کو دعوت دین کے لئے استعمال کریں، تبھی ایک باعزت اُمت کی حیثیت سے ہم سربلندی کی زندگی گزار سکیں گے۔

اخیر میں مجلس تعمیر ملت کے صدر عالی قدر محترم جناب عبدالرحیم قریشی صاحب، نائب صدر مولانا سلیمان سکندر صاحب اور اس پروگرام کے کنوینر محبی فی اللہ جناب ضیاء الدین نیر صاحب کا بے حد شکر گزار ہوں کہ انھوں نے اس اہم خطبہ کے لئے اس حقیر کو مدعو کیا اور آپ حضرت سے کچھ عرض کرنے کا موقع عنایت فرمایا، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کوشش کو قبول فرمائے اور ہم سب کو اس بات کی توفیق عطا فرمائے کہ ہمارا جینا اور مرنا اور نرم وگرم ہونا اللہ کے لئے ہو۔

إن صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين ، والسلام عليكم ورحمة الله وبركاته .

○ ○ ○

اسلام میں آزادی کا تصور اور فقہ اسلامی میں اس کی تطبیق ☆

خالد سیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام على سيد الانبياء والمرسلين وعلى آله وصحبه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين ، أما بعد .

صدر عالی قدر، بزرگان محترم، برادران عزیز ! اس وقت ایک ایسے موضوع پر غور وفکر کے لئے ہم جمع ہوئے ہیں جو ہر دور میں انسانی آبادی کا بڑا اہم مسئلہ رہا ہے اور اس کی گونج اس وقت خاص طور پر عالم اسلام اور عالم عرب میں سنی جارہی ہے، شخص حکمرانی کی بساطیں لپیٹی جارہی ہیں، جہاں زبان کھولنے کی بھی اجازت نہیں تھی، وہاں آزادی کے نعرۂ مستانہ نے فرزانوں کو دیوانہ بنادیا ہے، اس لیلائے مقصود کو حاصل کرنے کے لئے جو قربانیاں دی جارہی ہیں، وہ اپنی مثال آپ ہیں؛ لیکن مغرب کے اور اسلام کے تصور آزادی میں یقیناً فرق ہے، اسلام ایک ایسی آزادی کا قائل ہے جس میں نہ اکثریت کی غلامی، نہ نفس کی، نہ مختلف طبقات کے لوگوں کے لئے انصاف کے الگ الگ پیمانے ہوں، اور نہ وہ مذہب واختلاف سے آزاد ہو۔

اس لئے اسلامک فقہ اکیڈمی نے اس موضوع پر غور وفکر کا راستہ کھولنے کے لئے یہ اہم پروگرام منعقد کیا ہے اور مقامِ مسرت ہے کہ یہ پروگرام ایک ایسی درسگاہ میں منعقد ہورہا ہے، ہندوستان کی جنگ آزادی کے سورماؤں نے آزادی کی تحریک کو آگے بڑھانے اور شمع آزادی کی لَو کو تیز کرنے کے لئے جس کی بنیاد رکھی تھی، جس کی جڑوں میں شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی، مولانا محمد علی جوہر، ڈاکٹر ذاکر حسین، حکیم مختار احمد انصاری اور ان جیسے ملک کے نامور رہنماؤں اور بے غرض فداکاروں کی تخم اُمید پنہاں ہے۔

میں اس موقع پر جامعہ کی انتظامیہ بالخصوص پروفیسر اختر والواسع صاحب کا بے حد شکرگزار ہوں کہ انھوں نے اکیڈمی کے اس پروگرام کی میزبانی قبول فرمائی اور اس طرح ایک ایسی جگہ یہ سیمینار منعقد ہورہا ہے کہ شاید اس

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی نے جامعہ ملیہ کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے تعاون سے ۲۵-۲۷/ ذیقعدہ ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۲-۱۴/ اکتوبر ۲۰۱۲ء کو سیمینار کا اہتمام کیا تھا، یہ اس سیمینار کا کلیدی خطبہ ہے۔

پروگرام کے لئے اس سے زیادہ کوئی اور جگہ نہیں ہوسکتی تھی۔

حضرات ! اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں تین طرح کی مخلوقات پیدا کی ہیں، جمادات، نباتات اور حیوانات، جمادات سے مراد ایسی چیزیں ہیں جن میں نمو اور حرکت کی صلاحیت نہیں ہوتی جیسے پتھر، زمین، لوہا، نباتات سے مراد پودے ہیں جن میں بڑھوتری اور افزائش تو ہوتی ہے، لیکن وہ نقل وحرکت کی صلاحیت سے محروم اور بظاہر احساس وشعور سے عاری ہیں، حیوانات سے مراد جاندار مخلوق ہیں جن میں شعور واحساس ہے، کسی میں کم اور کسی میں زیادہ ادراک کی صلاحیت اور نقل وحرکت کی قوت ہے — جمادات اور نباتات دراصل اسی تیسری مخلوق کے لئے پیدا کئے گئے ہیں، پتھر جہاں نصب کر دئے جائیں، نصب رہتے ہیں، لوہے کو آپ جس سانچے میں چاہیں ڈھال لیں، لکڑی کو آپ جس مقصد کے لئے چاہیں استعمال کریں، درخت آپ جہاں چاہیں لگا دیں، انھیں کوئی انکار نہیں اور نہ ان کی طرف سے کوئی احتجاج سامنے آئے گا، گویا یہ جاندار مخلوقات کے لئے قدرت ہی کی طرف سے خادم اور اپنی اعلیٰ تر مخلوق کے غلام ہیں، اس غلامی پر انھیں کوئی اعتراض نہیں۔

لیکن جو جاندار مخلوقات ہیں، ان کا معاملہ ان سے مختلف ہے، شیر اور ہاتھی سے لے کر چیونٹی اور مکھی تک اگر آپ کسی کو بھی اپنی قید میں لانا چاہیں تو وہ ضرور احتجاج کریں گے، انکار کا رویہ اختیار کریں گے، اپنی طاقت وصلاحیت کے مطابق وار کرنے یا راہِ فرار اختیار کرنے سے نہیں چوکیں گے اور کسی طور آپ کی گرفت میں آنا پسند نہیں کریں گے، گویا فطری طور پر ان کو غلامی سے انکار ہے اور یہ آزادی کے طلبگار ہیں، جاندار مخلوقات میں سب سے عظیم ترین مخلوق انسان ہیں، ان کو اللہ تعالیٰ نے عقل وشعور اور فہم وادراک کی ایسی صلاحیت ودیعت کی ہے کہ کسی اور جاندار مخلوق کو شاید اس کا سوواں حصہ بھی حاصل نہ ہو، اس لئے انسان میں آزاد رہنے کا جذبہ زیادہ ہے اور اس کی فطرت غلامی سے ابا ء کرتی ہے، انسان کے نومولود شیر خوار بچہ کو بھی اس کے مزاج اور طبیعت کے خلاف کوئی بات پیش آجائے، تو اس کی طرف سے ضرور ہی احتجاج اور ردعمل کا اظہار ہوتا ہے، وہ روتا ہے اور بے تحاشہ آنسو بہا کر اپنی ناگواری کا اظہار کرتا ہے، یہ اسی صدائے آزادی کی بازگشت ہے، جو انسانی فطرت میں رکھی گئی ہے، جس کی وجہ سے انسان پتھر اور لکڑی کی طرح ہر عمل پر خاموش اور ردعمل سے عاری نہیں رہ سکتا اور مزاج ومذاق کے خلاف پیش آنے والی بات پر ناگواری کے اظہار کے لئے اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے اور یہ اس کے بے چین دل کے لئے کسی قدر سکون وطمانینت کا باعث بنتا ہے۔

اسلام دین فطرت ہے اور وہ سلیم فطرت کے تقاضوں کو پورا کرنے آیا ہے، نہ کہ اس کو دبانے اور اس کا گلا گھونٹنے، اسلام کا پورا نظامِ حیات اسی بنیادی تصور پر مبنی ہے، اس میں کہیں قانونِ فطرت سے تصادم اور ٹکراؤ نہیں، اس نے انسان کے آزاد رہنے کے اس فطری حق کو تسلیم کیا ہے، اس کی بہترین ترجمانی ان کلمات سے ہوتی ہے جو

عالم اسلام کے سفیر صحابیِ رسول ربعی بن عامر ﷛ نے رستمِ ایران کے دربار میں کہے تھے اوران پر اپنا مقصد ومنشاء واضح کیا تھا کہ ہم اس لئے آئے ہیں کہ اللہ کے بندوں کوانسان کی بندگی اور غلامی سے نکال کراللہ کی غلامی میں داخل کریں:''اللہ ابتعثنا لنخرج من شاء من عبادۃ العباد الی عبادۃ اللہ ''(۱)—انسان کے اسی فطری حق کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عمر ﷛ نے اپنے ایک گورنر کوفرمایا کہ ان کوان کی ماؤں نے تو آزاد جنا تھا،تم نے ان کوکب سے غلام بنالیا ہے؟ یہ آزادی کے اسی فطری حق کا اعلان واظہار ہے جواسلام کی بنیادی تعلیمات کا ایک حصہ ہے،اس لئے آزادی ایک انسانی اوراسلامی حق ہے۔

سامعین کرام ! آزادی کے تصور کو طاقت پہنچانے کی غرض سے اسلام نے سب سے پہلے انسانی مساوات کا تصور دیا کہ تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں،محض رنگ ونسل، خاندان ونسب اورعلاقہ ووطن کی بنیاد پران میں ایک دوسرے سے بڑا نہیں،بہتری اور کہتری انسان کے عمل اور کردار سے متعلق ہے:''إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ ''(الحجرات:۱۳)— یہ وہ بنیادی تصور ہے جس کے بعد ایک انسان کا پیدائشی طور پر حکمراں اور دوسروں کا محکوم ہونا غلط قرار پاتا ہے،اسلام سے پہلے قریب قریب پوری دنیا میں بادشاہتیں قائم تھیں،روم،ایران،حبش،یمن، ہندوستان،غرض اس وقت کی معلوم دنیا میں ہر جگہ شاہانہ طرزِ حکومت مروج تھا اور مخصوص خاندانوں کوحکومت کا اہل سمجھا جاتا تھا،اس کا سب سے تکلیف دہ پہلو یہ تھا کہ اس آمرانہ طرزِ حکومت کو مذہبی رنگ دے دیا گیا تھا،ایران میں لوگ شاہی خاندان کو خدا کا کنبہ تصور کرتے تھے،مغرب میں رفتہ رفتہ کلیسا نے انسان کواپنا مکمل غلام بنالیا تھا، وہ نہ صرف اپنے آپ کولوگوں کی آخرت کاٹھیکیدار تصور کرتے تھے؛ بلکہ دنیا میں بھی اپنے فیصلہ کوخدائی فیصلہ باور کرتے تھے،اور یہی عقیدہ لوگوں کے ذہن میں راسخ کردیا گیا تھا،ایک طرف وہ مغفرت نامے تقسیم کرتے اورلوگوں کے لئے جنت کی رجسٹری کرتے اور دوسری طرف مملکت کے نظام کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھ کرنہایت جابرانہ طرزِ عمل اختیار کرتے اور جوان کی رائے سے سرموانحراف کرتا ان کولرزا دینے والے عقوبت خانوں میں تختۂ مشق بنایا جاتا اورزندہ جلا دینے کی سزادی جاتی، بالآخر ۱۷۸۹ء کے انقلاب فرانس پر یہ ظالمانہ کلیسائی نظام یورپ سے ختم ہوا،گویا ایک آمریت تھی جو مذہب اور خدا کے نام پر روا رکھی گئی تھی،اس لئے یورپ میں جوانقلابی تحریکیں اُٹھیں ان کاخمیر مذہب کی مخالفت اورعناد سے تیار ہوا۔

اسلام نے اس طرح کی خاندانی بادشاہت کوسند جواز عطا نہیں کیا اور ایک ایسی آزاد طرزِ حکومت کا تصور پیش کیا،جس میں رنگ ونسل کے بجائے صلاحیت اور کردار کی بنیاد پرفرمانرواں کا انتخاب عمل میں آئے اور پھر یہ بھی بتادیا کہ حکمراں کوئی مافوق العادت حیثیت کا حامل نہیں ہوتا؛ بلکہ وہ بھی عام لوگوں ہی میں کا ایک شخص ہوتا ہے،اس

(۱) البدایۃ والنہایۃ:۳۹/۷۔

کے فیصلے غلط بھی ہو سکتے ہیں، اس کی ذات تنقید سے بالاتر نہیں ہوتی اور عوام کو ان کے احتساب کا پورا حق حاصل ہوتا ہے، یہ بات کہ حق حکمرانی قدرتی اور غیر اختیاری اتفاقی سبب سے متعلق نہیں کہ کوئی شخص کسی خاندان میں پیدا ہو جائے تو وہ حکمرانی کا حقدار ہے؛ بلکہ یہ حق انسان کے کردار اور اکتساب سے متعلق ہے، یہ ایک انقلابی فکر ہے جس سے آزادی کا تصور اُبھرتا ہے اور غلامی کی نفی ہوتی ہے۔

یہ مذہبی خوش عقیدگی اور مبالغہ آرائی نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے کہ گذشتہ چند صدیوں میں انسان کے حق آزادی اور مساوات و برابری کا جو تصور ابھرا ہے، وہ دراصل اسلامی تعلیمات ہی کا اثر ہے، اسلام جس وقت دنیا میں آیا اس وقت بادشاہت اور ملوکیت کا تصور ذہنوں پر چھایا ہوا تھا، اس وقت دنیا میں جتنی قابل ذکر حکومتیں تھیں وہ سب خاندانی بادشاہت کے نظام پر مبنی تھیں، ایران و روم کی حکومتیں اسی تصور پر قائم تھیں، ہندوستان اور چین میں بھی ایسی ہی چھوٹی بڑی ریاستیں تھیں، لوگ اس کے اس قدر خوگر ہو چکے تھے کہ جمہوریت اور آزادی کے تصور سے بھی وہ محروم تھے۔

یورپ افلاطون اور اس کے شاگرد ارسطو کو جمہوری طرز فکر کا بانی تصور کرتا ہے اور افلاطون کی کتاب ''جمہوریت'' (Republic) کو اس موضوع پر پہلی کتاب خیال کیا جاتا ہے؛ لیکن افلاطون کے جمہوری تصور کا حال یہ ہے کہ اس کے نزدیک صرف فلاسفہ کو حکمرانی کا حق حاصل ہے اور وہ سماج کے بقیہ افراد کو فوجیوں، کاشتکاروں اور غلاموں میں تقسیم کرتا ہے، اس کے نزدیک ان سب کی تخلیق کا خمیر بھی الگ الگ ہے، فلاسفہ کو خدا نے سونے سے بنایا ہے، ان کے معاونین کو چاندی سے، پھر کاشتکار اور دستکار وغیرہ کو لوہے اور پیتل سے، یہ ہے جمہوریت اور انصاف کا وہ تصور جو افلاطون نے پیش کیا ہے۔

افلاطون کے بعد مشہور فلسفی اور افلاطون کے شاگرد ''ارسطو'' کو نظام جمہوری کا مفکر تصور کیا جاتا ہے، ارسطو کے یہاں سماج کی طبقاتی تقسیم اتنی نمایاں ہے کہ ایک دانشور سے ایسے غیر منصفانہ خیالات کا صدور حیرت انگیز معلوم ہوتا ہے، ارسطو کا خیال ہے کہ ''غریب امیروں کے پیدائشی غلام ہیں، وہ بھی، ان کی بیویاں بھی اور ان کے بچے بھی'' ارسطو کو مساوات اور حکومت میں غریبوں کی شرکت نہایت ناگوار خاطر ہے، جب فلاسفہ روزگار اور دانشورانِ عصر کے فکر و نظر کا یہ حال ہو تو عام لوگوں کی سوچ کا اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

یہ اسلام ہے جس نے انسانی وحدت اور تکریم آدمیت کا انقلابی پیغام دیا اور اس کو برت کر دکھایا اور آج پوری دنیا میں آزادی کے تصور نے جو تقویت پائی ہے وہ یقیناً اسی انقلابی فکر کی بازگشت ہے، انسانی وحدت کا تصور مسلم سماج میں ایک عقیدہ کی طرح رچ بس گیا تھا اور ایک معمولی سے معمولی انسان فرماں روائے وقت کے خلاف اپنی زبان کھولنے اور اپنا مقدمہ پیش کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہیں کرتا تھا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ ہم لوگ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس تھے کہ مصر کے ایک قبطی نے فریاد کی، آپ رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا تو اس نے کہا: عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ نے مصر میں گھوڑ دوڑ کرائی، جس میں میرا گھوڑا آگے نکل گیا اورلوگوں نے اسے دیکھا بھی، مگر محمد بن عمرو بن العاص کہنے لگے کہ بخدا! یہ میرا گھوڑا ہے، وہ جب قریب آئے تو میں نے انھیں پہچان کر کہا کہ نہیں بخدا وہ میرا گھوڑا ہے، اس پر مجھے کوڑوں سے مارنے لگے، انھوں نے کہا کہ جانتے نہیں کہ میں ''ابن الاکرمین'' (شریف زادہ) ہوں۔

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس سے کہا: اچھا، بیٹھو! پھر عمر بن العاص رضی اللہ عنہ کو لکھا کہ میرا خط دیکھتے ہی تم اورتمہارے بیٹے محمد حاضر ہو جائیں، راوی کہتا ہے کہ عمر بن العاص رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے کو بلا کر پوچھا کہ کیا تم نے کوئی جرم کیا ہے؟ اس کے بعد وہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہو گئے، حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم حضرت عمر رضی اللہ عنہ ہی کے پاس تھے کہ عمروابن العاص رضی اللہ عنہ کو ایک لنگی اور چادر میں آتے دیکھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ دیکھنے لگے کہ انکا بیٹا بھی ساتھ ہے یا نہیں، جوان کے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مصری کو بلایا اور حکم دیا کہ درّہ لے کر ابن الاکرمین (شریف زادہ) کی خبر لو، راوی کہتا ہے کہ اس نے اسے اچھی طرح مارا، پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ عمرو کے سر پر بھی گھماؤ، کیوں کہ انھیں کے سہارے پر اس نے تمہیں مارا تھا، مصری کہنے لگا کہ میں مارنے والے کو مار چکا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اگر تم انھیں مارتے تو میں بیچ میں نہ پڑتا، جب تک کہ تم ہی نہ انھیں چھوڑ دیتے، پھر فرمایا عمرو! تم نے لوگوں کو کب سے غلام بنایا، حالاں کہ ان کی ماؤں نے تو انھیں آزاد جنا تھا؟ پھر مصری کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اطمینان سے جاؤ، اگر کوئی بات پیش آئے تو مجھے لکھنا۔(۱)

دنیا نے بہت بعد کو آزادی کی لذت چکھی ہے، روسو تو ۱۷۵۰ء میں بھی شکوہ سنج تھا کہ ''انسان آزاد پیدا ہوا تھا؛ لیکن وہ ہر جگہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے'' یہ عجیب بات ہے کہ مغربی اقوام جو آج حقوقِ انسانی، حق آزادی اور جمہوریت کا سہرا اپنے سر باندھے ہوئی ہیں، نصف صدی پہلے تک انھوں نے ہی نصف دنیا سے زیادہ حصہ کو اپنا غلام بنایا تھا اور اب بھی دنیا کے بعض خطوں کو وہ اپنی نوآبادی بنائے ہوئے ہیں، ۳۰ رنومبر ۱۹۷۳ء کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی نے نسل پرستی کو قانونی جرم قرار دینے کے سلسلے میں ایک قرارداد منظور کی، تو چار ملکوں نے اس کی مخالفت کی اور حیرت کے کانوں سے سنئے کہ ان چار ملکوں میں جنوبی افریقہ اور پرتگال کے ساتھ امریکہ اور برطانیہ بھی تھے، یہ ہیں آزادی اور انسانی حقوق کے عالمی ٹھیکیدار!!

محترم حضرات ! پھر اسلام نے تفصیل کے ساتھ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے متعلق انسان کے بنیادی حقوق کو متعین کیا، قرآن نے کہا: کہ ہر شخص کو جینے کا حق ہے اور کسی بھی نفس انسانی کو زندہ قتل کر دیا جائے تو اس کے

(۱) سیرت عمر لابن جوزی: ۹۷-۸۶۔

وارث کو قاتل سے بدلہ لینے کا پورا پورا حق حاصل ہے (الاسراء:۳۳) گویا انسان اپنی زندگی کے لئے کسی کے رحم وکرم کا محتاج نہیں، ہر شخص کو اپنے مال پر ملکیت کا حق ہے، دوسروں کو حق نہیں کہ وہ ناروا طریقہ پر اس کی رضامندی کے بغیر اس کے مال پر قابض ہو جائے، (النساء:۲۹) — پھر کسبِ معاش کے لئے ہر شخص آزاد ہے، کہ وہ جس پیشہ کو چاہے اختیار کرے، اس کو اس بات پر مجبور نہیں کیا جا سکتا کہ اگر اس کے خاندان میں پہلے سے کوئی ایسا پیشہ آ رہا ہو جسے لوگ کمتر سمجھتے ہوں، تو وہ وہی پیشہ اختیار کرے، ہاں! اگر کوئی شخص کسی کام کا اہل نہیں، جیسے اس نے میڈیکل تعلیم حاصل نہ کی ہو اور لوگوں کا علاج کرنے لگے تو عام لوگوں کے مفاد کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسے اس سے روکا جا سکتا ہے، خود حدیث نبوی میں اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔

عزت وآبرو کا تحفظ ایک بنیادی حق ہے اور کسی قوم کے لئے گنجائش نہیں کہ وہ دوسری قوم کے ساتھ ذلت آمیز سلوک کرے: ''لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ'' (الحجرات:۱۱) عدل وانصاف ہر شخص کا حق ہے، اسلام نے اس کا شفاف اور مساوات پر مبنی نظام دیا ہے اور انصاف کے معیارات بھی یکساں رکھے ہیں، اس میں حکمران ومحکوم اور سماج کے باوجاہت اور معمولی لوگوں کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھا گیا، یہاں تک کہ اگر مسلمانوں کی کسی قوم سے عداوت ہو تب بھی حکم دیا گیا کہ پیمانۂ انصاف میں کوئی فرق نہ ہونے پائے: ''وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَى أَلَّا تَعْدِلُوا'' (المائدہ:۸) ہر شخص کو رائے اور ضمیر کی آزادی عطاء کی گئی اور وہ جس چیز کو غلط سمجھے اس کے اظہار کی اجازت دی گئی، جسے قرآن کی زبان میں نہی عن المنکر کہا جاتا ہے (آل عمران:۱۰) ملک کے ہر شہری کو احتجاج اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق دیا گیا ہے: ''**لا یحب الله الجهر بالسوء من القول الا من ظلم**''۔ (النساء:۴۱)

اسلام ملک کے تمام شہریوں کو مذہبی آزادی عطا کرتا ہے، کہ وہ اپنے ضمیر واعتقاد کے مطابق خود زندگی گذاریں: ''لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ''۔ (البقرۃ:۲۵۶)

قرآن مجید نے صاف طور پر حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے مشرکین مکہ کو کہلایا: ''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنٌ'' (الکافرون:۶) ''تمہارے لئے تمہارا دین ہے اور میرے لئے میرا دین'' ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ''لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ'' (الشوریٰ:۱۵) ''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال'' رسول اللہ ﷺ کی رواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رخ کر کے مسجدِ نبوی ﷺ میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی، فقہاء نے لکھا ہے کہ :

> اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی یا عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں

سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہے۔(۱)

اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے، یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے اور شوہر اس کو روک نہیں سکتا۔(۲)

یہ بھی ضروری ہے کہ دوسرے مذہبی گروہوں کے مذہبی جذبات کو مجروح نہ کیا جائے اور دوسری قومیں جن دیوتاؤں اور دیویوں کی پرستش کرتی ہوں، ان کو برا بھلا نہ کہا جائے؛ حالاں کہ یہ بات ظاہر ہے کہ اسلام خدا کی ذات وصفات میں کسی کی شرکت کو جائز نہیں سمجھتا؛ کیوں کہ یہ سچائی اور واقعہ کے خلاف ہے؛ لیکن پھر بھی مذہبی رواداری کے تحت ان معبودانِ باطل کے بارے میں ناشائستہ باتیں کہنے سے منع کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

لَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللهِ . (الانعام:۱۰۸)

وہ اللہ کے سوا جن کی عبادت کرتے ہیں، تم ان کو برا بھلا نہ کہو۔

اسی طرح عبادت گاہوں کے معاملات میں بھی تمام اہل مذاہب کے جذبات کو ملحوظ رکھنے کی ترغیب دی گئی ہے، قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج:۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں —— خواہ کسی مذہب کی ہوں —— ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہیے، رسول اللہ ﷺ نے بنونجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی اُمور میں کوئی مداخلت کی جائے گی، (۳) عہدِ صدیقی میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابویوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔(۴)

اس سلسلہ میں خلافتِ راشدہ اور بعد کے مسلم عہد میں بہت سی مثالیں موجود ہیں، جن کا ذکر اس وقت درازیٔ تحریر کا باعث ہوگا؛ لیکن اس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام عقیدۂ توحید کی حفاظت اور اپنی شناخت کی بقاء کے سلسلہ میں جس قدر حساس ہے، غیر مسلموں کے مذہبی اور سماجی مسائل میں اسی قدر کشادہ قلب، سیر چشم اور رَوادار بھی ہے، افسوس کہ اس پر غلط فہمیوں کے تہ در تہ دبیز پردے ڈال دیے گئے ہیں۔

سزا کے نظام میں بھی مساوات وبرابری اور ہر بالغ ومکلّف کے لئے یکساں سزا رکھی گئی ہے، رسول اللہ ﷺ نے قریش کی ایک معزز خاتون کا ہاتھ چوری کے جرم میں کٹوایا اور اس سلسلہ میں اپنے قریب ترین لوگوں کی سفارش کو رد

---

(۱) احکام أہل الذمۃ: ۱/۳۱۶۔ (۲) حوالۂ سابق۔

(۳) أبوداود، حدیث نمبر: ۳۰۴۱۔ (۴) موسوعۃ الخراج: ۱۴۳۔

کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: کہ اگر فاطمہ بنت محمد ﷺ بھی اس کی مرتکب ہوتی تو اسے بھی یہی سزا دی گئی ہوتی، اسلام نے ایک ایسے نظامِ مملکت کا تصور دیا جو شورائیت پر مبنی ہو: ''وَأَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ''۔ (الشوریٰ:۳۸)

اسی طرح ہر شخص کو اظہار خیال کی آزادی ہے، قرآن مجید نے اس کو ''نہی عن المنکر '' سے تعبیر کیا ہے؛ لیکن آزادی اسی حد تک ہے کہ دوسرے کے جذبات اس سے مجروح نہ ہوں، آپ فضاء میں لاٹھی گھما سکتے ہیں؛ لیکن یہ احتیاط ضروری ہے کہ آپ کی لاٹھی کسی اور کے سر سے نہ ٹکرائے، کسی شخص کے لئے بہر حال اس کی گنجائش نہیں، کہ وہ شخص آزادی کے نام پر دوسروں کا سر پھوڑے اور راہ چلتے لوگوں کو زخمی کر دے، اس کا نام آزادی نہیں ؛ بلکہ بے راہ روی اور آوارگی ہے۔

غرض اسلام ایک ایسے سیاسی نظام کا نقیب وترجمان ہے جو غلامی کے بجائے آزادی پر مبنی ہو، جو انسانی تفریق کے بجائے مساوات پر قائم ہو، جس میں رنگ ونسل کے بجائے اخلاق وکردار کو تولا جاتا ہو، جس میں انصاف کا ایک ہی پیمانہ ہو، جس میں اصحاب اقتدار کے احتساب کی اسی قدر گنجائش ہو، جتنی ایک ادنیٰ رعایا کی، اور جو انسانی کرامت وشرافت کے بنیادی تصور پر استوار ہو۔

ہاں یہ ضرور ہے کہ آزادی کے لئے بھی کچھ حدود وقیود ضروری ہیں، سڑک پر ہر شخص کو چلنے کا حق ہے؛ لیکن اگر لوگ یہ سمجھیں کہ یہ آزادی ان کو ٹریفک کے قواعد سے بھی آزاد کرتی ہے تو یقیناً یہ آزادی پروانۂ ہلاکت بن جائے گی، اس لئے آزادی کے بھی دائرے ہیں اور یہ دائرہ اخلاقی اقدار کا ہے، آزادی ایسی نہ ہو کہ جس سے اخلاق کے بندھن ٹوٹ جائیں، جو شرم وحیاء کے الفاظ کو انسانی ڈکشنری سے مٹا کر رکھ دے، جو انسان کو ظلم واستبداد کے لئے آزاد کر دے، جو فطرتِ انسانی کی تسلیم شدہ حقیقتوں پر بھی خط نسخ پھیر دے، یہ آزادی رحمت نہیں ؛ بلکہ زحمت ہے اور سامان عافیت نہیں ؛ بلکہ ابتلاء ومصیبت ہے، افسوس کہ مغرب میں کلیسائی نظام کے خلاف جو بغاوت ہوئی، اس نے مذہب بے زاری کی ایسی برقی رو دوڑا دی کہ جس نے فکر ونظر کے تار وپود بکھیر کر رکھ دیئے اور لوگوں نے سمجھا کہ آزادی یہ ہے کہ انسان مادر وپدر سے آزاد ہو جائے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمہ اخلاقی قدروں کو بھی غلامی کی علامت سمجھ لیا گیا، مخرب اخلاق اسباب کو بھی آزادی کا پروانہ دیدیا گیا اور انسان کے لئے یہ بات مشکل ہوگئی کہ وہ اپنے پیکر آزادی پر اخلاق وشرافت کی قید وبند کا کوئی تارِ لباس باقی رہنے دے۔

اسلام ایسی بے قید آزادی کا قائل نہیں، اسی لئے اس نے انتظام وتدبیر انسان کے ہاتھ میں رکھا اور قانون کی لگام خدا کے ہاتھ میں دی: ''اِنِ الْحُكْمُ اِلاَّ لِلّٰهِ'' (یوسف:۴۰) کیوں کہ انسان کے خالق سے بڑھ کر انسان کی آزادی کی حدود اور اس کی بھلائی کے لئے مطلوب پابندیوں اور قیود کو کوئی اور ذات نہیں سمجھ سکتی، یہ آزادی کا ایک متوازن، معتدل تصور ہے، جس میں نہ صرف آخرت کی فلاح ہے؛ بلکہ دنیا کی بھی بھلائی ہے، کہ خدا کی غلامی ہی

اصل میں انسان کی آزادی ہے، جو شخص خدا کا غلام بننے کو تیار نہ ہو تو اسے ضرور مخلوق کا غلام بننا پڑے گا، اگر وہ دوسروں کا غلام نہ بنے، تو کم سے کم خود اپنے نفس کی غلامی اسے قبول کرنی ہوگی، اسی کو مردِ حق آگاہ شاعر اسلام علامہ اقبالؒ نے کہا ہے کہ :

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

حضرات ! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا بنیادی طور پر جدید شرعی مسائل کے لئے پروگرام منعقد کرتی ہے اور اس کے لئے ملک و بیرونِ ملک سے معتبر علماء وفقہاء کو جمع کر کے مسائل کو حل کرتی ہے؛ لیکن موجودہ دور میں جو فکری مسائل پیدا ہوئے ہیں ان پر بھی اپنے پروگرام منعقد کرتی ہے؛ تا کہ یہ جہت لوگوں کے سامنے آسکے اور یہ ان موضوعات پر وسیع تر غور وفکر کے لئے ذریعہ بن سکے؛ چنانچہ اب تک اس طرح کے بیس سے زیادہ سیمینار منعقد ہو چکے ہیں، دُعاء ہے کہ یہ پروگرام اپنے مقصد میں کامیاب ہو اور اُمت کے لئے نفع کا ذریعہ بنے۔

میں اخیر میں جامعہ کے ذمہ داران، اساتذہ وطلبہ، مقالہ نگاران، دور دراز سے آئے والے مہمانان اور خود اکیڈمی کے رفقا و کارکنان کا بے حد شکر گزار ہوں اور اُمید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اکیڈمی کو ان حضرات کا تعاون حاصل رہے گا۔

○ ○ ○

امن اور ترقی میں مذہب کا رول ☆

خالد سیف اللہ رحمانی

الحمد للہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین ، وعلی آلہ وصحبہ أجمعین .

حضرات ! خدا نے کرۂ ارض کی اس وسیع وعریض ، خوبصورت اور ہر طرح کی نعمت سے مالا مال بستی کو انسانیت کے لئے بسایا ہے، اس کائنات اور اس سے متعلق تمام چیزیں ہمہ وقت انسانیت کی خدمت میں مشغول ہیں، سورج اس کے لئے ہر دن روشنی کا انتظام کرتا ہے ، زمین اس کے قدموں میں بچھی ہوئی ہے اور اس کی غذائی ضرورت کے لئے بار بار اپنے سینے کا چاک ہونا اور پامال کیا جانا قبول کرتی ہے، درختوں کا کام یہ ہے کہ مزے دار پھل اور عطر بار پھول مہیا کرنے کے علاوہ آلودہ ہواؤں کو اس کے لئے صاف کریں ؛ تاکہ اسے آکسیجن کی کمی کا سامنا نہ کرنا پڑے ، بادل سمندر سے کھارے پانی کا ڈول بھر بھر کر اسے صاف کرتا اور شیریں بناتا ہے اور کھیتوں اور آبادیوں تک باران رحمت پہنچاتا ہے، سمندر کی متلاطم موجیں نہ جانے کتنی ساری آلودگیوں کو ہضم کرتی ہیں اور ان کی زہرناکی سے انسان کو محفوظ رکھتی ہیں، ہوائیں ہر وقت اس کے مفاد کے لئے دوڑ بھاگ میں لگی ہوئی ہے اور دنیا میں جتنے جاندار ہیں ، وہ سب کسی نہ کسی پہلو سے اس کی خدمت میں مصروف ہیں ، یہاں تک کہ جن جانوروں کی درندگی انسان کو لرزاں وترساں رکھتی ہیں، ان کا وجود بھی کسی نہ کسی پہلو سے انسان کے لئے فائدہ مند ونفع بخش ہی ہے، غرض کہ پوری کائنات انسان کی خدمت اور اس کے لئے عیش وراحت کی فراہمی میں مشغول ہے ؛ اسی لئے قرآن کا تصور یہ ہے کہ کائنات انسان کا معبود نہیں ہے ؛ بلکہ اس کی خادم ہے: **''وَسَخَّرَ لَكُم مَّا فِيْ السَّمٰوٰاتِ وَمَا فِيْ الْأَرْضِ جَمِيْعاً مِّنْهُ''** ۔(الجاثیۃ:۱۳)

لیکن دو چیزیں ایسی ہیں جو انسان کے لئے بے حد ضروری ہیں، عیش وعشرت کے جتنے بھی وسائل حاصل ہوجائیں ، اگر یہ دو چیزیں اسے میسر نہ ہوں تو اس کی زندگی بے سکون اور اس کی آرزوئیں ناتمام رہتی ہیں : امن اور ترقی —— اسی لئے اللہ تعالیٰ نے اہل مکہ پر اپنے احسانات کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ تمہیں اس لئے بھی

☆ کلیدی خطبہ جو جشن ۲۵ سالہ انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو دہلی کے سیمینار منعقدہ علی گڑھ میں پیش کیا گیا۔

رب کعبہ کی عبادت کرنی چاہیئے کہ اس نے عرب کے صحرا میں غذائی ضرورت اور کسی حکومت اور لا اینڈ آرڈر کا انتظام نہ ہونے کے باوجود امن کا انتظام فرمایا ہے ''فَلْیَعْبُدُوْا رَبَّ هَذَا الْبَیْتِ ، الَّذِیْ أَطْعَمَهُم مِّن جُوْعٍ وَآمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ ''(قریش:۳-۴) خوف ودہشت سے حفاظت کا تعلق امن سے اور غذائی اشیاء کی فراہمی کا تعلق ترقی سے ہے، زندگی کے لئے مطلوب ساری سہولتیں اللہ تعالیٰ کا خصوصی عطیہ ہیں، مگر یہ دونوں نعمتیں وہ ہیں، جن کو اللہ تعالیٰ نے انسان کے ارادہ اور کوششوں سے متعلق رکھا ہے اور انسان کو ایسی بصیرت اور صلاحیت عطا کی گئی ہے کہ اگر اس کی کوشش صحیح سمت میں ہو تو وہ ان کو حاصل کرسکتا ہے۔

حضرات ! حقیقت یہ ہے کہ امن کے قائم ہونے کا تعلق قیام عدل سے ہے، عدل کی تفصیل یہ ہے کہ زندگی گذارنے کے تین طریقے ہوسکتے ہیں، جن کا قرآن مجید نے ذکر کیا ہے: عدل، احسان اور ظلم، عدل کے معنی یہ ہیں کہ دوسرے کو اس کا حق پورا پورا دے دیا جائے اور خود اپنے حق سے زیادہ نہ لیا جائے، احسان یہ ہے کہ دوسرے کو اس کا حق اس کے حصہ سے بڑھ کر دیا جائے اور خود اپنے حصہ سے کم لیا جائے یا اپنا حصہ نہیں لیا جائے، قرآن مجید نے ان ہی دونوں طریقہ کار کو درست اور قابل قبول قرار دیا ہے: ''إِنَّ اللهَ یَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالإِحْسَانِ وَإِیْتَاءِ ذِیْ الْقُرْبَی وَیَنْهَی عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ وَالْبَغْیِ ''(النحل:۹۰) لیکن آئیڈیل طریقہ یہ ہے کہ انسان 'احسان' سے کام لے، جس کو بندے کے حقوق کے معاملہ میں 'ایثار' کے لفظ سے بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے؛ چنانچہ قرآن مجید میں جگہ جگہ احسان کی تعریف کی گئی ہے، فرمایا گیا: اللہ احسان کرنے والے لوگوں کو پسند فرماتے ہیں ''وَاللهُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ''(آل عمران:۱۳۴) یہ بھی فرمایا گیا کہ جو لوگ احسان کا رویہ اختیار کریں، اللہ تعالیٰ ان کو بہتر بدلہ اور انعام سے محروم نہیں کریں گے: ''إِنَّ اللهَ لاَ یُضِیْعُ أَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ''(التوبۃ:۱۲۰) اس کے بالمقابل 'ظلم' اسلام کی نظر میں بدترین گناہ اور اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ظالم کامیاب نہیں ہوسکتا، ناکامی ونامرادی ہی اس کا حصہ ہے: ''إِنَّهُ لاَ یُفْلِحُ الظَّالِمُوْنَ '' (الانعام:۲۱) ظالموں کا انجام ہلاکت وبربادی ہے: ''هَلْ یُهْلَکُ إِلَّا الْقَوْمُ الظَّالِمُوْنَ ''(الانعام:۴۷) اور اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں فرماتے : ''وَاللهُ لاَ یُحِبُّ الظَّالِمِیْن ''(آل عمران:۵۷) قرآن پاک میں دوسو سے زائد مقامات پر مختلف جہتوں سے ظلم کی اور ظالموں کی مذمت فرمائی گئی ہے اور کم وبیش ایک درجن مقامات پر عدل کا اور تقریباً دو درجن مقامات پر احسان کا حکم دیا گیا ہے یا اس کی تحسین کی گئی ہے، جب معاشرہ میں عدل قائم ہوگا، لوگوں میں احسان کا جذبہ پیدا ہوگا اور ''ظلم'' کرنے والے ہاتھ تھام لئے جائیں گے تو یقیناً وہ معاشرہ امن کی دولت سے بہرہ ور ہوگا۔

حضرات گرامی ! اسلام نے مختلف جہتوں سے ایسی قانونی تدبیر کی ہے، جو امن قائم کرنے میں معاون ہو اور ظلم ونفرت کو روکنے کا ذریعہ بن سکے، عام طور پر جو چیز انسان کو ظلم وزیادتی پر آمادہ کرتی ہے، وہ ایک گروہ کا دوسرے گروہ کے مقابلہ احساس برتری میں مبتلا ہونا اور دوسرے کو اپنے مقابلہ میں حقیر سمجھنا ہے، مختلف ادوار میں دنیا

کی مختلف قومیں اس مرض کا شکار رہی ہیں، خود ہندوستان میں ذات پات کی بنیاد پر آبادی کی اکثریت ہزاروں سال بدترین ظلم و زیادتی کا شکار رہی ہے اور آج بھی اس کے اثرات باقی ہیں، جرمنی میں نازیوں کا احساس تفوق اور دوسری قوموں کے ساتھ ان کا سلوک سب کو معلوم ہے، بیس بائیس سال پہلے تک جنوبی افریقہ اور بعض دوسرے افریقی ممالک بدترین نسلی امتیاز کا شکار تھے، جن کی داستانیں سن کر کلیجہ کانپ اُٹھتا ہے، شاید جور وظلم کے ان واقعات کو دیکھ کر درندے بھی شرمسار ہوئے ہوں گے، آج بھی دنیا میں نسل پرستی پر مبنی ایک مملکت ''اسرائیل'' کی شکل میں موجود ہے، جو صرف حضرت اسحاق علیہ السلام کی اولاد کو ارض فلسطین کا حقدار سمجھتی ہے، حد یہ ہے کہ اسی اُصول پر وہاں کی عدالتیں فیصلے کرتی ہیں، ماضی بعید میں اگر روم وایران اور بعض دیگر ممالک کی تاریخ دیکھی جائے تو نسلی تفریق کے اس تصور نے جس ظلم و جور کو جنم دیا تھا، اس کو پڑھ کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

قرآن مجید نے بنیادی طور پر اس فاسد فکر کی نفی کی ہے اور انسانی وحدت کا تصور پیش کرتے ہوئے کہا ہے کہ تمام انسان ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں، اس لئے نسلی بنیاد پر نہ کوئی انسان بالاتر ہے اور نہ کوئی کمتر :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ وَخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالاً كَثِيْراً وَنِسَاء . (النساء:۱)

اور یہ کہ ہر انسان بحیثیت انسان قابل تکریم واحترام ہے ''وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ''۔(بنی اسرائیل:۷۰)

اسلام کا بنیادی تصور یہ ہے کہ فضیلت وشرافت کا معیار اکتسابی چیزیں ہیں نہ کہ اتفاقی چیزیں، یعنی انسان کا عمل، اس کی بہتر کوششیں، اس کے اچھے کارنامے اور اس کے بلند اخلاق وجہ فضیلت ہیں، نہ کہ یہ بات کہ وہ اتفاق سے کسی خاندان، کسی نسل یا کسی علاقہ میں پیدا ہوگیا، جس میں خود اس کے ارادہ واختیار اور جد وجہد کو کوئی دخل نہیں، دنیا میں جس وقت اسلام آیا، اس وقت دنیا کی اکثر قوموں کا حال یہی تھا کہ انھوں نے اتفاقات کو کسی گروہ کے باعزت ہونے کا معیار بنالیا تھا، جیسے اس کا عربی النسل ہونا، ایرانی ہونا، بادشاہ کے خاندان سے تعلق رکھنا، کسی خاص زبان کو اظہار خیال کا ذریعہ بنانا وغیرہ، اسلام اس سوچ کو بدلا اور اعلان کیا: ''إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ''(الحجرات:۱۳) یہ ایک انقلابی فکر تھی جو اسلام نے انسانیت کو عطا کی اور آج دنیا میں جمہوریت اور مساوات کی جو باتیں کہی جارہی ہیں، وہ دراصل اس صدائے حق کی بازگشت ہے۔

حضرات ! ذات پات کی تفریق کے علاوہ دوسری چیز جو عدل وانصاف کو مجروح کرتی ہے اور جس سے بعض اوقات معاشرہ کا امن پارہ پارہ ہوجاتا ہے، وہ ہے مذہب کو اختلاف اور نفرت کی بنیاد بنانا، اور ایک مذہب سے تعلق رکھنے والوں کا دوسرے مذہب کے ماننے والوں سے بیر رکھنا—— اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ دین حق تو ایک ہی ہے، جس کی بنیاد توحید پر قائم ہے، یہی دین ہے جس کی ہر عہد میں اللہ کی طرف سے آنے والے پیغمبروں نے

دعوت دی ہے؛ لیکن دین کے معاملہ میں تشدد درست نہیں، یعنی ایک شخص دوسرے کواس بات پر مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ اس کے دین کوقبول کرلے ''لاَ إِكْرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ''(البقرۃ:۲۵۶) بلکہ یہ بھی درست نہیں کہ کسی شخص کے ساتھ حسن سلوک کرنے کواس لئے روک دیا جائے کہ وہ مسلمان نہیں ہوتا، اسی پس منظر میں قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی :

لَّيْسَ عَلَيْكَ هُدَاهُمْ وَلَكِنَّ اللهَ يَهْدِيْ مَن يَشَاءُ وَمَا تُنفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلأنفُسِكُمْ وَمَا تُنفِقُوْنَ إِلاَّ ابْتِغَاء وَجْهِ اللهِ وَمَا تُنفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لاَ تُظْلَمُوْنَ . (البقرۃ:۲۷۲)

ان لوگوں کی ہدایت آپ کے ذمہ نہیں ہے، اللہ جسے چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اورتم (ان کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہوئے) جو کچھ مال خرچ کرتے ہو، وہ اپنے ہی لئے، اور خرچ نہیں کرتے ہو؛ مگر اللہ کی خوشنودی کی تلاش میں، اور جو بھی خرچ کروگے تم کو پورا پورا دیا جائے گا (یعنی اس کا اجر ملے گا) اورتم پر ظلم نہیں ہوگا۔

مذہب کی بنیاد پر کسی کی مال و جان کو نشانہ بنانا قطعاً جائز نہیں ہے، اس سلسلہ میں رسول اللہ ﷺ نے ایک اُصولی بات فرمائی ہے کہ غیر مسلم بھائیوں کے خون ہمارے خون کی طرح اوران کا مال ہمارے مال کی طرح ہے ''**دماؤهم كدمائنا واموالهم كاموالنا**''(۱) یعنی جو حرمت کسی مسلمان کی جان ومال کی ہے، وہی غیر مسلموں کی جان مال کی ہے، آپ ﷺ نے ارشادفرمایا: جس نے کسی ''معاہد'' یعنی ایسے غیر مسلم کو قتل کردیا، جس سے امن وآشتی کے ساتھ ایک ساتھ رہنے کا معاہدہ تھا، وہ جنت کی خوشبو سے بھی محروم رہے گا ''**من قتل معاهداً لم يرح رائحة الجنة**''(۲) اسی طرح جیسے کسی مسلمان کی عزت وآبرو کا احترام واجب ہے، اسی طرح غیر مسلم کی عزت وآبرو کی بھی رعایت واجب ہے: ''يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوا لاَ يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّن قَوْمٍ ''(الحجرات:۱۱) اس بات کو بھی ضروری قرار دیا گیا کہ دوسروں کے مذہبی جذبات کا احترام کیا جائے؛ چنانچہ غیر مسلم جن دیوتاؤں اور دیویوؤں کی پرستش کرتے ہیں، ان کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا گیا: ''لاَتَسُبُّوْا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِن دُوْنِ اللهِ ''(الانعام:۱۰۸) کسی بھی قوم کی عبادت گاہ کے منہدم کرنے کو منع کیا گیا ہے؛ چنانچہ قرآن مجید نے جہاں عبادت گاہوں کے منہدم کرنے کی مذمت کی ہے، وہاں مسلمانوں کی مسجدوں سے پہلے یہودیوں اور عیسائیوں کے گرجوں کا ذکر فرمایا ہے، (الحج:۴۰) اس سے ظاہر ہے کہ عبادت گاہیں —— خواہ کسی مذہب کی ہوں —— ان کا احترام ملحوظ رکھنا چاہئے، رسول اللہ ﷺ نے بنو نجران سے جو معاہدہ کیا، اس میں یہ صراحت فرمائی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی اور نہ مذہبی اُمور میں

---

(۱) نصب الرایہ:۳۶۹/۴۔ (۲) بخاری عن عبداللہ بن عمرؓ، حدیث نمبر:۳۱۶۶۔

کوئی مداخلت کی جائے گی،(۱)عہد صدیقی میں حضرت خالد بن ولیدؓ کے ذریعہ حیرہ کا علاقہ فتح ہوا، اہل حیرہ کے لئے انھوں نے جو دستاویز تیار فرمائی، اس میں بھی یہ صراحت موجود ہے کہ ان کے چرچ اور گرجے منہدم نہیں کئے جائیں گے، امام ابو یوسفؒ نے اسے نقل کیا ہے۔(۲)

اسی طرح قرآن نے ایک کثیر مذہبی معاشرہ کے لئے جو نقشہ پیش کیا ہے، وہ یہ ہے کہ ہر مذہبی گروہ اپنے عقیدہ کے مطابق عمل کرے اور دوسروں کے معاملہ میں دخل نہ دے؛ چنانچہ قرآن نے مشرکین مکہ کے سامنے صلح کا جو فارمولہ پیش کیا، وہ یہی تھا: ''لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ''(الکافرون:۶)ایک اور موقع پر ارشاد ہے: ''لَنَا أَعْمَالُنَا وَلَكُمْ أَعْمَالُكُمْ ''(الشوریٰ:۱۵)''ہمارے لئے ہمارے اعمال ہیں اور تمہارے لئے تمہارے اعمال'' رسول اللہ ﷺ کی رواداری کا حال یہ تھا کہ نجران کے عیسائیوں کا وفد بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ ﷺ نے ان کو ان کے مذہب کے مطابق اور ان کے قبلہ کی طرف رُخ کر کے مسجد نبوی ﷺ میں نماز ادا کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی،(۳) فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر کسی مسلمان کی بیوی یہودی اور عیسائی ہو اور اس کے عقیدہ کے مطابق کسی خاص دن روزہ رکھنا واجب ہو تو مسلمان شوہر اسے روزہ رکھنے سے روک نہیں سکتا ہے، گو اس کی وجہ سے وہ جنسی استفادہ کے حق سے محروم ہوتا ہو،(۴)اسی طرح اگر وہ اپنے عقیدہ کے مطابق صلیب پہنے یا مسلمان شوہر کے گھر میں صلیب رکھے تو اسے یہ حق ہے، شوہر اس کو روک نہیں سکتا،(حوالۂ سابق)غرض کہ مذہب کے اختلاف کو نفرت، ظلم وزیادتی اور سلوک ورویہ میں تشدد کا ذریعہ بنانے کی اجازت نہیں ہے۔

حضرات ! امن وامان کو نقصان پہنچانے والی تیسری چیز معاشی نابرابری اور کسی گروہ کی اقتصادی محرومی بھی ہوتی ہے، آج ہمارے ملک میں نکسلائٹ تحریک کے فروغ پانے کا بنیادی سبب یہی ہے، سرمایہ دارانہ نظام دولت کو چند ہاتھوں میں مرتکز کر کے رکھ دیتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ دولت مند اور دولت مند بنتا چلا جاتا ہے اور غریب غریب تر ہوتا جاتا ہے، اسلام اس بات کا قائل تو نہیں ہے کہ جبراً سب کو معاشی اعتبار سے برابر کر دیا جائے؛ کیوں کہ یہ بات فطرت کے خلاف ہے، اسی غیر فطری طرز عمل کی وجہ سے اشتراکی نظام نے دم توڑ دیا؛ لیکن یہ ضروری ہے کہ دولت کی منصفانہ تقسیم ہو، اس کے ارتکاز کو روکا جائے اور سماج کے تمام لوگوں کی بنیادی ضروریات ضرور پوری کی جائیں، اسی لئے اسلام نے زکوٰۃ واجب قرار دی، قرآن مجید نے کہا کہ دولت مندوں کے مال میں ناداروں اور اپنی ناداری کی وجہ سے دستِ سوال پھیلانے والوں کا حق ہے: ''وَالَّذِيْنَ فِيْ أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ، لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ''۔(المعارج:۲۴-۲۵)

---

(۱) ابوداود، حدیث نمبر:۳۰۴۱۔ (۲) موسوعۃ الخراج:۱۴۳۔

(۳) احکام الذمۃ:۱/۳۱۶۔ (۴) احکام اہل الذمۃ:۱/۳۱۶۔

مزدوروں کے حقوق کو خاص طور پر اہمیت دی گئی، ایسی اُجرت مقرر کرنے کا حکم دیا گیا، جس میں مزدور قریب قریب اجر کے معیار پر اپنی بنیادی ضرورتوں کو پوری کرسکیں، جیسا کہ حضور ﷺ نے غلاموں کے بارے میں فرمایا:

> وہ تمہارے بھائی ہیں، جن کو خدا نے تمہارے ماتحت رکھا ہے؛ لہٰذا خدا نے جس کے ماتحت اس کے بھائی کو کیا ہو، اس کو چاہئے کہ اس کو وہی کھلائے جو خود کھائے، جو خود پہنے وہی اس کو پہنائے، اس کو ایسے کام کی تکلیف نہ دے، جو اس کے لئے دشوار ہو، اور اگر ایسے کام کی ذمہ داری سونپ ہی دے تو پھر اس کی مدد کرے۔(۱)

اس حدیث سے یہ بات اخذ کی جاسکتی ہے کہ مزدوروں کی اُجرت اتنی ہونی چاہئے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کو آجرین کے معیار پر پوری کرسکیں، نیز یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اہل وعیال کی بھی اسی سطح پر پرورش کرسکیں، حسبِ ضرورت خادم رکھ سکیں اور مکان بنا سکیں، آپ ﷺ نے فرمایا: جو شخص ہمارا عامل (ملازم) بنے، اسے چاہئے کہ بیوی حاصل کرلے، خادم نہ ہو تو ایک خادم رکھ لے اور مکان نہ ہو تو ایک مکان حاصل کرلے۔(۲)

اگر دولت کی تقسیم اس درجہ نامنصفانہ ہو کہ ایک شخص کے پاس تو اپنی دولت کا حساب بھی نہ ہو اور دوسرا شخص فاقہ مستی پر مجبور ہو تو پھر بغاوت اور نفرت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور اس کا ضمیر اس کو للکارتا ہے کہ :

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

رسول اللہ ﷺ کے ارشادات میں یہ تفصیل بھی ملتی ہے کہ مزدور سے اس کی طاقت کے بقدر ہی کام لیا جاسکتا ہے، نیز یہ تاکید کہ وقت پر اس کی اُجرت ادا کی جائے، اس کے ساتھ باعزت سلوک کیا جائے، کاروبار میں اسے پارٹنر بنانے کی کوشش کی جائے، وغیرہ، ان سب باتوں کا بنیادی مقصد یہی ہے کہ معاشی اعتبار سے معاشرہ عدل پر قائم ہو، کسی گروہ کا استحصال نہ کیا جائے اور کسی طبقہ کے ساتھ ظلم نہ ہو، اسی استحصال کو روکنے کے لئے اسلامی شریعت نے سود اور ذخیرہ اندوزی کو منع کیا ہے۔

یوں تو امن وامان کو پارہ پارہ کرنے والی اور بھی باتیں ہیں؛ لیکن ذات پات کی بنیاد پر انسانیت کی تقسیم، مذہب کی بنا پر تشدد ونفرت اور معاشی ناانصافی وہ باتیں ہیں، جو زیادہ تر امن کو خاکستر کرکے رکھ دیتی ہیں، اسلام نے ان تینوں شعبوں میں ظلم وانصافی کو روکنے پر خصوصی توجہ دی ہے، —— اس کے علاوہ اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ علم پر کسی طبقہ کی اجارہ داری نہیں ہوسکتی، ہر شخص کو تعلیم حاصل کرنے کے یکساں مواقع فراہم ہونے چاہئیں '' **طلب العلم فریضة علی کل مسلم** ''(۳) عوام کو خود اپنے حکمراں منتخب کرنے کا حق حاصل ہونا چاہئے، اسلام میں

---

(۱) بخاری، مسلم، ابوداود، ترمذی۔ (۲) ابوداود، عن مستورد بن شدادؓ۔ (۳) ابن ماجہ: ۲۲۰۴۔

آمریت اور ڈکٹیٹر شپ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، اسلام عوام کو حق دیتا ہے کہ وہ اپنے حکمرانوں کا احتساب کریں، ایک عام شہری کی طرح فرمانروائے مملکت کو عدالت کے کٹہرے میں کھڑا کیا جا سکتا ہے، اسلام یہ بھی چاہتا ہے کہ حکمراں کے لئے صلاحیت اور اخلاق کا ایک معیار ہونا چاہئے، نہ یہ کہ چور، رہزن، قاتل اور زانی ۵۱ فیصد ووٹ لے کر ایوان اقتدار میں پہنچ جائیں اور عوام کے بارے میں فیصلے کرنے لگیں، ان ساری ہدایات کا مقصد سماج میں عدل کو قائم رکھنا اور عدل کے واسطہ سے امن کو قائم رکھنا ہے۔

حضرات ! جب معاشرہ میں امن قائم ہوگا، تمام لوگوں کو انسان ہونے کی حیثیت سے مساویانہ درجہ دیا جائے گا؛ انھیں اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہوگی، دولت کی منصفانہ تقسیم ہوگی، ہر شخص کی بنیادی ضرورتیں مہیا ہوں گی اور سیاسی اعتبار سے قوم کو آزادی حاصل ہوگی تو پھر اعتدال اور استحکام کی فضا قائم ہوگی اور اس فضاء میں ترقی کی کوششیں بارآور ہو سکیں گی۔

'ترقی' ایک وسیع الجہات لفظ ہے، جس کا تعلق تعلیم وتحقیق اور ٹکنالوجی سے بھی ہے، صنعت وحرفت سے بھی ہے، معیشت سے بھی ہے اور اسلام نے ترقی کی ان تمام جہتوں کی نہ صرف حوصلہ افزائی کی ہے؛ بلکہ ضرورت کے لحاظ سے بعض اُمور کی ترغیب دی گئی ہے اور بعض کا حکم دیا گیا ہے، آپ ﷺ نے ہر شخص کو علم حاصل کرنے کا حکم دیا، گویا آپ ﷺ نے ڈیڑھ ہزار سال پہلے 'لازمی حق تعلیم'' کا تصور دیا، آپ ﷺ نے صنعت وٹکنالوجی کی حوصلہ افزائی کی اور فرمایا جو لوگ اس راہ میں آگے بڑھیں، اللہ انھیں پسند کرتے ہیں: ''**ان اللہ یحب المؤمن المحترف** ''(۱) آپ ﷺ نے معاشی ترقی کے لئے تگ ودو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ آدمی کو کوشش کرنی چاہئے کہ اس کے پاس دینے والا ہاتھ ہو نہ کہ لینے والا: ''**الید العلیا خیر من الید السفلی** ''(۲) آپ ﷺ نے ہر علم نافع کی تحسین کی ہے اور اللہ تعالیٰ سے اس کی دُعاء فرمائی ہے اور ایسے علم کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے جو انسانیت کے لئے نفع کے بجائے نقصان کا سبب بن جائے اور اس سے پناہ چاہی ہے۔

لیکن انسانی سماج کے لئے صرف مادی ترقی کافی نہیں؛ بلکہ سب سے بڑی ضرورت اخلاقی ترقی ہے، اگر مادی وسائل حاصل ہو جائیں؛ لیکن انسان اخلاقی بگاڑ میں مبتلا ہو تو یہ وسائل انسانیت کو نفع پہنچانے کی بجائے نقصان پہنچ جانے کا سبب بن جاتے ہیں، آج قدم قدم پر اس کی مثالیں دیکھی جا سکتی ہیں، طب وعلاج ایک مقدس فن ہے؛ لیکن آج اس کی حیثیت محض ایک تجارت کی ہوگئی ہے، مریضوں کا استحصال کچھ اس طرح کیا جاتا ہے کہ گویا انسان نے اپنے فریق مخالف پر فتح پالی ہے اور اب اس کا ایک ایک قطرۂ خون نچوڑ کر ہی دم لینا ہے، تعلیم ایک نہایت قابل احترام پیشہ ہے؛ لیکن آج یہ بھی بڑی حد تک تجارت کے رنگ میں رنگ گیا ہے، استاذ اور شاگرد کا رشتہ محبت وخیر خواہی

---

(۱) شعب الایمان، باب التوکل علی اللہ: ۱۲۳۷۔ (۲) بخاری، کتاب النفقات: ۵۰۴۰۔

اور ایثار و بے غرضی کی بجائے کسب زر اور خود غرضی کا ہوتا جارہا ہے، سائنس وٹکنالوجی کی قوت کو ایسے ہتھیاروں کی تیاری پر استعمال کیا جارہا ہے، جو کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ انسانوں کو ہلاک کرسکیں، پیداوار کو اس لئے ضائع کردیا جاتا ہے کہ اشیاء ضروریہ کی قیمتیں کم نہ ہوجائیں اور سرمایہ داروں کا نفع متاثر نہ ہوجائے، اعلیٰ ترین تعلیم یافتہ لوگ اور بلند ترین عہدوں پر فائز شخصیتیں بھی ایسے کرپشن میں مبتلا ہیں، جنھیں سن کر شرم آتی ہے، مگر افسوس کہ ملک وقوم کے غداروں کو کوئی شرمساری نہیں، ان کی بھوک اس درجہ بڑھی ہوئی ہے اور ان کی حرص ایسی اتھاہ ہے کہ شاید ہفت اقلیم بھی ان کے پیٹ نہ بھر سکے، یہ سب اس بات کا نتیجہ ہے کہ صرف مادی ترقی کو ترقی سمجھ لیا گیا ہے، ترقی کا پیمانہ صرف مادی وسائل میں اضافہ کو بنالیا گیا ہے، انسانیت، ایثار و بے غرضی، بھلائی کا جذبہ، انسانی ہمدردی، فرض شناسی اور اخلاقی قدروں کو ترقی کے تصور سے باہر کردیا گیا ہے؛ حالاں کہ یہی ترقی اصل ترقی ہے، اگر ایک سماج معاشی اعتبار سے کم درجہ ہو، تعلیم میں بھی اس کی ترقی کم ہو؛ لیکن اخلاق کی دولت سے مالا مال ہو تو وہ سماج ایک پُر امن سماج ہوگا، وہ معاشرہ ایسا معاشرہ ہوگا، جس میں سارے لوگ قلبی سکون اور طمانینت کے ساتھ زندگی گزار سکیں گے، نیز جو معاشرہ اس سے محروم ہو تو وہ دولت کی فراوانی، مادی وسائل کی بہتات اور علم کی حصول یابی کے باوجود ایک ایسا معاشرہ ہوگا، جس میں اضطراب ہوگا، سکون سے محرومی ہوگی، ایک دوسرے کے تئیں بے اطمینانی ہوگی، رقابت اور حسد کا جذبہ ہوگا اور حرص کی آگ بجھائے نہ بجھ سکے گی، علامہ اقبالؒ نے بندۂ مومن کے لئے کہا تھا :

سبب کچھ اور ہے تو جس کو خود سمجھتا ہے
زوال بندۂ مومن کا بے زری سے نہیں

انسان کی اخلاقی ترقی میں اگرچہ انسانی فطرت کا بھی حصہ ہے، تعلیم وتربیت کا بھی اور ماحول کا بھی؛ لیکن اس سلسلہ میں سب سے اہم رول عقیدہ ومذہب کا ہے؛ کیوں کہ مذہب بنیادی طور پر انسانی سوچ کو درست کرتا ہے، دل کی دنیا کو بدلنے کی کوشش کرتا ہے اور اسی سے انسان کا پورا رویہ متعلق ہوتا ہے، پیغمبر اسلام ﷺ نے اس پر روشنی ڈالتے ہوئے فرمایا ہے :

ان فی الجسد لمضغة ، اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت الجسد فسد کله ، ألا وھی القلب . (۱)

انسان کے جسم میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہوتا ہے تو اس کا پورا وجود درست ہوتا ہے، اور جب اس میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو انسان کے پورے وجود میں بگاڑ پیدا ہوجاتا ہے اور وہ قلب ہے۔

---

(۱) مسلم، کتاب المساقاۃ: ۱۰۷۔

حضرات ! دنیا میں جتنے بھی مذاہب ہیں، اگرچہ ان کی بعض تعلیمات میں اختلاف پایا جاتا ہے؛ لیکن اس بات پر سب متفق ہیں کہ انسان کا اصل جوہر اس کے اخلاق ہے اور اخلاق کی بنیاد بنی نوع انسان کے ساتھ حسن سلوک اور بہتر برتاؤ ہے؛ اس لئے مادی ترقی اور معاشی تگ و دو کے اس عہد میں سب سے زیادہ جس ترقی کی ضرورت ہے، وہ ہے انسان کی اخلاقی ترقی، اور جس چیز نے انسانی معاشرہ کو بے سکون کردیا ہے، وہ ہے انسانوں کا انسانیت سے محروم ہوجانا؛ اس لئے مذہبی قائدین کا فریضہ ہے کہ وہ آگے بڑھیں، سماج کو اخلاق اور انسانیت کی طرف بلائیں اور ایک ایسے معاشرہ کو فروغ دینے کی کوشش کریں، جو محبت اور پیار پر مبنی ہو، جس میں لوگوں کی سوچ بہتر ہو، جس میں ہر انسان کے سینے میں انسانوں کے لئے تڑپنے والا دل ہو، جو انسانیت کے لئے خیر خواہی اور بھلائی کو اپنی منزلِ مقصود بناتا ہو، جو دوسروں کے لئے وہی پسند کرتا ہو، جو اپنے لئے پسند کرتا ہے، اس طرح ایک ایسا سماج فروغ پاسکے گا جس میں عدل وانصاف ہو، امن ہو، مادی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانیت زندہ ہو اور اخلاقی بلندی لوگوں کے لئے عزت وشرافت کا معیار ہو، خدا کرے کہ یہ پروگرام اس سوچ کو اُبھارنے اور اس فکر کو پیدا کرنے میں مدد ومعاون ثابت ہو اور ہمارا دیش نہ صرف اپنی سائنسی صلاحیت اور معاشی قوت کے اعتبار سے سپر پاور بنے؛ بلکہ وہ اخلاق وانسانیت کے لحاظ سے بھی سپر پاور بن جائے، کہ :

فرشتوں سے بڑھ کر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیاد

وآخر دعوانا أن الحمد لله رب العالمين .

○ ○ ○

اقلیتوں کے حقوق☆

خالد سیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين .

حضرات ! آج ہم ایک ایسے موضوع پر اکٹھا ہوئے ہیں ، جو نہایت اہمیت کا حامل ہے ؛ کیوں کہ آج پوری دنیا میں جمہوریت اور سیکولرزم کو سب سے بہتر اور معیاری نظامِ حکومت تصور کیا جاتا ہے اور یہ اس پہلو سے واقعی اہم ہے کہ اس نظام میں ایک شخص یا ایک خاندان کے بجائے عوام کی رائے کو اہمیت حاصل ہوتی ہے اور ان کو اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار ہوتا ہے ؛ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چوں کہ جمہوری نظام میں اکثریت کی رائے پر فیصلہ ہوتا ہے ؛ اس لئے اقلیت کے حقوق کے تحفظ کا مسئلہ نہایت اہمیت اختیار کر چکا ہے اور اکثر مواقع پر اقلیت کو اپنے بقا اور تشخص کے لئے جد وجہد کئے بغیر چارہ نہیں رہتا ؛ اسی لئے جب سے دنیا میں جمہوری نظام کو غلبہ حاصل ہوا ہے ، اقلیتوں کے حقوق کو خصوصی اہمیت حاصل ہوگئی ہے ، اقلیتوں کے مسائل ہمہ جہت نوعیت کے ہیں ، ان کا تعلق سیاست سے بھی ہے ، معیشت سے بھی ، تعلیم سے بھی اور مذہبی اُمور سے بھی ۔

اسلام ایک ایسا مذہب ہے ، جو عبادت گاہوں کی چہار دیواری تک محدود نہیں ؛ بلکہ وہ پوری زندگی کا احاطہ کرتا ہے اور ہر شعبہ میں انسانیت کی رہنمائی کرتا ہے ، مکہ کی سرزمین میں جب اسلام کا سورج طلوع ہوا ، تو اس وقت تنہا پیغمبر اسلام ﷺ مسلمان تھے ، پھر اسلام کی کرنیں پھیلتی گئیں اور اس کی خوشبو نے روشن ضمیر لوگوں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کر دیا ، لوگ جس قدر اسلام کی طرف جھکتے ، اتنی ہی شدت کے ساتھ عداوتیں بھی اُبھرتی گئیں اور مسلمانوں کے لئے جینا دوبھر ہوگیا ، یہاں تک کہ وہ ترک وطن کرنے پر مجبور ہوگئے ، تیرہ سال مکہ میں آپ نے زندگی گذاری اور اس پورے عرصہ میں مسلمان ایک ایسی اقلیت کی حیثیت سے مکہ میں مقیم رہے ، جو انتہائی جبر وتشدد کا شکار تھی ؛ اس لئے پیغمبر اسلام جناب محمد رسول اللہ ﷺ اقلیت کے درد اور ان کے مسائل سے اچھی طرح واقف تھے ؛ چنانچہ آپ ﷺ نے

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا نے ہمدرد کنونشن سنٹر دہلی میں 'اقلیتوں کے حقوق' کے موضوع پر ایک اہم پروگرام منعقد کیا تھا ، یہ اس موقع پر پیش کیا گیا کلیدی خطبہ ہے ۔

اپنے آخری عمومی خطبہ میں بھی حجۃ الوداع کے موقع پر مسلمانوں کو اقلیت کے ساتھ حسن سلوک — جن کو اہل ذمہ کہا جاتا تھا — کی خاص طور پر تلقین فرمائی۔

اسی لئے اسلام میں اقلیتوں کو وسیع تر حقوق دیئے گئے ہیں، اسلامی مملکت میں مذہبی اقلیت کو ''اہل ذمہ'' کہا جاتا ہے، ذمہ کے اصل معنی عہد اور امان وغیرہ کے ہیں، (۱) چوں کہ اہل ذمہ کی حفاظت مسلمانوں کے ذمہ ہے اور مسلمان ان سے عہد کے پابند ہیں، اس لئے ان کو ذمی یا اہل ذمہ کہا جاتا ہے، علامہ ابن اثیر رقم طراز ہیں :

وسمی أهل الذمة لدخولهم فی عهد المسلمین وأمانهم .(۲)

چوں کہ اسلام نے ذات پات، علاقہ اور زبان کی بنیاد پر کوئی تقسیم نہیں کی ہے، اس لئے لسانی اور نسلی اقلیت کا عام طور پر اسلامی قانون کے ماہرین نے ذکر نہیں کیا ہے اور چند صدی پہلے تک عالم اسلام میں اس کی وجہ سے کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہیں ہوا؛ کیوں کہ اسلام اسلامی وحدت اور انسانی وحدت پر بہت زور دیتا ہے؛ لیکن ہمیں شریعت میں ایسے اُصول ملتے ہیں جو ایسی اقلیتوں کو بھی مساویانہ حقوق فراہم کرنے کے لئے بنیادی ہدایات کا درجہ رکھتی ہیں، قرآن مجید میں صاف طور پر فرمایا گیا ہے کہ خاندانوں اور قبیلوں کی تقسیم محض تعارف کے لئے ہے، تفاخر کے لئے نہیں، اس سے واضح ہوا کہ نسلی بنیاد پر کوئی تفریق نہیں کی جاسکتی؛ اسی لئے دربار محمدی میں ہمیں جہاں قریش کے ابوبکر وعمر اور عثمان وعلی ملتے ہیں، وہیں حبش کے بلال، روم کے صہیب، فارس کے سلمان اور یمن کے ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہم بھی اسی عزت ووقار کے ساتھ موجود ہیں۔

اسی طرح اسلام کی نظر میں مقاماتِ مقدسہ کے علاوہ تمام روئے ارض کی حیثیت برابر ہے، علاقہ کی بنیاد پر کوئی تفریق روا نہیں رکھی جاسکتی، جغرافیائی تقسیم انسانوں کی خود ساختہ ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کھینچی ہوئی سرحدیں نہیں ہیں؛ اس لئے علاقہ کی بنیاد پر انسانوں کی تقسیم کا کوئی تصور نہیں، یہی حال زبان کا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ تمام زبانیں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اللہ کی تمام مخلوقات قابل احترام ہیں، اگر اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کچھ مخصوص زبانیں ہی وقعت کی حامل ہوتیں، تو صرف ان ہی زبانوں میں آسمانی کتابیں اُتاری جاتیں؛ لیکن قرآن مجید نے واضح کردیا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں ان ہی کی زبان میں اپنا پیغام بھیجا ہے، گویا ہر زبان کو پیغامِ الٰہی کا امین بننے کا شرف حاصل ہے۔

اسلام میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے کہ انسان اپنے مافی الضمیر کے اظہار کے لئے کسی خاص زبان ہی کو استعمال کرے، یہی وجہ ہے کہ مسلمان جس علاقہ میں گئے، انھوں نے پوری فراخدلی کے ساتھ وہاں کی زبان اختیار کرلی، اگر دنیا کی مختلف زبانوں میں عربی الفاظ کی موجودگی کا تجزیہ کیا جائے تو بہتر طور پر اس کا اندازہ ہوسکتا ہے؛

---

(۱) لسان العرب:۵/۵۹۔ (۲) النهاية في غريب الحديث:۲/۱۶۸۔

اسی لئے ہمیں اسلامی فقہ میں مذہبی اقلیتوں کا ذکر تو ملتا ہے اور بعض احکام میں مسلمانوں کے اور ان کے درمیان فرق کی نشاندہی ملتی ہے؛ لیکن نسلی، لسانی اور علاقائی اقلیتوں کے جداگانہ احکام نہیں ملتے ہیں؛ کیوں کہ شریعت اسلامی میں اسلامی وحدت اور اسلامی اُخوت کے جو آفاقی تصورات ہیں، ان کی روشنی میں جغرافیائی، لسانی اور نسلی بنیاد پر حقوق واختیارات کے اعتبار سے اکثریت اور اقلیت کا کوئی تصور نہیں پایا جاتا۔

حضرات! موضوع کی مناسبت سے یہ بات مناسب محسوس ہوتی ہے کہ اس وقت مسلم ملک میں غیر مسلم اقلیت کے حقوق کے بارے میں کچھ عرض کیا جائے، اسلام کی بنیاد عقیدۂ توحید پر ہے، توحید کے معنی اللہ تعالیٰ کو اس کی ذات وصفات، اختیارات اور بعض حقوق، عبادت وبندگی کے استحقاق میں یکتا ماننے کا نام ہے، اس بنیادی تصور سے جہاں خدا کی عظمت دل میں گھر کرتی ہے، وہیں اس سے خود انسان کا مقام ومرتبہ بھی معلوم ہوتا ہے اور اس نسبت سے تین باتیں بہت اہم ہیں، اول یہ کہ جب خدا ہی تنہا معبود ہے اور تمام انسان اس کے بندے ہیں، تو اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بحیثیت انسان تمام انسان برابر ہیں، قرآن مجید نے اس کو صاف لفظوں میں بیان کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انسان کو ایک ہی جان سے پیدا کیا ہے ''خَلَقَكُم مِّن نَّفْسٍ وَاحِدَةٍ'' (النساء:۱) یہ وحدتِ انسانیت کا واضح اعلان ہے، تصور توحید سے جو دوسرا تصور اُبھرتا ہے، وہ یہ ہے کہ بحیثیت عبد ومعبود، خدا اور انسان کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے، ایسا نہیں کہ کسی خاص انسان یا مخصوص انسانی گروہ کے بغیر انسان خدا کی خوشنودی کو نہیں پاسکتا؛ بلکہ ہر شخص خدا سے براہ راست مانگ سکتا ہے، اس کے سامنے ہاتھ پھیلا سکتا ہے اور اس کی بندگی کرسکتا ہے، اس لئے کہ وہی قادر مطلق ہے اور باقی سب عاجز ہیں، قرآن مجید کی پہلی سورت، سورۂ فاتحہ میں ''إِيَّاكَ نَعْبُدُ وإِيَّاكَ نَسْتَعِيْن '' (الفاتحہ:۴) کے فقرہ میں بندہ کی زبان سے یہ بات کہلائی گئی ہے کہ: خداوندا! ہم آپ ہی کی عبادت کرتے ہیں اور آپ ہی سے مدد کے خواستگار ہیں، یہ اس بات کا صریح و بے غبار اعلان ہے کہ بندہ براہ راست اپنے رب سے مربوط ہے۔

ان دو تصورات کے ساتھ جو تیسرا تصور سامنے آتا ہے، وہ ہے انسانی کرامت وشرافت کا؛ کہ چوں کہ بحیثیت انسان سارے لوگ برابر ہیں اور کائنات انسان ہی کے لئے پیدا کی گئی ہے؛ اس لئے وہ اس کائنات کی سب سے زیادہ معزز اور قابل احترام مخلوق ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

> وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ وَحَمَلْنَاهُمْ فِيْ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ وَرَزَقْنَاهُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ وَفَضَّلْنَاهُمْ عَلٰى كَثِيْرٍ مِّمَّنْ خَلَقْنَا تَفْضِيْلاً. (بنی اسرائیل:۷۰)
>
> ہم نے بنی آدم کو عزت عطا کی، انھیں خشکی اور سمندر میں سوار کیا، ان کو پاک رزق عطا کی اور ہم نے اپنی پیدا کی ہوئی بہت سی مخلوقات پر ان کو فضیلت دی۔

یہ انسان کے بارے میں اسلام کے بنیادی تصورات ہیں، جو بحیثیت انسان ہر ابن آدم سے متعلق ہیں، خواہ وہ مسلمان ہو یا غیر مسلم، پس اسلام کی نگاہ میں غیر مسلم بھی ہمارے انسانی بھائی ہیں اور بحیثیت انسان قابل احترام ہیں، اسلامی مملکت میں غیر مسلموں کے حقوق انھیں تصورات پر مقرر کئے گئے ہیں، جن کے بنیادی نکات اس طرح ہیں :

۱- غیر مسلموں کی جان کی اسی طرح حفاظت کی جائے گی، جیسے مسلمان کی؛ کیوں کہ قرآن مجید نے کسی بھی انسان کے قتل ناحق کو منع فرمایا ہے: ''وَلاَ تَقْتُلُوْا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰہُ إِلاَّ بِالحَقِّ ''(بنی اسرائیل:۳۳) چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: جس نے کسی معاہد کو قتل کر دیا، وہ جنت کی بُو سے بھی محروم رہے گا'' **من قتل معاهداً لم یرح رائحة الجنة** ''(۱) غرض کہ ایک غیر مسلم شہری کی جان کی وہی اہمیت ہے، جو ملک کے مسلمان شہری کی ہے؛ چنانچہ :

(الف) اگر مسلمان کسی غیر مسلم کو ظلماً قتل کر دے تو وہ مسلمان قصاص کے طور پر قتل کیا جائے گا، اس لئے کہ قرآن مجید نے قصاص کا یہی اُصول بتایا ہے کہ نفس انسانی کے بدلہ قاتل قتل کیا جائے گا ''اَلنَّفْسَ بِالنَّفْسِ '' (المائدۃ:۴۵) حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے ایک مسلمان کو غیر مسلم معاہد کے بدلہ قتل کیا اور فرمایا: ''**أنا أکرم من وفی بذمته** ''(۲) اسی پر صحابہ کا عمل رہا ہے، اہل حیرہ میں سے ایک عیسائی یا یہودی کو کسی مسلمان نے قتل کر دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مسلمان سے اس کا قصاص لیا، (۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی ایک ذمی کو قتل کرنے کے جرم میں مسلمان قاتل کے قتل کئے جانے کا فیصلہ کیا؛ لیکن ذمی کے ورثہ نے خود ہی قصاص معاف کر دیا، اس موقع پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُصولی بات کہی کہ ذمیوں کا خون اور خون بہا مسلمانوں کے برابر ہے ''**من کان له ذمتنا فدمه کدمنا و دیتهٗ کدیتنا** ''(۴) صحابہؓ کے بعد بھی اسی پر عمل رہا، چنانچہ حضرت عمر بن عبد العزیزؒ کے زمانہ میں بھی اسی قسم کا ایک واقعہ پیش آیا، انھوں نے بھی اپنے گورنر کو مسلمان قاتل پر قصاص جاری کرنے کا حکم دیا۔(۵)

(ب) اسی طرح غیر مسلم کی دیت وہی ہے جو مسلمان کی ہے، اس سلسلہ میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت

---

(۱) بخاری، حدیث نمبر:۳۱۶۶۔

(۲) سنن بیهقی:۴۰/۱۲، حدیث نمبر:۱۶۳۴۵۔

(۳) مصنف عبد الرزاق:۱۰۲/۱۰، حدیث نمبر:۱۸۵۱۸۔

(۴) سنن بیهقی:۴۶/۱۲، حدیث نمبر:۱۶۳۶۳۔

(۵) مصنف عبد الرزاق:۱۰۲/۱۰، حدیث نمبر:۱۸۵۱۸۔

اوپر گذر چکی ہے، حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ذمی کی دیت مسلمان ہی کی طرح ادا فرمائی، (۱) حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ سے بھی یہی روایت ہے، جس کے الفاظ ہیں: ''**جعل دیة المعاهد کدیة المسلم**'' (۲) امام ابوحنیفہؒ نے نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہم نے فرمایا کہ جو دیت مسلمان کی ہے، وہی معاہد کی ہے، (۳) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے نقل کیا ہے کہ عہد نبوی ﷺ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد تک مسلمان، یہودی اور عیسائی کی دیت برابر سمجھی جاتی تھی، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ذمی کی دیت نصف کردی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے پھر دونوں کی دیت برابر کردی، (۴) اور ربیعہ بن عبدالرحمٰن نے نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے ابتدائی عہد میں بھی ذمی کی دیت وہی تھی، جو مسلمانوں کی ہے، (۵) چنانچہ فقہاء احناف کے نزدیک ذمی کی وہی دیت ہوتی ہے، جو مسلمان کی، (۶) اور یہی نقطۂ نظر مشہور فقیہ اور محدث سفیان ثوریؒ اور بعض دوسرے اہل علم کا بھی ہے۔ (۷)

۲- غیر مسلم شہریوں کے مال اسی طرح قابل احترام ہیں اور ان کو تحفظ حاصل ہے، جیسے مسلمانوں کے مال، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے جبری طور پر کسی کا بھی مال لینے سے منع کیا ہے، اس میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی تفریق نہیں ''وَلاَ تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ'' (البقرۃ: ۱۸۸) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُصولی بات فرمائی ہے کہ اہل ذمہ کے مال بھی مسلمانوں کے ہی مال کی طرح ہیں ''**دمائهم کدمائنا و أموالهم کأموالنا**'' (۸) چنانچہ رسول اللہ ﷺ جب غیر مسلموں سے معاہدہ کرتے تو جان و مال دونوں کے لئے امان منظور فرماتے۔ (۹)

مال کے تحفظ میں بنیادی طور پر یہ اُمور شامل ہیں:

(الف) مالک ہونے کا حق، غیر مسلموں پر جو ٹیکس عائد کیا جاتا ہے، وہ خود ان کی املاک پر ان کے حق کو تسلیم کرنے کی دلیل ہے۔

(ب) اپنے مال میں تصرف کا حق۔

---

(۱) دارقطنی، کتاب الحدود: ۳۴۳، نیز دیکھئے: نصب الرایة: ۳۶۶/۴۔

(۲) دار قطنی، کتاب الحدود: ۲۴۹۔ (۳) کتاب الآثار للإمام محمد، حدیث نمبر: ۵۸۷۔

(۴) نصب الرایة: ۳۶۶/۴۔ (۵) مراسیل أبي داود: ۱۳، باب دیة الذمی۔

(۶) دیکھئے: هدایه: ۵۸۵/۲، کتاب الدیات، ط: دیوبند، البحر الرائق: ۷۹/۹۔

(۷) ترمذی: ۲۶۱/۱، باب ماجاء لا یقتل مسلم بکافر۔

(۸) دیکھئے: نصب الرایة: ۳۶۹/۴۔

(۹) أبوداود، حدیث نمبر: ۳۰۲۷۔

(ج) غیر مسلموں کے مال کی چوری پر وہی سزا دی جائے گی، جو مسلمان کا مال چوری کرنے پر دی جاتی ہے، اگر چہ خود چوری کرنے والا مسلمان ہو''**ویقطع المسلم بسرقة مال المسلم والذمي**''(۱) اختیار کرنے کا حق حاصل ہے، یہ حق مسلمانوں کی طرح غیر مسلم شہریوں کو بھی حاصل ہوگا، زراعت، تجارت، صنعت اور مختلف طرح کے کاروبار غیر مسلموں کا کرنا خود رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ کے عہد میں ثابت ہے؛ البتہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم، اگر وہ کوئی ایسا پیشہ اختیار کرے، جس کی اہلیت اس میں نہیں ہے اور اس کی نااہلی سے دوسروں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے تو اس کو اس پیشہ کے اختیار کرنے کی اجازت نہیں دی جائے گی؛ چنانچہ جو شخص فن طب سے واقفیت کے بغیر علاج ومعالجہ کرے تو آپ نے اس کو مریض کو پہنچنے والے نقصان کا ضامن قرار دیا؛ چنانچہ ارشاد ہے:''**من تطبب ولم يعلم منه قبل ذلک الطب فهو ضامن**''۔(۲)

۳- غیر مسلم شہریوں کی عزت وآبرو کا اسی طرح تحفظ کیا جائے گا، جس طرح مسلمانوں کی، اسی لئے قرآن نے مطلقاً نگاہ کو پست رکھنے کا حکم دیا، اس میں مسلم وغیر مسلم کی کوئی تفریق نہیں، (النور:۳۱-۳۰) اسی طرح زنا کی سزا مطلق ہے، چاہے کسی مسلمان عورت سے ہو یا غیر مسلم عورت سے۔

۴- غیر مسلموں کو بھی تعلیم وتعلم کے مساوی حقوق حاصل ہوں گے، مدینہ میں یہودیوں کا اپنا مدرسہ ''بیت المدراس'' قائم تھا، آپ ﷺ نے کبھی اس سے تعرض نہیں فرمایا، آپ ﷺ نے باندیوں کو تعلیم دینے کی ترغیب دی، (۳) جو عام طور پر غیر مسلم ہوا کرتی تھیں۔

۵- اسلام میں وضع قانون اصل میں اللہ تعالیٰ کا حق ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے''**وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيْهِ مِن شَيئٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللهِ**''(الشوریٰ:۱۰) اس لئے اسلامی مملکت میں پارلیمنٹ کے کام دو نوعیت کے ہوں گے، ایک تو قرآن وحدیث کے دیئے ہوئے قوانین کی تشریح وتوضیح، دوسرے انتظامی اُمور جیسے ٹریفک، ریلوے وغیرہ کے بارے میں قانون سازی، تو پہلی قسم کے پارلیمانی کام میں غیر مسلموں کا کوئی حصہ نہیں ہوسکتا؛ کیوں کہ وہ اس قانون پر یقین ہی نہیں رکھتے؛ البتہ انتظامی نوعیت کے قوانین میں ان سے رائے لی جائے گی، اسی طرح غیر مسلم اپنے سماجی قوانین وضع کر سکتے ہیں، پس مسلم مملکت کی پارلیمنٹ میں غیر مسلم ارکان ہو سکتے ہیں؛ لیکن شرعی قوانین کی توضیح ان کے دائرۂ عمل سے باہر ہوگی؛ البتہ ان کے مفادات کی پوری رعایت ملحوظ رہے گی۔

---

(۱) المغني لابن قدامة:۱۲/۴۵۱، مع تحقیق: عبداللہ بن عبدالمحسن وغیرہ۔

(۲) أبوداود:۲/۲۳۰۔

(۳) بخاری:۱/۲۰۔

۶- غیر مسلموں کو اسلامی مملکت میں ملازمت کے مواقع دیئے جائیں گے، رسول اللہ ﷺ کا بدر کے قیدیوں سے مسلمان بچوں کو تعلیم دلانا ثابت ہے، (۱) اس سے معلوم ہوا کہ شعبۂ تدریس میں ان سے مدد لی جاسکتی ہے، رسول اللہ ﷺ نے ہجرت کے موقع پر ایک مشرک کو دلیل بنایا ہے، اس سے علامہ ابن قیمؒ نے ثابت کیا ہے کہ غیر مسلم ملازم رکھے جاسکتے ہیں، (۲) اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن غیر مسلموں سے ملک کی سلامتی اور اس کی فکری سمت کو خطرہ نہ ہو، ان کو حساس عہدوں پر بھی مامور کیا جاسکتا ہے اور ان سے فوجی مدد بھی لی جاسکتی ہے، چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے مروی ہے کہ غزوۂ خیبر میں آپ ﷺ نے بنوقینقاع کے یہودیوں سے بھی مدد لی تھی، (۳) اسی لئے فقہاء کا ایک بڑا گروہ اس بات کا قائل ہے کہ قابل بھروسہ مشرکین سے عسکری مدد بھی لی جاسکتی ہے۔ (۴)

۷- غیر مسلموں کو کچھ خاص حدود کے ساتھ مذہبی آزادی بھی حاصل ہوگی؛ البتہ اس سلسلہ میں چند نکات قابل لحاظ ہیں :

(الف) غیر مسلموں کو عقیدہ کی مکمل آزادی ہوگی، قرآن مجید کا ارشاد بالکل واضح ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں ''لاَ إِكْـرَاهَ فِيْ الدِّيْنِ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ '' (البقرة :۲۵۶) اس لئے کسی غیر مسلم کو تبدیلیٔ مذہب پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔

(ب) ایسی بات کہنا جو ان کے لئے مذہبی دل آزاری کا باعث ہو اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی اہانت کے دائرہ میں آتا ہو جائز نہیں، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے مشرکین کے معبودان باطل کو برا بھلا کہنے سے منع فرمایا، ارشاد ہے: ''وَلاَ تَسُبُّـوْا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِن دُوْنِ اللهِ '' (الانعام:۱۰۸) پھر یہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں ان کی زبان میں رسول بھیجے ہیں'' (ابـراهيـم:۴) پس غیر مسلم حضرات جن خود ساختہ معبودوں کی پرستش کرتے ہیں، یہ بات ممکن ہے کہ وہ اپنے زمانہ کے پیغمبر رہے ہوں اور کسی بھی پیغمبر کی اہانت باعث کفر ہے؛ اس لئے اسلام سے پہلے جو مذاہب گذرے ہیں، ان کے پیشواؤں کی بے احترامی کسی طور روا نہیں۔

(ج) غیر مسلم اقلیت کو اپنے مذہبی طریقہ پر عبادت کرنے کی آزادی ہوگی اور وہ اپنے معاشرتی قوانین میں بھی اپنے مذہب پر عمل کرنے میں مختار ہوں گے، حضرات صحابہؓ کے دور میں جہاں کہیں جنگ کے بعد صلح ہوئی تو اس میں اپنے مذہب کے مطابق عبادت کے حق کو تسلیم کیا گیا، علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ مسلمان شوہر کی یہودی عیسائی بیوی کو اس کا شوہر بھی عبادت اور اس کے مذہبی فرائض سے نہیں روک سکتا اور نہ اس کو ایسی چیزوں کے کھانے

---

(۱) دیکھئے: مسند احمد، حدیث نمبر: ۲۲۱۵، عن ابن عباسؓ۔ (۲) أحكام أهل الذمة: ۲۰۷/۱، لإبن القيم۔

(۳) نصب الراية: ۴۲۲/۳۔ (۴) كتاب الإعتبار للحازمی: ۲۱۷۔

پر مجبور کرسکتا ہے، جو اس کے مذہب میں حرام ہو۔(۱)

چنانچہ غیر مسلموں کو خنزیر کھانے کی اجازت ہوگی، ان کو شراب کی خرید وفروخت کی بھی اجازت ہوگی، (۲) یہاں تک کہ مجوسیوں کے یہاں ماں، بیٹی اور محرم رشتہ داروں سے بھی نکاح کی اجازت تھی، فقہاء نے لکھا ہے کہ جب تک وہ دونوں یا ان میں سے ایک مسلمان نہ ہوں، ہم ان کے معاملہ میں دخل نہیں دیں گے، (۳) رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی حضرت عرفہ بن حارث ؓ ذمیوں کے حقوق پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں: ''**وأن یخلی بینهم وبین أحكامهم**''۔(۴)

(د) غیر مسلموں کو اپنی عبادت گاہوں کی حفاظت کا بھی حق حاصل ہوگا، قرآن مجید نے اس بات کو ناپسند کیا ہے کہ فاتحین، مفتوحین کی عبادت گاہوں کو منہدم کردیں ''**وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُم بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَصَلَوَاتٌ وَمَسَاجِدُ يُذْكَرُ فِيهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيراً**'' (الحج: ۴۰) رسول اللہ ﷺ نے اہل نجران سے جو معاہدہ فرمایا، اس میں یہ بات بھی شامل تھی کہ ان کی عبادت گاہیں منہدم نہیں کی جائیں گی، ان کے مذہبی پیشوا سے تعرض نہیں کیا جائے گا اور نہ انھیں ان کے دین سے ہٹایا جائے گا ''**لا یهدم لهم بیعة ولا یخرج لهم قس ولا یفتن عن دینهم**'' (۵) اسی طرح کی تحریریں حضرت خالد بن ولید ؓ سے بھی مختلف صلح ناموں میں مروی ہیں، (۶) حضرت ابوبکر ؓ نے اہل نجران سے معاہدہ کی تجدید میں بھی اس دفعہ کو شامل رکھا ہے، (۷) حضرت خالدؓ کے صلح ناموں میں صراحت ہے کہ وہ اوقات نماز کو چھوڑ کر جس وقت بھی چاہیں ناقوس بجانے کا حق رکھیں گے اور اپنے تیوہاروں میں صلیب بھی نکالیں گے، (۸) فقہاء کے یہاں یہ صراحت بھی ملتی ہے کہ ان کی جو عبادت گاہیں ٹوٹ جائیں، وہ ان کو دوبارہ تعمیر کرنے کا حق رکھتے ہیں؛ چنانچہ علامہ ظہیر الدین مرغینانی فرماتے ہیں: ''**إن انهدمت البیع والكنائس القدیمة أعادوها**''۔(۹)

جہاں تک نئی عبادت گاہوں کی تعمیر کی بات ہے تو قرآن وحدیث میں صراحتاً کہیں اس کی ممانعت وارد نہیں ہوئی ہے اور بعض فقہاء کے یہاں اس کے جائز ہونے کی صراحت ملتی ہے کہ وہ اپنی زمین میں عبادت گاہ تعمیر کرلیں ''**ولا یمنعون أن یجعلوا فی أراضیهم بیعا ولا صوامع ولا كنائس**'' (۱۰) اسی طرح غیر مسلم اپنی

---

(۱) أحكام أهل الذمة: ۱/۳۱۶۔ (۲) هداية، باب نكاح أهل الشرك۔
(۳) هداية، باب وصية الذمی۔ (۴) مجمع الزوائد، حدیث نمبر: ۹۱۸۰۳۔
(۵) أبوداود، حدیث نمبر: ۳۰۴۱۔ (۶) كتاب الخراج لأبي يوسف: ۱۴۳۔
(۷) كتاب السير والخراج والعشر للشيباني: ۲۵۰۔ (۸) كتاب الخراج: ۱۴۶۔
(۹) هداية، باب الجزية۔ (۱۰) كتاب السير والخراج والعشر للشيباني: ۲۵۳۔

عبادت گاہوں کے لئے وقف بھی کر سکتے ہیں، بعض فقہاء کی عبارت سے اس کا جواز معلوم ہوتا ہے، ''إذا تبنیٰ داره بیعة أو کنیسة فهو جائز من الثلث ''۔(۱)

(ہ) غیر مسلموں کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ مسلمانوں کے سوا دوسری اقوام پر اپنے مذہب کی تبلیغ کریں، اگر وہ رضا کارانہ اپنا مذہب بدل لیں، جیسے یہودی عیسائی، یا عیسائی ہندو بن جائے تو اس سے حکومت کو کوئی سروکار نہیں ہوگا، امام مالکؒ نے اس کی صراحت کی ہے، (۲) البتہ اس بات کی اجازت نہیں ہوگی کہ وہ مسلمانوں کو اپنے مذہب میں آنے کی دعوت دیں، اگر دارالاسلام میں کوئی مسلمان مرتد ہو جائے تو اس کی سزا قتل ہے، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''من بدل دینه فاضربوا عنقه ''(۳)؛ کیوں کہ دارالاسلام میں اسلام سے ارتداد بغاوت کے مترادف ہے اور دنیا کے ہر قانون میں بغاوت کی سزا قتل یا اس کے مماثل ہے۔

۸- غیر مسلم شہریوں کو بھی احتجاج کا حق اور اظہار رائے کی آزادی ہوگی؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الْجَھْرَ بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَن ظُلِمَ وَکَانَ اللّٰہُ سَمِیْعاً عَلِیْماً ''(النساء:۱۴۸) غیر مسلموں کو مسلمان اور ان کے افکار پر سنجیدہ اور شائستہ تنقید کا بھی حق ہوگا؛ جیسا کہ قبیلۂ بنی نجران سے آپ کا مباحثہ ومناقشہ ہوا، فقہاء نے تو یہ بھی لکھا ہے: ''ومن امتنع من الجزیة أو قتل مسلماً أو سب النبی صلی اللہ علیه وسلم أو زنی بمسلمة لم ینتقض عهده ''(۴)؛ لیکن ظاہر ہے کہ ایسی تنقید جو بدتمیزی اور بے ادبی کے دائرہ میں آتی ہو، کی اجازت نہیں ہوگی اور رسول اللہ ﷺ کی اہانت کی وجہ سے چاہے عہد ذمہ ختم نہ ہو، لیکن بطور سرزنش وہ لائق قتل ہوگا۔

۹- غیر مسلموں کے ساتھ عمومی حسن سلوک اور مالی اعانت نہ صرف جائز؛ بلکہ مستحسن ہوگی، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لَا یَنْھَاکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِیْ الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُم مِّن دِیَارِکُمْ أَن تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْا إِلَیْھِمْ إِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ ''(الممتحنه:۸) اہل ذمہ تو کیا رسول اللہ ﷺ نے ان اہل مکہ کی بھی مدد فرمائی، جو اسلام سے برسر جنگ مگر قحط سے دوچار تھے، آپ نے ان کی مدد کے لئے پانچ سو دینار ابوسفیان بن حرب اور صفوان بن امیہ کو بھیجے کہ اسے اہل مکہ پر تقسیم کردیں، (۵) اسی لئے فقہاء حنفیہ کے نزدیک زکوٰۃ

---

(۱) هدایة ، باب وصیة الذمی۔

(۲) مؤطا امام مالك:۳۰۸،القضاء فیمن ارتد عن الإسلام۔

(۳) ابوداؤد:۵۹۸/۲،ترمذی:۲۷۰/۲۔

(۴) هدایة ، باب الجزیة۔

(۵) ردالمحتار:۳۰۲/۳،باب المصرف۔

کے سوا تمام صدقات واجبہ، نیز صدقۃ الفطر غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے اور صدقات نافلہ تو بدرجۂ اولیٰ،(۱) پس غیر مسلم اقلیت کو تمام معاشی سہولتیں دی جائیں گی، خاص طور پر بیمار، معذور، آفت زدہ، مفلس اور قدرتی مصائب سے دوچار ملک کے تمام شہریوں کی انسانی بنیادوں پر مدد کی جائے گی۔

۱۰- غیر مسلموں پر شخصی حیثیت سے ایک خاص ٹیکس جزیہ کا اور زرعی پیداوار پر خراج کا لیا جائے گا، عورت، نابالغ بچہ، فاتر العقل، سن رسیدہ بوڑھا، اپاہج اور دائم المریض اشخاص نیز معاشی اعتبار سے کمزور افراد پر جزیہ کا ٹیکس عائد نہیں ہوگا، (۲) جزیہ کی مقدار بہت ہی معمولی ہے، جزیہ کے عوض حکومت ان کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہے اور چوں کہ مسلمانوں سے زکوٰۃ وصول کی جاتی ہے، اگر ان سے بھی زکوٰۃ لی جاتی تو یہ ان کو ایک اسلامی عبادت پر مجبور کرنے کے مترادف ہوتا؛ اس لئے ان پر ایک خصوصی ٹیکس عائد کیا گیا ہے، جو پہلے سے ایران وغیرہ کے علاقہ میں مروج تھا۔

جیسے مسلمانوں سے ان کی زرعی پیداوار میں عشر لیا جاتا ہے، جو ایک طرح کی عبادت ہے، اسی طرح غیر مسلموں سے بجائے عشر کے خراج لیا جاتا ہے، جس کی مقدار معمولی ہے اور جو سیلاب یا سوکھا پڑ جانے کی صورت میں معاف ہو جاتا ہے، (۳) یہ ٹیکس غیر مسلموں کی تذلیل نہیں؛ بلکہ ملک کی انتظامی ضرورتوں کو اس طرح پورا کرنا ہے کہ ان پر زکوٰۃ وعشر جیسی خالص اسلامی عبادتیں لازم قرار نہ دی جائیں؛ کیوں کہ یہ مذہبی آزادی کے مغائر ہوتا۔

بزرگانِ محترم! اسلام کی ان ہی تعلیمات کا اثر ہے کہ مسلمانوں نے ہمیشہ اپنے زیر اقتدار غیر مسلم اقلیت یا اکثریت کے ساتھ بہتر سلوک کیا ہے اور آج بھی مسلم ممالک میں غیر مسلم بھائی پوری آزادی اور سہولتوں کے ساتھ مقیم ہیں، اسرائیل میں صورتحال یہ ہے کہ مسلمانوں کے گھر پر بلڈوزر چلا دیئے جاتے ہیں اور بغیر کسی سبب کے انھیں جلاوطن کر دیا جاتا ہے؛ لیکن اسرائیل ہی کے پڑوس میں مصر اور شام کو دیکھئے اور ذرا آگے بڑھ کر ایران وعراق پر نظر ڈالیے کہ وہاں یہودی اور بعض قدیم عیسائی فرقے پوری راحت اور سکون کے ساتھ مقیم ہیں، انڈونیشیا سب سے بڑی مسلم آبادی کا ملک ہے وہاں عیسائیوں کو نہ صرف آزادی حاصل ہے؛ بلکہ یہ آزادی بعض اوقات مسلمانوں پر زیادتی کی شکل اختیار کر لیتی ہے، ہندوستان کے مختلف خطوں میں تقریباً ایک ہزار سال مسلمانوں نے حکومت کی؛ لیکن ہندوؤں اور بدھسٹوں کے بڑے بڑے تاریخی مندروں کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچا؛ بلکہ مسلمان حکومت نے ان کے لئے بڑی بڑی جاگیریں عطا کیں اور مذہبی پیشواؤں کے لئے خصوصی مراعات رکھی گئیں، ہندو مؤرخین نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے۔

---

(۱) دیکھئے: درمختار مع الرد: ۳۰۱/۳۔ (۲) أحكام أهل الذمة: ۴۸/۱، ۵۲، ۵۳، هداية، باب الجزية۔

(۳) هداية، باب العشر والخراج۔

مگر بڑے افسوس کے ساتھ عرض کیا جاتا ہے کہ آج پوری دنیا میں مسلمان اقلیتوں کے ساتھ نامنصفانہ رویہ اختیار کیا جاتا ہے اور مغربی معاشرہ میں ''اسلاموفوبیا'' کی ایسی مہم برپا کی گئی ہے کہ ہر شخص اسلام اور مسلمانوں سے خوف زدہ ہوجائے اور اسلامی شعائر وعلامات سے لوگوں کے دلوں میں نفرت بیٹھ جائے، جوممالک جمہوریت وسیکولرزم کا نام لیتے ہیں اور اپنے آپ کو حقوقِ انسانی کا علمبردار کہتے ہیں، ان کے یہاں حال یہ ہے کہ مذہبی شعائر اور مذہبی شخصیتوں کے احترام میں امتیاز برتا جاتا ہے، انبیاء بنی اسرائیل کی توہین تو قانوناً ممنوع ہے اور یقیناً ہونی چاہئے؛ لیکن پیغمبر اسلام اور دوسرے مذاہب کے پیشواؤں کے معاملہ میں گستاخانہ رویہ کو اظہار خیال کی آزادی کا نام دیا جاتا ہے، لوگوں کو بے لباس تو چلنے کی اجازت ہے؛ لیکن مسلمان عورت کو حجاب یا نقاب پہننے اور مردوں کو داڑھی رکھنے کی اجازت نہیں ہے، یہاں تک کہ مسجد کے مینارے بھی ان کی آنکھوں کا تیر بن گئے ہیں، کیا یہی انسانی حقوق کی پاسداری ہے اور یہی اقلیت کے حقوق کی رعایت ہے؟ پھر ہمارے ملک ہندوستان میں صورت حال یہ ہے کہ ممبئی کے فرقہ وارانہ فسادات میں جو مسلمان مارے گئے، ان کے سلسلہ میں سری کرشنا رپورٹ کو دبا دیا گیا اور کوئی کارروائی نہیں ہوئی؛ حالاں کہ اس کے ردعمل میں ہونے والے بم بلاسٹ کے مرتکبین کو کیفرِ کردار تک پہنچایا گیا، ہم ان کے خلاف کارروائی کے مخالف نہیں ہیں؛ لیکن انصاف کے دو پیمانے نہیں ہونے چاہئیں، بابری مسجد دوپہر کی دھوپ میں اور الیکٹرانک میڈیا کے سامنے شہید کی گئی اور مسجد پر حملہ کرنے والوں کی تصویریں بھی شائع ہوئیں اور اس جرم میں شریک ہونے والوں نے علی الاعلان اس کا اعتراف کیا اور اس پر فخر کا اظہار بھی کیا؛ لیکن اس پر کوئی کارروائی نہیں ہوئی، گودھرا کے واقعہ میں ملوث لوگوں پر تو بلا تحقیق جنگل کا قانون ''پوٹا'' نافذ کیا گیا؛ لیکن گجرات میں شہید ہونے والے دو ہزار مسلمانوں کی آہ کسی نے نہیں سنی اور حکومت نے اس پر کوئی کارروائی نہیں کی، یہ ایک واضح مثال ہے مسلمان اقلیت کے حقوق کو تلف کرنے کی اور مظلوم کو ظالم کے کٹہرے میں کھڑا کرنے کی، جس پر آج مغرب سے مشرق تک پوری دنیا کا عمل ہے۔

حضرات! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا عصر حاضر میں پیدا ہونے والے فقہی مسائل کو حل کرنے، نوجوان نسل کی علمی وفکری تربیت کرے اور اس دور میں پیدا ہونے والے سماجی، اقتصادی اور سیاسی مسائل میں رہنمائی کے لئے کوشاں ہے، اس نے اب تک اٹھارہ سیمینار کئے ہیں، جس میں تقریباً ڈیڑھ سو فقہی فیصلے کئے گئے، ان سیمیناروں سے ہٹ کر تربیتی وفکری نوعیت کے چوبیس پروگرام منعقد کئے جاچکے ہیں، اہم علمی وفقہی موضوعات پر تقریباً سو کتابیں شائع ہوچکی ہیں، کویت سے شائع ہونے والی عظیم الشان فقہی انسائیکلو پیڈیا ''الموسوعۃ الفقہیۃ'' کی پوری پینتالیس جلدوں کا اُردو میں ترجمہ کیا گیا ہے ہے اور اکیڈمی کے سیمیناروں میں پیش ہونے والے مقالات کے تقریباً تیس مجموعے شائع ہوچکے ہیں، جو اُردو زبان میں نئے مسائل پر ہونے والی فقہی کاوشوں کا سب سے بڑا

ذخیرہ ہےاوراللہ تعالیٰ کاشکر ہے کہ نہ صرف ملک میں؛ بلکہ بیرونِ ملک بھی اکیڈمی کی علمی وتحقیقی کاوشوں کوقدروقعت کی نگاہ سے دیکھا جارہا ہے۔

حضرات!اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ سیمینار ہے،اس وقت پوری دنیا میں اقلیتوں کے حقوق زیربحث ہیں، اقوام متحدہ بھی اس سلسلہ میں مختلف فیصلے کرتی اور رکن ممالک کوتوجہ دلاتی رہی ہے؛ کیوں کہ جمہوری نظام میں اگر اکثریت انصاف کا دامن چھوڑ دے اور اپنی عددی طاقت کا ہتھیارظلم وجبر کے لئے استعمال کرنے لگے،تو پھر یہ جمہوریت اکثریت کی آمریت اوراستبداد کا روپ اختیار کرلیتی ہےاوراقلیت کے لئے اپنی شناخت کو باقی رکھنا دشوار ہوجاتا ہے؛ بلکہ کسی قوم کا غالب حصہ اگرکم تعداد اقلیت پرظلم وزیادتی کے لئے کمربستہ ہوجائے تو اس کا زخم شخصی آمریت اوراستبداد سے بھی زیادہ گہرا ہوجاتا ہےاوراقلیت نہ صرف دکھ اُٹھاتی ہے؛ بلکہ اس کی مصیبت پرآنسو بہانے والی کوئی آنکھ بھی میسرنہیں ہوتی ، اس وقت دنیا کے مختلف ملکوں میں مسلمان اور دوسری مذہبی ، لسانی اورجغرافیائی اقلیتیں اسی صورتِ حال سے دوچار ہیں، انشاءاللہ یہ سیمینار اقلیتوں کے حقوق کو واضح کرنے ، اس نسبت سے اکثریت کے ضمیرکوجھنجھوڑنے، نیز اقلیتوں کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظرکوپیش کرنے میں مفیدومعاون ثابت ہوگا،خدا کرے یہ سیمینار ان مقاصد کوحاصل کرنے میں کامیاب ہو۔

وبالله التوفيق وهو المستعان .

○ ○ ○

مسلمانوں کے مختلف مکاتبِ فکر کو قریب کرنے میں علماء کا کردار☆

خالد سیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين ، والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين .

حضرات! اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دنیا کے موجودہ حالات کے پس منظر میں مذاہب اسلامیہ کے دوران مکالمہ — تا کہ ان کے درمیان قربت اور ایک دوسرے کے تئیں تحمل پیدا ہو — نیز کلمۂ توحید کی بنیاد پر ان کو متحد کرنے کی کوشش وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے؛ بلکہ ایسی کاوشیں اس عہد میں جہاد کا درجہ رکھتی ہیں۔

موجودہ حالات میں مسلمانوں کے باہمی فاصلوں کو پاٹنے ،مختلف فرقوں کے درمیان ایک دوسرے کو برداشت کرنے کی صلاحیت پیدا کرنے اور عامۃ المسلمین کو باہمی جدال یہاں تک کہ خون ریزی سے بچانے کے سلسلہ میں علماء اور مذہبی قائدین نہایت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں اور اس کی اہمیت اس لئے ہے کہ علماء جس بصیرت اور نصح ومحبت کے جذبہ کے ساتھ اُمت کی بے غرض رہنمائی کر سکتے ہیں،کوئی اور گروہ نہیں کر سکتا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ بہت سی کوتاہیوں کے باوجود آج بھی مسلمانوں کے دلوں میں اپنے علماء کی آراء اور فیصلوں کی جو قدر و قیمت ہے، کسی اور گروہ کی ہدایات کو وہ درجہ حاصل نہیں ،عموماً مسلمان دل کی آمادگی کے ساتھ بہت کم کسی اور گروہ کی بات کو قبول کرتے ہیں۔

اس پس منظر میں اس وقت علماء کو اُمت کی صحیح رہنمائی میں افراط وتفریط سے بچتے ہوئے معتدل راستہ اختیار کرنا نہایت ہی ضروری ہے،علماء اُمت کو جوڑنے کے سلسلے میں کن پہلوؤں پر توجہ دیں،اس سلسلہ میں چند اہم نکات پیش ہیں :

(۱) پہلی بات یہ ہے کہ ایمان بہت بڑی نعمت ہے،اس سے چوں کہ دنیا وآخرت کی فلاح ونجات متعلق ہے، اس لئے خدا نے ایمان لانے کو ایک آسان عمل بنایا ہے،کوئی بھی شخص جو اللہ تعالی کی توحید،رسول اللہ ﷺ کی رسالت

☆ یہ ''حوار بین المذاہب الاسلامیہ'' کے نام سے منعقد ہونے والی دوحہ کانفرنس ۲۰-۳۰/جنوری ۲۰۰۶ء میں پیش کئے گئے خطبہ کا ترجمہ ہے۔

اور آخرت پر یقین کا اظہار کرے، وہ اسلام کے دائرہ میں آ گیا، جیسے ہی اس نے زبان سے توحید و رسالت کی شہادت دی، اس پر مسلمانوں کے احکام جاری ہوں گے، یہاں تک کہ اس کے دل میں جو کچھ ہے، اسے کھر چ کر دیکھنے کا بھی ہمیں حق نہیں ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

الإيمان أن تؤمن بالله وملائكته وبلقائه وبرسله وتؤمن بالبعث . (۱)

ایمان یہ ہے کہ (تم) اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، (روز قیامت) اس کے دیدار پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ۔

اسی طرح حضرت عبادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا :

من شهد أن لا إلـه إلا الله وحده لا شريك لـه ، وأن محمداً عبده ورسوله ، وأن عيسىٰ عبد الله ورسوله وكلمته ألقاها إلى مريم وروح منه ، والجنة حق والنار حق ، أدخله الله الجنة على ما كان من العمل . (۲)

جو شخص اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ ایک اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں، محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بندے اور رسول ہیں اور اس کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے مریم پر نازل کیا، اس کی روح ہیں، جنت حق ہے اور جہنم حق ہے تو ایسے شخص کو اللہ تعالیٰ جنت میں داخل کرے گا، خواہ اس کے اعمال کیسے ہی ہوں۔

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں کچھ لوگ منافق تھے، جو اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے تھے، بہ باطن وہ مسلمان نہیں تھے، حضور ﷺ نے ان کے ساتھ مسلمانوں ہی کا سا معاملہ فرمایا، آپ ﷺ کو من جانب اللہ ان کے اسماء بتا دیئے گئے تھے، اس کے باوجود آپ ﷺ نے عام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر اس کو آشکارا نہیں فرمایا؛ تاکہ کہیں لوگ ان کے ساتھ کلمہ گو ہونے کے باوجود ایسا برتاؤ نہ کرنے لگیں جو کسی مسلمان کے ساتھ نہیں کیا جا سکتا۔

ایمان لانا جتنا آسان ہے اور مسلمان ہونے کا حکم لگانا جتنا سادہ اور سہل ہے، کسی شخص کو دائرۂ ایمان سے باہر قرار دینا اسی قدر نازک بات ہے اور اس میں نہایت احتیاط برتنے کا حکم ہے، جب تک کہ کسی شخص کے کفر کا یقین نہ ہو جائے، اس پر کافر ہونے کا حکم نہیں لگایا جا سکتا، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب کوئی شخص مسلمان کو کافر کہتا ہے تو یہ کفر اسی کی طرف لوٹ کر آ جاتا ہے''۔

---

(۱) بخاری، باب سوال جبرئیل النبی ﷺ عن الایمان والاسلام والاحسان وعلم الساعۃ، حدیث نمبر: ۳۷۔

(۲) بخاری: ۱/۴۲-۴، کتاب احادیث الانبیاء۔

عن عبد الله بن دينار أنه سمع ابن عمر يقول : قال رسول الله صلى الله عليه وسلم أيما امرئ قال لأخيه : كافر ، فقد باء بها أحدهما ، إن كان كما قال وإلا رجعت عليه . (۱)

حضرت عبداللہ بن دینار کہتے ہیں کہ انھوں نے حضرت ابن عمر کو کہتے ہوئے سنا کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جس شخص نے بھی اپنے بھائی کو کافر کہا تو ایسی صورت میں دو میں سے ایک بات ہوگی یا تو وہ شخص واقعتاً کافر ہوگا اور اگر ایسا نہیں ہے تو یہ بددُعا خود اس کی طرف لوٹ جائے گی۔

اسی مضمون کی ایک روایت حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بھی مروی ہے :

ومن دعا رجلا بالكفر أو قال : عدو الله ، وليس كذلك إلا عاد عليه . (۲)

اگر کسی نے کسی کو کافر کہہ دیا اسے اللہ کا دشمن کہا؛ حالاں کہ وہ ایسا نہیں تھا تو اس کا وبال خود اس پر آئے گا۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ :

إن النبي صلى الله عليه وسلم قال : إذا أكفر الرجل أخاه فقد باء بها أحدهما . (۳)

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: اگر کوئی شخص اپنے بھائی کو کافر کہتا ہے تو ایسی صورت میں ان دونوں میں سے کوئی ایک اس کو لے کر لوٹے گا۔

اسی لئے فقہاء نے تکفیر کے سلسلہ میں بڑی احتیاط کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ معروف حنفی فقیہ علامہ ابن عابدین شامیؒ فرماتے ہیں :

وينبغي أن يلحق بالضرورة أيضاً ما قد مناه من أنه لا يفتى بكفر مسلم في كفره اختلاف ولو رواية ضعيفة . (۴)

یہاں پر وہ بات بھی ذکر کرنی چاہئے جسے ہم پہلے بیان کر چکے ہیں کہ کسی ایسے مسلمان کے کفر کے سلسلہ میں فتویٰ نہیں دیا جاسکتا جس کے کفر کے بارے میں اختلاف ہو، اگر چہ اختلاف کے سلسلہ میں روایت کمزور ہی کیوں نہ ہو۔

---

(۱) مسلم، کتاب الایمان، باب بیان حال الایمان، حدیث نمبر:۲۱۶۔
(۲) مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۲۱۷۔
(۳) مسلم، کتاب الایمان، حدیث نمبر: ۲۱۵۔
(۴) رسم المفتی: ۱۹۰، مطبوعہ مکتبہ زکریا، دیوبند۔

اس سلسلہ میں امام ابوحنیفہؒ کا ایک دلچسپ واقعہ بھی قابل ذکر ہے، جسے علامہ ابن نجیم مصریؒ نے نقل کیا ہے :

وسئل الإمام عمن قال : لا أرجو الجنة ، ولا أخاف الله تعالٰی ، وآكل الميتة ، وأصلي بلا قراء ة وبلا ركوع وسجود ، وأشهد بما لم أره ، وأبغض الحق ، وأحب الفتنة ، فقال أصحابه : أمر هذا الرجل مشكل ، فقال الإمام : هذا الرجل يرجو الله لا الجنة ، ويخاف الله لا النار ، ولا يخاف الظلم من الله تعالٰی في عذابه ، ويأكل السمک والجراد ، يصلي على الجنازة ، ويشهد بالتوحيد ، يبغض الموت وهو حق ، ويحب المال والولد وهو فتنة ، فقام السائل وقبل رأسه ، وقال : أشهد أنک للعلم وعاء . (۱)

امام ابوحنیفہؒ سے اس شخص کے سلسلہ میں سوال کیا گیا جو یہ کہتا ہے کہ میں نہ ہی جنت کی تمنا کرتا ہوں، نہ ہی جہنم سے ڈرتا ہوں اور نہ ہی خدا کا خوف رکھتا ہوں، میں مردار کھاتا ہوں، میں بغیر قراءت، رکوع اور سجدہ کے نماز پڑھتا ہوں، جو چیزیں میں نے دیکھی نہیں ہیں اس کے بارے میں بھی گواہی دیتا ہوں، حق سے گریز کرتا ہوں، فتنہ کو پسند کرتا ہوں، امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں نے کہا کہ اس شخص کا معاملہ تو بڑا ہی مشکل وپیچیدہ ہے؟ امام صاحبؒ نے فرمایا: یہ شخص اللہ کی تمنا رکھتا ہے؛ لیکن جنت کی نہیں، یہ اللہ سے ڈرتا ہے؛ لیکن جہنم سے نہیں، وہ اس بات سے خائف نہیں رہتا کہ اللہ اسے عذاب دینے میں ظلم کرے گا، وہ مچھلی اور ٹڈی کھاتا ہے، وہ جنازہ کی نماز پڑھتا ہے، وہ اللہ کی وحدانیت کی گواہی دیتا ہے، وہ موت کو ناپسند کرتا ہے؛ حالاں کہ وہ حق ہے، وہ مال واولاد سے محبت رکھتا ہے اور یہ فتنہ ہے، یہ سن کر سوال کرنے والا کھڑا ہو گیا اور اس نے امام صاحبؒ کے پیشانی کو بوسہ دیا اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ علم کے سمندر ہیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کلمہ شہادتین کے پڑھنے سے انسان اسلام کے دائرہ میں آتا ہے اور عملی زندگی میں اس کے مسلمان ہونے کی پہچان یہ ہوتی ہے کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھے، کعبۃ اللہ کو قبلہ تسلیم کرے اور مسلمانوں کا ذبیحہ حلال سمجھے؛ چنانچہ حضرت انسؓ نے رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کیا ہے :

(۱) الاشباہ والنظائر مع الحموی: ۳۶۸/۸، باب الفن السابع، الحکایات والمرسلات۔

من صلى صلاتنا ، واستقبل قبلتنا ، وأكل ذبيحتنا فذلك المسلم الذى له ذمة الله وذمة رسوله فلا تخفروا الله فى ذمته . (۱)

جس کسی نے ہماری طرح نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کیا، ہمارے ذبیحہ کو کھایا تو یہ ایسا شخص مسلمان ہے جس کو اللہ اوراس کے رسول نے اپنے ذمہ میں لے لیا ہے؛ لہٰذا تم لوگ اللہ کواس کے ذمہ کے سلسلہ میں بدعہد نہ کرو۔

خود حضرت انس رضی اللہ عنہ نے ایک صاحب کے سوال کا جواب دیتے ہوئے فرمایا :

من شهد أن لا إله إلا الله واستقبل قبلتنا ، صلى صلاتنا ، وأكل ذبيحتنا ، فهو المسلم ، له ماللمسلم وعليه ما على المسلم . (۲)

جو شخص اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں ، ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرتا ہے، ہماری طرح نماز پڑھتا ہےتو وہ مسلمان ہے،اس کے لئے وہ حقوق ہیں جو دیگر مسلمانوں کے لئے ہیں اوراس پر وہ فرائض عائد ہوں گے جو دیگر مسلمانوں کے لئے ہیں اوراس پر وہ فرائض عائد ہوں گے جو دیگر مسلمانوں پر عائد ہوتے ہیں۔

اسی حدیث کو بنیاد بنا کر امام عبدالوہاب شعرانی نے اپنی معروف کتاب ''الیواقیت والجواہر'' میں فرقِ ضالہ پر گفتگو کرتے ہوئے کہا ہے :

لا يكفر أحد من المذاهب الإسلامية لأن رسول الله صلى الله عليه وسلم قال : من صلى صلاتنا واستقبل قبلتنا ، وأكل ذبيحتنا فله ما لنا وعليه ما علينا . (۳)

کسی بھی اسلامی مسلک کی تکفیر نہیں کی جاسکتی ؛ کیوں کہ نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے : ''جو ہماری طرح نماز پڑھے ، ہمارے قبلہ کی طرف رُخ کرے ، ہمارے ذبیحہ کو کھائے تو اس کے وہ حقوق ہوں گے جو ہمارے ہیں اوراس پر وہ فرائض عائد ہوں گے جو ہم پر عائد ہیں۔

---

(۱) بخاری، کتاب الصلاۃ، باب فضل استقبال القبلۃ، حدیث نمبر:۳۹۱۔

(۲) بخاری، کتاب الصلاۃ، باب فضل استقبال القبلۃ، حدیث نمبر:۳۹۳۔

(۳) الیواقیت والجواہر:۱۲۵/۲، مبحث:۵۸۔

اس سلسلہ میں یہ بات قابل ذکر ہے کہ صحابہ کرام ﷺ کے اخیر دور میں ہی ان مختلف فرقوں کا ظہور ہو چکا تھا، جن کو راہِ حق سے منحرف سمجھا گیا؛ لیکن صحابہ نے ان کو کافر کہنے میں یا ان پر کفر کا حکم لگانے میں احتیاط سے کام لیا، سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے عہد میں خوارج کا ظہور ہوا، یہ اس عہد کے صحابہ کے ان دونوں گروہوں کی تکفیر کرتے تھے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ تھے، یا ان کے مخالف تھے؛ لیکن حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان پر کفر کا حکم لگانے میں احتیاط برتی؛ البتہ فرمایا کہ اگر وہ فساد مچائیں گے تو ہم ان سے جہاد کریں گے، پھر آپ رضی اللہ عنہ نے ان سے جہاد فرمایا اور جہاد میں فتح یاب بھی ہوئے؛ لیکن مفتوحین اور ان کے اموال کے ساتھ وہ معاملہ نہیں کیا جو غیر مسلموں کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی آپ نے ان کی خواتین کو باندی اور ان کے مال کو مالِ غنیمت کا درجہ نہیں دیا۔

بعد کے فقہاء کے یہاں بھی اس کی مثال ملتی ہیں، اہل سنت والجماعت، معتزلہ اور مرجیہ کے درمیان بڑی کشمکش رہی، اس کشمکش نے بعض اوقات اربابِ اقتدار کو بھی متاثر کیا اور حکومت کے سہارے فریق مخالف کو تکلیف پہنچانے کی کوششیں بھی کی گئیں؛ لیکن معتزلہ اور مرجیہ کو صریحاً کافر کہنے سے احتیاط برتی گئی، اسی طرح خود اہل سنت میں اشاعرہ، ماتریدیہ اور حنابلہ کے درمیان سخت اعتقادی اختلافات رہے اور اس کا اثر رجال سے متعلق محدثین کی آراء پر بھی پڑا؛ لیکن ایک دوسرے کی تکفیر سے ہر ایک نے اجتناب کیا، اسی طرح اہل تشیع کے بارے میں فقہاء متقدمین کا عام نقطۂ نظر یہی رہا کہ جو لوگ تحریفِ قرآن کے قائل نہیں ہیں ان کی تکفیر نہیں کی جائے گی؛ چنانچہ امام عبدالوہاب شعرانی نے معتزلہ، نجاریہ، روافض اور مشبہہ وغیرہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ سب مسلمان ہیں، ان پر کفر کا حکم نہیں لگایا جاسکتا، اس سلسلہ میں انھوں نے شیخ ابوطاہر قزوینی کے حوالہ سے کہا ہے کہ :

> **هم من أهل الإجابة بلا شک ، فمن سماهم كفرة فقد ظلم وتعدى .** (۱)
>
> ان لوگوں کا شمار ''اہل الاجابۃ'' (ماننے والوں) میں ہوتا ہے؛ لہٰذا اگر کوئی ان لوگوں کو کافر کہتا ہے تو وہ زیادتی کرتا ہے۔

علامہ ابن حزم ظاہری نقل کرتے ہیں :

> **...... وذهب طائفة إلى أنه لا يكفر ولا يفسق مسلم بقول قاله في اعتقاد أو فتيا ، وإن كل من اجتهد في شيئ من ذلک فدان بما رأى أنه الحق ، فإنه ماجور على كل حال ، إن أصاب فأجران وإن أخطأ فأجر واحد ، قال : وهذا قول ابن أبي ليلى وأبي حنيفة والشافعي وسفيان الثوري وداود بن علي ، وهو قول كل من عرفنا له قولان في**

(۱) الیواقیت والجواہر: ۱۲۵/۲، مبحث: ۵۸۔

ھذہ المسألة من الصحابة رضی اللہ عنھم لا نعلم منھم خلافاً فی ذلک اصلاً . (۱)

کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ کسی بھی مسلمان کو اس کے کسی قول یا فتویٰ کے سبب کافر یا فاسق قرار نہیں دیا جاسکتا، ہر وہ شخص جو کسی مسئلہ میں اجتہاد کرتا ہے اور پھر وہ جس بات کو حق اور درست سمجھتا ہے اسی کو اختیار کر لیتا ہے تو اسے بہر حال اجر ملے گا، اگر اس نے صحیح اجتہاد کیا تو اسے دو اجر ملیں گے اور اگر اجتہاد کرنے میں اس سے غلطی ہو گئی تو ایک اجر ملے گا، وہ کہتے ہیں کہ یہ ابن ابی لیلیٰ، ابوحنیفہؒ، شافعیؒ، سفیان ثوریؒ اور داؤد بن علی کا قول ہے، جن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے بھی اس مسئلہ میں دو اقوال مروی ہیں ان کا بھی یہی قول ہے، ہمیں اس مسئلہ میں ان میں سے کسی کے اختلاف کا بھی علم نہیں۔

امام ابوالحسن اشعری کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے اپنی وفات کے وقت کہا :

أشھدوا علی أننی لا أکفر أحداً من أھل القبلة بذنب ، لانی رأیتھم کلھم یشیرون إلی معبود واحد والاسلام یشملھم ویعمھم . (۲)

تم سب میرے بارے میں گواہ رہنا کہ میں کسی بھی اہل قبلہ کو کسی گناہ کے سبب کافر قرار نہیں دیتا؛ کیوں کہ میں نے ان تمام ہی لوگوں کو ایک ہی معبود کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، یہ سب ہی دین اسلام کے متبع ہیں۔

امام شافعیؒ کا قول منقول ہے :

لا أکفر أھل التاویل المخالف للظاھر بذنب . (۳)

میں تاویل کرنے والے کو جو ظاہر کی مخالفت کرتا ہے کسی گناہ کے سبب کافر قرار نہیں دیتا۔

اسی طرح شوافع قریب قریب اس بات پر متفق ہیں کہ خوارج کی تکفیر نہیں کی جائے گی۔(۴)

علامہ ابن عابدین شامیؒ خوارج کے بارے میں رقمطراز ہیں :

وحکم الخوارج عند الجمھور وأھل الحدیث حکم البغاة ...... وذھب بعض أھل الحدیث إلی کفرہ ، ...... قال ابن المنذر : ولا أعلم أحداً وافق أھل الحدیث علی تکفیرھم ، قال : وھذا یقتضی

---

(۱) الملل والنحل: ۳/۳۹۱، مع تحقیق: د، ابراہیم نصر۔ (۲) الیواقیت للشعرانی: ۲/۱۲۶، مبحث: ۵۸۔

(۳) الیواقیت للشعرانی: ۲/۱۲۶، مبحث: ۵۸۔ (۴) دیکھئے: الصواعق المحرقة: ۱۵۲، لابن الحجر الھیتمی۔

نقل إجماع الفقهاء على عدم تكفير الخوارج ، وقد ذكر في المحيط ان بعض الفقهاء لا يكفر أحداً من أهل البدع ، بعضهم يكفر من خالف منهم ببدعته دليلا قطعياً ونسبه إلى أكثر أهل السنة ، والنقل الأول أثبت ، نعم ، يقع في كلام أهل المذهب تكفير كثير ؛ لكن ليس من كلام الفقهاء الذين هم المجتهدون بل من غيرهم ، ولا عبرة بغير الفقهاء ، والمنقول عن المجتهدين ما ذكرنا ، وابن المنذر أعرف بنقل المجتهدين . (۱)

جمہور علماء اور محدثین خوارج کو باغیوں کے حکم میں شامل کرتے ہیں......بعض محدثین نے تو انھیں کافر گردانا ہے......ابن المنذر کہتے ہیں مجھے نہیں معلوم کہ کسی نے بھی خوارج کی تکفیر کے سلسلہ میں محدثین کی رائے سے موافقت کی ہو، وہ کہتے ہیں اس کا تقاضہ ہے کہ خوارج کی عدم تکفیر پر فقہاء کا اجماع نقل کیا جائے، محیط میں یہ بات مذکور ہے کہ بعض فقہاء کسی بھی بدعتی کو کافر قرار نہیں دیتے ہیں ؛ البتہ بعض فقہاء ایسے بدعتیوں کو کافر قرار دیتے ہیں جو کسی دلیل قطعی کی مخالفت کرتے ہیں، صاحب محیط نے اس قول کو اکثر محدثین کی طرف منسوب کیا ہے، پہلی بات جو نقل کی گئی ہے وہ زیادہ صحیح ہے، ہاں اہل مذہب کی تحریروں میں تکفیر بہت پائی جاتی ہے ؛ لیکن فقہاء (جو کہ مجتہد ہوتے ہیں) کی تحریروں میں ایسی چیز نہیں پائی جاتی اور فقہاء کے بغیر کسی چیز کا اعتبار نہیں کیا جاسکتا، مجتہدین سے وہ بات منقول ہے جس کا ذکر ہم کر چکے ہیں، ابن المنذر مجتہدین کی منقولات سے اچھی طرح سے واقف ہیں۔

انبیاء کرام کے بعد سب سے قدسی صفت گروہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ہے، جن کے ذریعہ پوری دنیا میں اسلام کی روشنی پہنچی اور جو براہ راست رسول اللہ ﷺ کی تربیت سے فیض یاب ہوئے ؛ لیکن اس کے باوجود تکفیر کے معاملہ میں علماء اس درجہ محتاط رہے ہیں کہ علامہ شامیؒ نے لکھا ہے کہ سبِّ صحابہ کے مرتکب ہونے والے پر بھی کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جائے گا؛ چنانچہ فرماتے ہیں :

يحكم فيه قاطعاً باسلام من يتاول في سب الصحابة مصرحاً بان القول بتكفير المتأولين بذلك مخالف لإجماع مناقض لما في

---

(۱) ردالمحتار:۶/۴۱۳۔

متونهم وشروحهم ، وإن ماوقع في كلام أهل المذهب من تكفيرهم ليس من كلام الفقهاء الذين هم المجتهدون ، بل من غيرهم ، قال : ولا عبرة بغير الفقهاء والمنقول عن الفقهاء ما ذكرناه . (۱)

جو شخص سبِّ صحابہ کا مرتکب ہوتا ہے اس پر بھی اسلام کا ہی حکم لگایا جائے گا، سبِّ صحابہ کے مرتکب شخص کی تکفیر کا قول اجماعِ صحابہ کے مخالف اور ان کی متون وشروح کے مغائر ہے، اہل مذہب نے ایسے لوگوں کو کافر قرار دیا ہے؛ لیکن یہ فقہاء (جو کہ مجتہد ہوتے ہیں) کا قول نہیں ہے؛ بلکہ دیگر لوگوں کا ہے، فقہاء کے علاوہ کا اعتبار نہیں ہے اور فقہاء سے وہ بات منقول ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں۔

اسی طرح علامہ شامیؒ شرح منیۃ المصلی کے حوالہ سے فرماتے ہیں :

إن ساب الشيخين ومنكر خلافتهما ممن بناه على شبهة له يكفر ، بخلاف من ادعى أن عليا إله وأن جبريل غلط ، لأن ذلك ليس من شبهة واستفراغ وسع في الاجتهاد بل محض هوى . (۲)

شیخین (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ) کو سبّ وشتم کرنے والا اور ان کی خلافت کا انکار کرنے والا چوں کہ ایک شبہ کی بنیاد پر ایسا کرتا ہے؛ لہٰذا اس کو کافر نہیں قرار دیا جائے گا؛ البتہ اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ الٰہ ہیں، حضرت جبرئیل علیہ السلام سے غلطی ہوگئی تھی تو ایسے شخص کو کافر قرار دیا جائے گا؛ کیوں کہ یہ بات شبہ کی بنیاد پر نہیں کہی جا سکتی اور نہ ہی اس مسئلہ میں اجتہاد کرنے کی گنجائش ہے، تو یہ محض اپنی خواہش نفس کی اتباع ہے۔

اسی کی نظیر ہمیں خود عہد صحابہ میں بھی ملتی ہے؛ چنانچہ قاضی عیاض نے کتاب الشفا کے پہلے باب کی چوتھی قسم میں نقل کیا ہے :

إن رجلا سبّ أبا بكر بمحضر منه ، فقال له أبوبرزة الأسلمي : يا خليفة رسول الله ! دعني اضرب عنقه ، فقال : اجلس ليس ذلك لأحد إلا لرسول الله صلى الله عليه وسلم . (۳)

---

(۱) ردالمحتار: ۳/۲۹۳۔ (۲) ردالمحتار: ۶/۴۱۳۔

(۳) الشفاء للقاضی عیاض: ۲/۴۹۲-۴۹۱۔

ایک شخص نے حضرت ابوبکرؓ کو ان کی موجودگی میں سبّ وشتم کیا تو ان سے حضرت ابو برزہ الاسلمی نے کہا، اے خلیفۂ رسول! مجھے اجازت دیں کہ میں اس کی گردن اُڑا دوں، حضرت ابوبکرؓ نے کہا بیٹھ جاؤ، یہ حق نبی کریم ﷺ کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔

اسی طرح روایت کیا گیا ہے کہ :

إن عامل عمر بن عبد العزيز بالكوفة استشاره في قتل رجل سب عمرؓ ، فكتب إليه : لا يحل قتل أمر ء مسلم بسب أحد من الناس إلا رجلا سبّ رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فمن سبه فقد حل دمه . (۱)

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کی جانب سے کوفہ میں مقرر کردہ گورنر نے ان سے ایک ایسے شخص کو قتل کرنے کے سلسلہ میں مشورہ کیا جس نے حضرت عمرؓ کو گالی دی تھی، حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے انھیں لکھ بھیجا کہ کسی بھی مسلمان کو اس وجہ سے قتل کرنا کہ اس نے کسی شخص کو سبّ وشتم کیا ہے، درست نہیں ہے؛ الا یہ کہ کوئی شخص نبی کریم ﷺ کو سبّ وشتم کرے، اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو اس کا خون حلال ہو جاتا ہے۔

فقہاء نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ جس بات کے کفر ہونے پر اتفاق نہ ہو، اس کی بنیاد پر کفر کا فتویٰ نہیں لگایا جا سکتا ہے؛ چنانچہ علامہ حصکفیؒ فرماتے ہیں :

واعلم أنه لا يفتى بكفر مسلم أمكن حمل كلامه على محمل حسن ، أو كان في كفره خلاف ولو كان ذلك رواية ضعيفة . (۲)

یہ بات جان لیں کہ ایسے مسلمان کو کافر قرار دینا درست نہیں ہے جس کی گفتگو کو کوئی اچھا مفہوم دیا جا سکتا ہے یا اس کی گفتگو ایسی ہو جس کے کفر ہونے میں اختلاف ہو؛ اگرچہ اس سلسلہ میں کوئی ضعیف روایت ہی کیوں نہ ہو۔

موجودہ دور میں علماء کی توجہ دعوتِ اسلام کی طرف سے تو ہٹ گئی اور مسلمان بنانے کا جو فریضہ ان پر عائد ہوا تھا، اس سے تو انھوں نے منھ موڑ لیا؛ لیکن مسلمانوں کو کافر کہنے میں وہ بہت تیز دست ہو گئے، اہل سنت اور اہل تشیع نے ایک دوسرے کو کافر کہا، بعض مقلدین نے سلفی حضرات پر کفر کا فتویٰ لگایا اور سلفی حضرات نے مقلدین کو —— جو اُمت کا سوادِ اعظم ہیں —— مشرک قرار دیا، ہندوستان میں یہی صورت حال دیو بندیوں اور بریلویوں کے درمیان پیش آئی، یہاں تک کہ مختلف مسلم تنظیمیں جو دعوت واصلاح کے لئے اُٹھی تھیں، وہ بھی ایک دوسرے کو گمراہ کہنے پر کمر بستہ ہیں۔

---

(۱) الشفاء للقاضی عیاض: ۴۹۲/۲-۴۹۱۔ (۲) درمختار مع الرد: ۲۲۴/۴۔

علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ مخالف نقطۂ نظر کے حاملین پر کفر کا حکم لگانے سے احتراز کریں اور جب تک کہ کسی گروہ کے بارے میں یہ بات ثابت نہ ہوجائے کہ وہ قطعیات دین اور ضروریاتِ دین کے منکر ہیں، اس وقت تک تکفیر سے پوری طرح گریز کریں؛ کیوں کہ مسلمان یا کافر سمجھنے کا تعلق صرف زبان کے بول سے ہی نہیں ہے؛ بلکہ برتاؤ اور سلوک سے بھی ہے اور برادرانہ برتاؤ اور سلوک کے ذریعہ ہی تعلقات استوار ہوتے ہیں اور رواداری کے جذبات پروان چڑھتے ہیں۔

(۲) دوسری اہم بات یہ ہے کہ شریعت نے کچھ اختیارات ''اولی الامر'' سے متعلق کئے ہیں، جیسے جہاد 'اولی الامر' کے حکم سے ہوگا، قصاص 'اولی الامر' کے حکم سے نافذ کیا جائے گا، حدود 'اولی الامر' کے حکم سے جاری کی جائیں گی، ان اُمور کو لوگ اپنے طور پر انجام نہیں دے سکتے؛ چنانچہ عہد صحابہ میں بھی اور اس کے بعد بھی ہمیشہ یہ اُمور امراء وسلاطین کے واسطہ سے انجام پاتے رہے ہیں، یہاں تک کہ بعض فقہاء نے تو جمعہ وعیدین کے قیام کو بھی 'اذن سلطان' سے متعلق کیا ہے، مسلمانوں کو یہ بات سمجھانے کی ہے کہ عام مسلمان ایسے مسائل کو اپنے ہاتھ میں نہ لیں، جو 'اولی الامر' کے لئے خاص ہیں، مسلم ممالک میں وہاں کی حکومتیں اولی الامر ہیں اور غیر مسلم ریاستوں میں وہاں کے مسلمانوں پر واجب ہے کہ اجتماعی مسائل کے لئے کسی مسلمان کی قیادت پر جمع ہوجائیں اور دارالکفر میں مسلمانوں سے شریعت کے جو احکام متعلق ہیں، ان میں ان کی ہدایت پر عمل کریں؛ چنانچہ فتاویٰ بزازیہ میں ہے :

> **وأما البلاد التی علیها ولاة کفار ، فیجوز فیها أیضاً إقامة الجمع والاعیاد والقاضی قاض بتراضی المسلمین ویجب علیهم طلب وال مسلم . (۱)**
>
> جن ریاستوں کے اولی الامر کفار ہوں وہاں بھی جمعہ وعیدین کی نمازیں پڑھنا درست ہے، قاضی مسلمانوں کی رضامندی سے فیصلے کرے گا اور تمام مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ کسی مسلمان حکمراں کی جستجو میں رہیں۔

نیز علامہ ابن ہمامؒ فرماتے ہیں :

> **وإذا لم یکن سلطان ولا من یجوز التقلد منه کما هی فی بعض بلاد المسلمین غلب علیهم الکفار کفر طبة فی بلاد المغرب الآن وبلنسیة وبلاد الحبشة وأقروا المسلمین عندهم علی مال یوخذ منهم ، یجب علیهم أن یتفقوا علی واحد منهم یجعلونه والیاً فیولی قاضیاً ویکون هو الذی یقضی بینهم . (۲)**

---

(۱) فتاویٰ بزازیہ: ۶/۳۱۱۔ (۲) فتح القدیر: ۶/۳۶۵۔

اگر کوئی حکمراں نہ ہو اور نہ ہی کوئی ایسا شخص ہو جس کی تقلید کی جا سکے، جیسا کہ بعض مسلم ملکوں میں ہے تو ایسی صورت میں ان پر کفار غالب آجاتے ہیں، مثلاً مغرب میں قرطبہ بلنسیہ اور حبشہ کے ممالک اور وہ مسلمانوں کو اپنی ریاستوں میں رکھنے کے لئے ان سے کچھ معاوضہ لیتے ہیں، ایسی صورت میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ اپنے درمیان میں سے ہی کسی ایک شخص پر متفق ہو جائیں اور اسے قضا کا عہدہ سونپ دیں؛ لہٰذا وہی ان کے درمیان فیصلے کرے۔

اس سلسلہ میں حضرت عمرؓ کا یہ ارشاد سنہرے حرفوں سے لکھے جانے کے لائق ہے :

لا اسلام إلا بجماعة ، و لا جماعة إلا بامارة ، و لا إمارة إلا بطاعة . (۱)

جماعت کے بغیر اسلام نہیں، امارت کے بغیر جماعت نہیں اور اطاعت کے بغیر امارت نہیں۔

بہت سی دفعہ جب مسلم عوام کسی مرکزی رہنمائی کے بغیر مسئلہ کو اپنے ہاتھ میں لے لیتے ہیں تو اس سے انتشار کی صورت پیدا ہوتی ہے اور فائدہ سے زیادہ نقصان ہو جاتا ہے؛ البتہ امراء مسلمین کا فریضہ ہے کہ وہ قرآن وحدیث کو اپنے لئے رہنما بنائیں، عوام کی مشکلات کو اہمیت دیں اور اپنے اندر خدا کا خوف رکھیں؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا :

فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ . (البقرۃ:۱۹۴)

پس جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر اتنی ہی زیادتی کرو جتنی کہ تم پر کی گئی۔

فَقَاتِلُوْا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ إِلَى أَمْرِ اللهِ. (الحجرات:۹)

تو (تم سب) باغی گروہ سے جنگ کرو یہاں تک کہ وہ اللہ کے فیصلہ کی طرف واپس آجائے۔

اور فقہاء لکھتے ہیں :

من شهر على المسلمين سيفاً وجب قتله . (۲)

جو مسلمانوں پر تلوار سونت لے اس کا قتل واجب ہے۔

لیکن جہاں برسر اقتدار گروہ مسلمان ہو تو گو وہ ظالم ہو یا زور زبردستی کر کے اس نے حکومت پر قبضہ کر لیا ہو، وہ بہر حال مسلمان ہے، اگر ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے سے اُمت کی طاقت ٹوٹتی ہو، انتشار پیدا ہوتا ہو، خون خرابہ کا اندیشہ ہو، تو 'اهون البليتين' کے طور پر صبر وسکوت کا راستہ اختیار کر لینا بہتر ہے، اس کی تائید ان

(۱) مسند الشهاب عن واثلة بن الاسقع، حدیث نمبر:۴۲۹۔ (۲) فتاویٰ ہندیہ:۶/۷۔

احادیث سے ہوتی ہے، جن میں رسول اللہ ﷺ نے فاجر امام کے ساتھ جہاد کرنے اور ان کے پیچھے بھی نماز ادا کر لینے کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا :

الجهاد واجب عليكم مع كل امير براً كان أو فاجراً ، والصلاة واجبة عليكم خلف كل مسلم براً كان أو فاجراً وإن عمل الكبائر . (۱)

تم پر ہر امیر کے ساتھ خواہ وہ نیک ہو یا فاسق وفاجر جہاد واجب ہے، اسی طرح تم پر ہر مسلمان کے پیچھے نماز پڑھنا واجب ہے، خواہ وہ نیک ہو یا فاسق وفاجر اور خواہ وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہو۔

اسی پس منظر میں صحابہ نے حجاج بن یوسف اور یزید بن معاویہ کے پیچھے بھی نماز پڑھی ہے اور ان ظالم وجابر حکمرانوں کے زیر قیادت بھی جہاد کیا ہے، اسی لئے قاضی ابوالحسن ماوردی اور بعض اہل علم نے امارت کی ایک شکل، امارتِ قاہرہ کو بھی بتایا ہے، کہ کوئی شخص ظلم وجبر کے ذریعہ اقتدار حاصل کر لے، تب بھی وہ امیر ہو جائے گا اور امیر کے ذریعہ جو اُمور انجام پاتے ہیں، وہ اس کے ذریعہ انجام پائیں گے، اسی ذیل میں فقہاء نے زکوٰۃ کا مسئلہ لکھا ہے کہ اگر کوئی باغی گروہ کسی علاقہ پر قبضہ کر لے اور اسے زکوٰۃ ادا کر دی جائے تو زکوٰۃ ادا ہو جائے گی :

قوم من الخوارج غلبوا على قوم من أهل العدل واخذوا صدقات السوائم ثم ظهر عليهم الإمام ، لا يحل له أن ياخذ الزكاة ثانيا منهم . (۲)

اگر کچھ خوارج کچھ عادل لوگوں پر غالب آجاتے ہیں اور وہ لوگوں سے جانور کی زکوٰۃ لے لیتے ہیں، پھر ان پر امام غالب آجاتا ہے تو اس کے لئے ان لوگوں سے دوبارہ زکوٰۃ لینا درست نہیں۔

اس لئے ہمیں اُمت کا یہ مزاج بنانا چاہئے کہ جہاں مقابلہ غیر مسلم قابض طاقتوں سے ہو وہاں تو وہ بہ قدر وقدرت وامکان مقابلہ کریں؛ لیکن جہاں مسلمانوں کا گروہ برسر اقتدار ہو وہاں پر امن طریقہ پر اور قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے نصح ومحبت کے ذریعہ اصلاح کا طریقہ کار اختیار کریں، یہ بزدلی یا فرار نہیں ہے؛ بلکہ 'اھون البليتين' کا انتخاب ہے اور یہی ہمارے دین کا مزاج ہے، اس پر رسول اللہ ﷺ کی ان احادیث سے روشنی پڑتی ہے :

حدثنا زيد بن وهب قال : سمعت عبد الله قال : قال لنا رسول الله صلى الله عليه وسلم : إنكم سترون بعدى أثرة وأموراً تنكرونها ، قالوا : فما

---

(۱) ابوداود، كتاب الجهاد، حدیث نمبر: ۲۵۳۳، دار قطني، كتاب العيدين، باب صفة من تجوز الصلاة معه والصلاة عليه، حدیث نمبر: ۱۷۴۶۔ (۲) الفتاویٰ التاتارخانیۃ: ۲؍۲۸۲، نیز دیکھئے: الفتاویٰ الہندیہ: ۱؍۱۹۰۔

تأمرنا یا رسول اللہ ؟ قال : أدوا إلیھم حقوقھم واسألوا اللہ حقکم . (۱)
ہم سے زید بن وہب نے بیان کیا، وہ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عبداللہ کو کہتے ہوئے سنا ہے انھوں نے کہا کہ ہم لوگوں سے نبی کریم ﷺ نے فرمایا: تم لوگ میرے بعد ترجیحات اور چند ایسے اُمور دیکھو گے جسے تم لوگ ناپسند کروگے، صحابہ کرامؓ نے کہا: اے اللہ کے رسول! ایسی صورت حال میں آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ایسے حکمرانوں کے حقوق ادا کرتے رہنا اور اللہ سے اپنا حق مانگنا۔

عن ابن عباس عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال : من کرہ أمیرہ شیئاً فلیصبر ، فإنہ من خرج من السلطان شبراً ، مات میتۃ جاھلیۃ . (۲)
حضرت ابن عباسؓ کہتے ہیں کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: جو شخص اپنے امیر کی جانب سے کوئی ناپسندیدہ امر محسوس کرے تو صبر کرے؛ کیوں کہ کسی نے امیر سے معمولی بغاوت بھی کی تو وہ جاہلیت کی موت مرے گا۔

عن الزبیر بن عدي قال : أتینا أنس بن مالک ، فشکونا إلیہ ما یلقون من الحجاج فقال : أصبروا ، فانہ لا یأتی علیھم زمان إلا والذی بعدہ شر منہ حتی تلقون ربکم ، سمعتہ من نبیکم صلی اللہ علیہ وسلم . (۳)
حضرت زبیر بن عدی فرماتے ہیں کہ ہم لوگ حضرت بن مالکؓ کے پاس آئے اور ان سے حجاج کے رویوں کی شکایت کی تو انھوں نے کہا صبر کرو؛ کیوں کہ اب جو بھی زمانہ آئے گا وہ اپنے سے پہلے والے زمانہ سے زیادہ خراب ہوگا، (یہ سلسلہ چلتا رہے گا) یہاں تک کہ تم اپنے رب سے جاملو، میں نے یہ بات تمہارے نبی ﷺ سے سنی ہے۔

(۴) یہ بات ممکن نہیں ہے کہ تمام مسلمانوں کو ایک رائے اور ایک فکر بنادیا جائے، ان میں نقطۂ نظر کا اختلاف رہا ہے اور باقی رہے گا؛ کیوں کہ قرآن وحدیث میں بہت سے مضامین ایسے اجمال وابہام کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں کہ ان میں ایک سے زیادہ معنوں کی گنجائش ہے، اسی طرح بہت سے اُمور وہ ہیں جن کی نصوص میں صراحت نہیں ہے اور وہ قیاس واجتہاد پر مبنی ہیں، اجتہاد کا تعلق جہاں نصوص سے ہے، وہیں انسان کی قوت فکر اور تعقل سے بھی ہے اور اللہ تعالیٰ نے عقل وذوق کا اختلاف رکھا ہے، اسی اختلافِ ذوق ونظر سے کائنات کی رنگارنگی قائم ہے، اس لئے

---

(۱) بخاری، کتاب الفتن، حدیث نمبر: ۷۰۵۲۔ (۲) بخاری، کتاب الفتن، حدیث نمبر: ۷۰۵۳۔
(۳) بخاری، کتاب الفتن، حدیث نمبر: ۷۰۶۸۔

جواُموراجتہاد پر ہوں گے،ان میں عام طور پرضرور ہی اختلاف رائے پیدا ہوگا،اس لئے نہ اختلاف رائے کوروکا جاسکتا ہے اور نہ اس سے گھبرانا چاہئے،ایک صاحب علم کے یہ قول:''**اختلاف العقول ثراء واختلاف القلوب وباء**''۔

سلف صالحین اختلاف رائے کو اسی نظر سے دیکھا کرتے تھے؛ چنانچہ علامہ ابن تیمیہ نے اختلاف اُمت کے سلسلہ میں بعض علماء کا قول نقل کیا ہے :

إجماعهم حجة قاطعة ، واختلافهم رحمة واسعة . (۱)

اُمت کے علماء کا اجماع حجت قطعیہ ہےاوران کا اختلاف وسیع رحمت کا باعث ہے۔

حضرت عمرابن عبدالعزیزؒ کا قول مشہور ہے :

ما أحب أن أصحاب رسول الله صلى الله عليه وسلم لم يختلفوا ؛ لأنهم لو كانوا قولا واحدا كان الناس فى ضيق ، وإنهم أئمة يقتدىٰ بهم ، فلو أخذ رجل بقول أحدهم كان فى سعة . (۲)

میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ صحابہ کرام ﷺ کے درمیان اختلاف نہ ہو؛ کیوں کہ اگر وہ سب ایک ہی قول کو اختیار کریں تو یہ لوگوں کے لئے تنگی و پریشانی کا سبب ہوگا ، یہ قابل تقلید ائمہ ہیں،اگرکوئی کسی ایک کےقول کوبھی اختیار کرلیتا ہےتو وہ وسعت میں رہتا ہے۔

حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ ہی کے ایک ہم عصرعون ابن عبداللہ سے نقل کیا گیا ہے :

ما أحب أن أصحاب محمد لم يختلفوا ، فإنهم لو اجتمعوا على شيئ فتركه رجل ، ترك السنة ، ولو اختلفوا فأخذ رجل بقول أحد أخذ بالسنة . (۳)

میں یہ نہیں چاہتا کہ صحابہ کرام ﷺ کے درمیان اختلاف نہ ہو؛ کیوں کہ اگر یہ حضرات کسی ایک نقطہ پر متفق ہوجائیں اور پھر کوئی شخص اس پر عمل نہ کرے تو وہ ترکِ سنت کا مرتکب ہوگا اور اگر ان کے درمیان اختلاف ہو اور پھر کوئی شخص ان میں سے کسی ایک کے قول پر بھی عمل کرتا ہے تو وہ سنت پر عمل کرنے والا قرار دیا جائے گا۔

اسی لئے فقہاء کا مزاج یہ تھا کہ جن مسائل میں اختلاف رائے کی گنجائش ہوتی ، ان میں دوسروں کو اپنی رائے پر مجبور نہیں کرتے ،جیسا کہ سفیان ثوریؒ کا قول ہے :

وإذا رأيت الرجل يعمل العمل الذى قد اختلف فيه وأنت ترى غيره فلا تنهه . (۴)

---

(۱) فتاویٰ ابن تیمیه:۸۰/۳۰۔ (۲) ادب الاختلاف فی مسائل العلم والدین للشیخ عوامه:۳۰۔

(۳) سنن الدارمی ، باب اختلاف الفقهاء:۱۵۱/۱۔ (۴) الفقيه والمتفقه:۲/۳۲۳۔

اگر کسی اختلافی مسئلہ میں تم کسی کو ایسا عمل کرتے ہوئے دیکھو جسے تم درست نہ سمجھتے ہو تو اسے اس عمل کے کرنے سے نہ روکو۔

امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے :

قولنا هذا رأى ، وهو أحسن ما قدرنا عليه ، فمن جاء نا بأحسن من قولنا فهو أولٰى بالصواب منا . (۱)

ہمارا یہ قول ایک رائے ہے، یہ ہماری کوشش کے مطابق سب سے اچھی رائے ہے، اگر کوئی ہماری رائے اور قول سے اچھی رائے اور قول پیش کرتا ہے تو وہ ہماری رائے اور قول سے زیادہ صحت کا مستحق ہے۔

اسی طرح امام اوزاعیؒ فرماتے ہیں :

قال الأوزاعى فى الذى يقبل امرأته : إن جاء ليسألنى قلت : يتوضأ ، وإن لم يتوضأ لم أعب عليه . (۲)

امام اوزاعی کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اپنی بیوی کو بوسہ دیا اور پھر میرے پاس اس سے متعلق سوال پوچھنے آتا ہے تو میں اس سے کہوں گا کہ وہ وضو کرلے اور اگر وہ وضو نہیں کرتا ہے تو میں اس پر عیب بھی نہیں لگاؤں گا۔

اختلافِ فکر کے باوجود اہل علم ایک دوسرے سے استفادہ بھی کرتے تھے، مثلاً اہل سنت والجماعت کے نزدیک سب سے مستند مجموعۂ حدیث صحیح بخاری ہے، اس کے مؤلف نے جن حضرات سے روایتیں لی ہیں، ان میں ۸۰ سے زیادہ ان فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، جن سے اہل سنت والجماعت کا سخت اختلاف تھا، ان میں پندرہ مرجیہ، سات ناصبیہ، چھتیس شیعہ، اُٹھائیس قدریہ اور خوارج اور کچھ دوسرے فرقوں سے تعلق رکھتے ہیں، علامہ سیوطی نے تدریب الراوی میں تفصیل سے نام بہ نام ان کا ذکر کیا ہے۔(۳)

علامہ جاراللہ زمخشری سے بڑھ کر قرآن کی بلاغت اور زبان وادب سے آشنا کون ہوگا، سب جانتے ہیں کہ یہ غالی معتزلی تھے اور اہل سنت کے سخت ناقد؛ لیکن اہل سنت کی کتابوں میں ان کا ذکر نہایت احترام کے ساتھ کیا جاتا ہے اور بہت سے لوگ ان کے نام کے ساتھ ان کا لقب، جاراللہ بھی لکھتے ہیں؛ حالاں کہ ان کا یہ لقب کثرت عبادت کی وجہ سے بہ طور مدح کے تھا، اسی طرح امام راغب اصفہانی صاحب مفردات القرآن بھی معتزلی ہیں اور راغب اصفہانی کے بعد آنے والا شاید ہی کوئی اہل سنت کا مفسر ہو، جس نے مفرداتِ قرآن میں ان کی تحقیق سے فائدہ نہ اُٹھایا ہو۔

---

(۱) تاریخ بغداد: ۳۵۲/۱۳۔ (۲) التمہید: ۱۷۲/۲۱، ونحوہ فی ''الاستذکار'': ۳۲۳/۱۔ (۳) دیکھئے: تدریب الراوی: ۲۷۸-۲۸۰۔

اگر اس نقطۂ نظر سے معلومات جمع کی جائیں اور علماء اسلام کے مختلف گروہوں کے ایک دوسرے سے افادہ واستفادہ کے واقعات نقل کئے جائیں تو ایک طویل کتاب ہوسکتی ہے اور یہ واقعی ایک ایسا موضوع ہے جس پر علماء کو کام کرنا چاہئے؛ لیکن افسوس کہ بڑھتے ہوئے فاصلے اور شدت پسندی کا رجحان ہمیں اس جہت میں سوچنے کا موقع نہیں دیتا۔

(۵) رسول اللہ ﷺ نے پوری اُمت کو جسدِ واحد قرار دیا ہے :

مثل المومنين في توادهم وتراحمهم وتعاطفهم مثل الجسد ، إذا اشتكى منه عضو تداعى له سائر الجسد . (۱)

باہمی جذبہ رحم، محبت اور مودت میں مومن کی مثال جسم کی طرح ہے کہ اگر جسم کے ایک حصہ کو تکلیف پہنچتی ہے تو سارا جسم تڑپ اُٹھتا ہے۔

قبائل اور نسلیں محض انسان کے تشخص کی شناخت کے لئے ہیں، یعنی تعارف کے لئے ہیں، نہ کہ تفاخر کے لئے؛ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے :

يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِّن ذَكَرٍ وَأُنثٰى وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوْباً وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِندَ اللهِ أَتْقَاكُمْ . (الحجرات:۱۳)

اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت کے ملاپ سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمہیں قوموں اور قبیلوں میں اس لئے بانٹ دیا ہے؛ تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک اللہ کے نزدیک تم میں سے سب سے معزز وہ ہیں جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہیں۔

آپ ﷺ نے صاف ارشاد فرمادیا کہ رنگ ونسل اور علاقہ وزبان کی بنیاد پر ایک شخص کو دوسرے شخص پر فضیلت حاصل نہیں ہے؛ بلکہ فضیلت کا معیار تقویٰ ہے: "**لا فضل لعربي على عجمي ولا لعجمي على عربي ، ولا لأحمر على أسود ، ولا لأسود على أبيض ، إلا بالتقوى ، ان اكرمكم عند الله اتقاكم**" (۲)؛ لیکن افسوس کہ آج مسلمانوں نے اپنے آپ کو چھوٹے چھوٹے گروہوں میں تقسیم کرلیا ہے، نسلی، لسانی تعصّبات، عرب وعجم کے جھگڑے اور ان جغرافیائی ٹکڑوں کی بنا پر پیدا ہونے والی تنگ نظری، جن کو خدا کے ہاتھوں نے نہیں کھینچا ہے، خود انسانوں نے بانٹا ہے، اُمتِ مسلمہ کی آفاقیت کو تار تار کردیا ہے اور اس چیز نے اس کو ایسا بے وزن بنادیا ہے کہ وہ دنیا کی مختلف قوموں کے لئے لقمہ تر بن چکی ہیں، ان کا خون پانی سے زیادہ سستا ہے اور ان کی عزت وآبرو کی کوئی قیمت نہیں ہے؟

---

(۱) مسند احمد: ۳۶۹/۴، حدیث نمبر: ۱۸۳۴۰/۳۲، مسلم، کتاب البر والصلۃ والأدب، باب تراحم المومنین وتعاطفہم وتعاضدہم، حدیث نمبر: ۲۵۸۶۔ (۲) مسند أحمد: ۲۳۸۹، عن رجل من أصحاب النبی ﷺ، وشعب الایمان: ۴۷۷/۴، عن جابرؓ۔

اس عصبیت جاہلیہ کا مقابلہ کرنے اور مسلمانوں کو اس سے بچانے میں علماء، مذہبی قائدین اور مسلمان مفکرین نہایت اہم کردار ادا کر سکتے ہیں۔

(۶) ہمیں مسلمانوں کے درمیان مختلف مکاتبِ فکر کے درمیان انضمام کے بجائے اشتراک پیدا کرنے کی کوشش کرنی چاہئے، اسلام نے تو غیر مسلموں کے ساتھ بھی مشترکہ قدروں پر اتفاق کر کے اشترکِ عمل کا حکم دیا ہے؛ چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

> قُلْ یَا أَھْلَ الْکِتَابِ تَعَالَوْا إِلٰی کَلَمَةٍ سَوَاءٍ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللّٰہَ وَلَا نُشْرِکَ بِهٖ شَیْئاً وَلَا یَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضاً أَرْبَاباً مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوْا اشْھَدُوْا بِأَنَّا مُسْلِمُوْنَ . (آل عمران:۶۴)
>
> آپ کہہ دیجئے کہ اے اہل کتاب! آؤ ایک کلمہ پر جمع ہو جائیں جس میں ہم اور تم برابر ہیں، وہ یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنائیں اور ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا معبود نہ بنائے، پس اگر وہ اعراض کریں تو (مسلمانو) تم کہہ دو! گواہ رہو کہ ہم مسلمان ہیں۔

اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان مشترک کلمہ صرف عقیدۂ توحید ہے اور اس میں بھی اہل کتاب کا عقیدۂ توحید خالص نہیں تھا، بہت سے یہود حضرت عزیر کو ابن اللہ مانتے تھے اور عیسائیوں کی اکثریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو، اس کے باوجود قرآن مجید نے انھیں اشتراکِ عمل کی دعوت دی، مسلمانوں کے مختلف مذاہب اور فرقوں کے درمیان کلمہ مشترک کا دائرہ بہت وسیع ہے، اللہ تعالیٰ کی وحدانیت محمد رسول اللہ ﷺ کی رسالت، قرآن کی حقانیت، بنیادی فرائض وواجبات، مستحبات اور محرمات میں یکسانیت، زندگی سے متعلق تقریباً ۸۰ فیصد مسائل میں کسی نہ کسی درجہ میں اتفاق رائے اور کلمہ اور قبلہ کی وحدت یہ تمام باتیں وہ ہیں جو مسلمانوں کو ایک دوسرے جوڑتی ہیں، اس لئے ضروری ہے کہ ہم کلمہ توحید کی بنیاد پر پوری اُمت کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کریں اور اسلام کی حفاظت و مدافعت اور اس کے غلبہ وظہور نیز پوری دنیا کے مسلمانوں کی صیانت کے لئے مشترکہ پروگرام بنائیں اور مختلف حلقوں سے اس اُمت میں افتراق پیدا کرنے کی جو کوششیں کی جارہی ہیں، ان سے خود آگاہ رہیں اور عام مسلمانوں کو آگاہ کریں۔

○ ○ ○

علماءِ اُمت کی ذمہ داریاں☆

خالدسیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلىٰ آله وصحبه ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين .

صدرمحترم اور دنیا بھر سے آئے ہوئے علماءکرام!

اس حقیر کو پہلی بار ''**الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین**'' کے اجلاس میں شرکت کا موقعہ مل رہا ہے، اور اس کو میں اپنی بہت بڑی سعادت اور خوش بختی تصور کرتا ہوں، واقعہ ہے کہ علماء کا مقام بھی بہت بلند ہے اور اسی نسبت سے ان کی ذمہ داریاں بھی بہت اہم ہیں، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''کہ زمین میں علماء کی مثال ایسی ہی ہے جیسے آسمان میں ستارے''۔ ''**إن مثل العلماء في الأرض كمثل النجوم في السماء يهتدى بها في ظلمات البر والبحر ، فإذا انطمست النجوم ، أوشک أن تضل الهداة**''(۱) اس حدیث میں علماء کو ستاروں سے تشبیہ دی گئی ہے، اگر ہم وجہ شبہ کو سمجھنے کے لئے قرآن مجید کی طرف رُجوع کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں کے تین بنیادی کام ہیں: پہلا کام یہ ہے کہ وہ آسمان دنیا کے لئے زینت وآرائش کا ذریعہ ہیں: ''**وَزَيَّنَا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيحَ**'' (فصلت:۱۲) دوسرا کام یہ ہے کہ ستارے رات کی تاریکی اور سمندر کی اتھاہ تنہائی میں لوگوں کے لئے رہنمائی کا ذریعہ بنتے ہیں: ''**وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُونَ**'' (النحل:۱۶)، تیسرے: یہ شیطان کے لئے کوڑے ہیں، جوانھیں آسمان کی طرف بڑھنے سے روکتے ہیں: ''**رُجُوماً لِّلشَّيَاطِيْنِ**''۔ (الملک:۵)

اگر اس تشبیہ کے پس منظر میں غور کیا جائے تو علماء کی تین ذمہ داریاں قرار پاتی ہیں: اول یہ کہ وہ اپنے اخلاق وکردار کے اعتبار سے ایسی اعلیٰ سطح پر ہوں کہ اُمت کے لئے زینت قرار پائیں، ان کے اندر داعیانہ مزاج اور پیغمبرانہ

☆ ''الاتحاد العالمی لعلماء المسلمین'' کا ایک اہم اجلاس استنبول (ترکی) میں منعقد ہوا تھا، اس موقع پر جو خطبہ پیش کیا گیا، یہ اس کا اُردو ترجمہ ہے۔

(۱) المسند الجامع:۱۴۸/۴، حدیث نمبر:۱۲۱۶، مسند احمد:۱۵۷/۳، حدیث نمبر:۱۲۶۲۷۔

اخلاق ہوں؛ تاکہ اُمت ان کے گرد جمع ہو سکے، دوسرے: وہ اُمت کے لئے رہنما اور مقتدیٰ ہوں، وہ احکام شریعت کی رہنمائی کریں اور اُمت کو ایمان، اعمال اور اخلاق کے فساد سے بچائیں، تیسرے: وہ اُمت کو ان فکری انحرافات اور تہذیبی اور عملی بے راہ روی سے بچائیں، جو در اصل شیطان کی طرف سے ہے اور جس کو دنیا میں شیطانی طاقتیں قوت پہنچاتی ہیں۔

اس وقت ان تینوں پہلوؤں کی اہمیت بہت بڑھ گئی ہے، علماء اخلاقی پہلو سے اس قدر گر گئے ہیں کہ حکومتیں ان سے اپنے منشاء کے مطابق فتاویٰ حاصل کرتی ہیں، دنیا کے معمولی مفادات کے بدلہ وہ اپنے آپ کو فروخت کرنے کو تیار رہتے ہیں، امام ابوحنیفہؒ، امام احمد بن حنبلؒ اور علامہ ابن تیمیہؒ جیسے سلف صالحین نے اپنے اپنے زمانہ میں جو کردار پیش کیا، آج ان کی حیثیت قصہ پارینہ کی ہو کر رہ گئی ہے، اسی طرح علماء کے ایک بڑے گروہ نے اپنی داعیانہ حیثیت کو فراموش کر دیا ہے، اُمت کی رہنمائی، ان کی اصلاح اور انسانیت کو دین حق کی طرف دعوت دینے کے فریضہ کی طرف ان کی توجہ بہت کم ہوگئی ہے، ان کی زندگی اس طرح گذرتی ہے کہ گویا وہ جامعات اور اداروں کے ملازم ہیں، حالاں کہ وارث انبیاء ہونے کی حیثیت سے اصل میں وہ خدا کے ملازم تھے اور: ''**إِنْ أَجْــرِيَ إِلَّا عَـلَـى اللهِ**'' (یونس: ۷۲) ان کا امتیاز تھا —— اسی طرح آج پوری دنیا میں مسلمانوں کو اخلاقی اقدار سے دور کرنے، ایمانی حمیت سے محروم کرنے، مغربی افکار کا اسیر بنانے اور مغربی تہذیب کو مسلط کرنے کا جو ایجنڈہ نئے عالمی نظام اور گلوبلائزیشن کے نام پر پوری دنیا میں جاری وساری ہے، پوری جرأت اور حوصلہ مندی کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا علماء کا فریضہ ہے اور اس سلسلہ میں عالم اسلام کے علماء کی ذمہ داری زیادہ ہے؛ مگر ہم یہ کہنے کے موقف میں نہیں ہیں کہ علماء واقعی اس فریضہ کو انجام دے رہے ہیں —— اس لئے ان تینوں محاذوں پر کام کرنے اور نئے عزم وحوصلہ کے ساتھ آگے بڑھنے کی ضرورت ہے۔

محترم حضرات! میں اس موقع سے تین اہم نکات کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں:

۱- سلف صالحین اور علماء سابقین کے کام کرنے کے دو طریقے ہوتے تھے: ایک طریقہ مسلم حکومتوں کے غلط اقدامات پر مقاومت کا تھا، جسے رسول اللہ ﷺ نے جہاد قرار دیا ہے: ''**إن أفضل الجهاد كلمة حق عند سلطان جائر**'' (۱)، دوسرا طریقہ مسامحت کا ہے، مسامحت سے میری مراد یہ ہے کہ حکمرانوں سے کہا جائے کہ تخت اقتدار پر آپ ہی متمکن رہیں، ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں؛ لیکن آپ اسلامی مقدسات، اسلامی اقدار اور مسلمانوں کے مفادات کے محافظ بنیں، ہم آپ کے حریف ورقیب نہیں ہیں، ہم آپ کے رفیق اور مؤید ہیں، اس طرح اُن سے اعلاء کلمۃ اللہ کا کام لیا جائے، جیسا کہ امام مالکؒ اور امام ابو یوسفؒ نے عباسی دور میں کیا، حالات کے پس منظر میں یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے، رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا:

(۱) مسند أحمد عن أبي سعيد الخدري، حدیث نمبر: ۱۰۷۱۶۔

كيف أنتم وأئمة من بعدي يستأثرون بهذا الفيئ ، قلت : إذن والذي بعثک بالحق ، أضع سيفي على عاتقي ، ثم أضرب به حتى ألقاک أو ألحقک ، قال : أولا أدلک على خير من ذلک ، تصبر حتى تلقاني. (۱)

نیز وائل حضرمیؓ سے مروی ہے :

سأل سلمة بن يزيد الجعفي رسول الله صلى الله عليه وسلم ، فقال : يا نبي الله ! أرأيت إن قامت علينا أمراء يسألونا حقهم ويمنعونا حقنا فما تأمرنا ؟ فأعرض عنه ، ثم سأله فأعرض عنه ، ثم سأله في الثانية أو في الثالثة ، فجذبه الأشعث بن قيس ، وقال : اسمعوا وأطيعوا فإنما عليهم ما حملوا وعليكم ما حملتم . (۲)

یہ وہی طریقہ ہے جس کی آپ ﷺ نے تلقین فرمائی ، سیدنا حضرت حسن ابن علی رضی اللہ عنہما کا خلافت کے مسئلہ میں صلح کو ترجیح دینا بھی اسی نوعیت کا واقعہ ہے ؛ کیوں کہ مقاومت کی صورت میں ناحق مسلمانوں کی خونریزی ہوتی ہے اور اعداء اسلام کو اس بات کا موقعہ مل جاتا ہے کہ وہ اُمت کے ناپختہ ذہن نوجوانوں کو اپنا آلۂ کار بنائیں اور انھیں اسلام کو بدنام کرنے کا ذریعہ بنائیں : ''**الاتحاد العالمی**'' کو اس بات کی کوشش کرنا چاہئے کہ وہ خود بھی اس طریقۂ کار کو فروغ دے اور دوسرے مسلمانوں کی بھی ان ہی خطوط پر ذہن سازی کرے ۔

۲- دوسری ضروری بات یہ ہے کہ یوں تو اُمت میں اختلاف کے بہت سے اسباب ہیں ؛ لیکن مذہبی اختلاف کی خرابی بہت گہری ہوتی ہیں اور نفرت کے جذبات کو اُبھارنے میں بڑا اہم کردار ادا کرتی ہیں ، اس اختلاف کا منبع علماء ہیں ، یہ تو ممکن نہیں کہ فکری اختلاف ختم ہو جائے اور تمام مکاتبِ فکر ایک دوسرے میں ضم ہو جائیں ، فقہی مسالک کا تنوع باقی نہ رہے ؛ لیکن دو باتیں ممکن ہیں : ایک یہ کہ ہم اختلاف کے باوجود اتحاد کا سبق سیکھیں ، مشترک ایجنڈے پر ایک دوسرے کے ساتھ بیٹھنے کو تیار ہوں اور اُمت کے مشترک مسائل کو مل جل کر حل کریں ، قرآن مجید نے تو اہل کتاب کو بھی مشترک مسائل پر اتحاد کی دعوت دی ہے : ''**قُلْ يا أَهْلَ الْكِتَاب تَعَالَوْا إِلٰى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ**'' (آل عمران : ۶۴) تو کیا مسلمانوں کے درمیان مشترک مسائل پر اتحاد نہیں ہو سکتا ؟ دوسرے : اختلاف رائے کے اظہار میں احتیاط سے کام لیں اور ایک دوسرے کے احترام کو ملحوظ رکھیں ، ہم سلف صالحین کے یہاں دیکھتے

(۱) سنن أبی داود ، باب في قتل الخوارج ، حدیث نمبر : ۴۱۳۲ ۔

(۲) مسلم ، باب في طاعة الأمراء ، حدیث نمبر : ۳۴۳۳ ۔

ہیں کہ اہل سنت کا خوارج اور معتزلہ سے سخت اختلاف رہا؛لیکن اس کے باوجود ان کی تکفیر کرنے سے احتیاط برتی گئی؛ لیکن اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمانوں کا ہر گروہ دوسرے گروہ کی تکفیر پر کمربستہ ہے اور انھیں اپنے ہی مختلف الفکر مسلمان بھائیوں سے بمقابلہ غیر مسلموں کے زیادہ نفرت ہے''**الاتحاد العالمي لعلماء المسلمين**'' کو چاہئے کہ اس کا ایک وفد مختلف ممالک کا دورہ کرے، وہاں مختلف مسلک ومشرب کے علماء اور قائدین کو جمع کرے، ان کے لئے اس ملک کے لحاظ سے مشترک ایجنڈہ مرتب کرے اور انھیں اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ اختلاف رائے کے اظہار میں احتیاط سے کام لیں، اگر علماء کے درمیان اختلاف کی خلیج کم ہوجائے تو اُمت میں خود بخود اختلاف کم ہوجائے گا۔

۳- تیسری ضروری بات یہ ہے کہ علماء کو یہ بات سمجھائی جائے کہ وہ اُمت کے مختلف فرقوں کے درمیان پائے جانے والے اختلافات پر توجہ دینے کی بجائے اعداء اسلام، صہیونی وصلیبی میڈیا اور مستشرقین کی طرف سے اُٹھائے جانے والے سوالات پر توجہ دیں اور کتاب وسنت نیز سلف صالحین کے علمی ورثہ سے استفادہ کرتے ہوئے اسلام کے خلاف پیدا کئے جانے والے شبہات کا نہ صرف بھرپور دفاع کریں؛ بلکہ استشراق کے مقابلہ استغراب کے فن کو وجود میں لائیں، یہودیت، عیسائیت، مغربی افکار، مغربی تہذیب اور مغربی تاریخ کا ناقدانہ مطالعہ کیا جائے اور جدید علمی اُسلوب میں ان کی خامیوں اور کوتاہیوں کو پیش کیا جائے، اس کے لئے اسلامی جامعات میں مستقل شعبہ قائم ہو، نیز اس کام کو اتنی قوت کے ساتھ انجام دیا جائے کہ عالم اسلام اقدامی پوزیشن میں آجائے اور عالم غرب کو دفاعی موقف اختیار کرنا پڑے، یہ اس دور میں اسلام کی حقیقی خدمت ہوگی اور اس طرح علماء اپنے فریضۂ منصبی کو ادا کرسکیں گے۔

میں تنظیم کے سربراہوں کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے ہمیں اس اہم پروگرام میں شرکت کا موقع فراہم کیا، خدا کرے کہ ہمارا یہ جمع ہونا اُمت کی سرفرازی وسربلندی کا ذریعہ بنے۔

واللہ الموفق وھو المستعان، وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین.

○ ○ ○

ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی ترقی ☆

خالدسیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلىٰ آله وأصحابه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين ، أما بعد .

جناب صدر، بزرگانِ محترم، علماء کرام اور دانشوران ذی احترام !اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے قیام پر ۲۰رسال کا عرصہ مکمل ہورہا ہے، اس عرصہ میں اس نے ۱۹رعالمی فقہی سیمینار کئے ہیں، جن میں تقریباً ڈیڑھ سوجدید مسائل پر فقہی نقطۂ نظر سے بحث ہوئی ہے اور تجاویز منظور کی گئی ہیں، ۲۳رورکشاپ، توسیعی خطبات اور تربیتی پروگرام رکھے گئے ہیں، عمومی طور پران کا نفع محسوس کیا گیا ہے، ۸۶رکتابیں اُردو، عربی، انگریزی، ہندی، فارسی، ملیالم، تلگو، بنگلہ اور گجراتی وغیرہ میں شائع کی گئی ہیں اور یہ سب علمی وتحقیقی موضوعات پر ہیں، سب سے اہم بات یہ ہے کہ اکیڈمی نے افرادسازی اور مردم گری پر اول دن سے توجہ دی ہے اور یہ اکیڈمی ہی کی کاوشوں کا اثر ہے کہ ملک میں آج درجنوں نوجوان فضلاء اہم فقہی موضوعات اور نئے مسائل پر تحقیقی کام کررہے ہیں۔

موجودہ سیمینار بھی اکیڈمی کی ایسی ہی کاوشوں کا ایک حصہ ہے، اصطلاحی اعتبار سے تو فقہی موضوعات میں سے نہیں، مگر وسیع تر مفہوم میں ’’فقہ الحیاۃ‘‘ کے موضوع سے مربوط ہے؛ کیوں کہ معاش کے بغیر انسانی زندگی کا تصور نہیں کیا جاسکتا؛ اسی لئے اسلام نے کسبِ معاش کی ترغیب دی ہے اور اس کو بعض دوسرے مذاہب کی طرح تقویٰ اور خداپرستی کے مغائر قرار نہیں دیا۔

معیشت کے سلسلہ میں اگر اسلام کے بنیادی تصور کو واضح کیا جائے تو انھیں چند نکات میں اس طرح بیان کیا جاسکتا ہے :

(الف) زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح معیشت کے بارے میں بھی اسلامی تعلیمات اعتدال پر مبنی ہیں،

☆ ہندوستانی مسلمانوں کی معاشی ترقی کے موضوع پر اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیر اہتمام منعقدہ: ۲۴-۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۹ء سیمینار کا کلیدی خطبہ۔

اسلام نے مال کو''خیر'' (البقرۃ:۲۱۵) اور''فضل الٰہی'' (الجمعہ:۱۰) سے تعبیر کیا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ مال کے حقوق ادا کرتے ہوئے اسے حاصل کرنا اسلام کی نظر میں کوئی مذموم بات نہیں ہے؛ بلکہ مباح اور بعض حالات میں واجب ہے، قرآن مجید میں ۳۲ر مواقع پر تو اُسلوب وتعبیر کے قدرے فرق کے ساتھ صراحتاً زکوٰۃ دینے کی تلقین کی گئی ہے اور صرف ایک آیت میں زکوٰۃ لینے کا ذکر فرمایا گیا ہے، یہ اس بات کی طرف لطیف اشارہ ہے کہ قرآن چاہتا ہے کہ اُمت میں زکوٰۃ دینے والے مرفہ الحال افراد زیادہ ہوں اور زکوٰۃ لینے والے تنگ دست حضرات کم ہوں، اسی کو رسول اللہ ﷺ نے: ''**الید العلیا خیر من الید السفلیٰ**''(۱) سے تعبیر فرمایا ہے اور نماز کے بعد کسب حلال کو اہم ترین فریضہ قرار دیا ہے: ''**کسب الحلال فریضۃ بعد الفریضۃ**'' اس لئے مسلمانوں کی معاشی ترقی کے سلسلہ میں غور کرنا، اس مسئلہ کے لئے منصوبہ بندی کرنا اور اُمت کے پسماندہ لوگوں کو معاشی ترقی کے اعتبار سے اوپر اُٹھانے کی کوشش کرنا ایک مستحسن عمل اور اجتماعی فریضہ ہے۔

(ب) معیشت کے سلسلہ میں اسلام کے بنیادی تصورات میں سے یہ بھی ہے کہ کسب وصَرف یعنی مال کا حاصل کرنا اور اس کا خرچ کرنا اس طور پر ہو کہ وہ افراد اور سماج کے لئے نفع بخش ہو، نقصان دہ نہ ہو؛ اسی لئے قمار کو منع کیا گیا کہ اس کی وجہ سے کسی معقول سبب کے بغیر بہت سے لوگوں کی دولت ضائع ہو جاتی ہے اور انسان کے اندر بغیر محنت کے دوسروں کا مال ہڑپ لینے کا مزاج پیدا ہوتا ہے، ایسی چیزوں کی تجارت سے منع کیا گیا جو لوگوں کے لئے نقصان دہ ہو، جیسے: منشیات، تجارت میں احتکار سے منع کیا گیا؛ کیوں کہ ذخیرہ اندوزی کا عمل ایک شخص کو فائدہ پہنچاتا ہے اور پورے سماج کو نقصان، اسی طرح خرچ کرنے میں بھی فرد اور سماج کے نفع ونقصان کو ملحوظ رکھا گیا، فضول خرچی کی ممانعت کی گئی؛ کیوں کہ اس سے قومیں معاشی پسماندگی میں مبتلا ہوتی ہیں اور تعلیم، صحت اور دوسرے مفید کاموں میں خرچ نہیں کر پاتی ہیں۔

(ج) اسلام میں اس بات کو بڑی اہمیت دی گئی کہ دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے؛ بلکہ وہ زیادہ سے زیادہ تقسیم ہو اور گردش میں رہے: ''**مَا أَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ أَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِيْ الْقُرْبٰى وَالْيَتَامٰى وَالْمَسَاكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ**'' (الحشر:۷) چنانچہ قدرتی وسائل اگر شخصی زمین میں بھی دریافت ہوں تو ان کا معتد بہ حصہ بیت المال کا حق قرار دیا گیا؛ تا کہ تمام لوگ اس سے فائدہ اُٹھا سکیں، میراث کا مکمل نظام مقرر ہوا، زکوٰۃ وعشر کو واجب قرار دیا گیا، وغیرہ —— غرض کہ شریعت میں یہ بات پسندیدہ نہیں ہے کہ سماج میں دولت اور اس کے وسائل چند ہاتھوں میں مرتکز ہو کر رہ جائیں۔

(د) اسلام میں نفع کا فطری تصور ہے؛ اسی لئے سود کو حرام قرار دیا گیا، سود ایک غیر فطری چیز ہے؛

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب لا صدقۃ إلا عن ظہر غنی، حدیث نمبر:۱۳۶۱۔

کیوں کہ خود پیسوں سے پیسے پیدا نہیں ہوسکتے اور سودخوار یہ فرض کر کے نفع وصول کرتا ہے کہ اس کے پیسوں سے لامحالہ پیسوں میں اضافہ ہوگا؛ اسی طرح اسلام میں انسانی محنت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے؛ کیوں کہ فطری اُصول یہ ہے کہ جب تک مال کے ساتھ انسانی محنت کی شمولیت نہ ہو، وہ نفع آور نہیں ہوتا، اسی اُصول پر اسلام میں استثمار کے طریقوں میں مضاربت اور مزارعت شامل ہے، مضاربت میں ایک شخص کا سرمایہ ہوتا ہے اور دوسرے کی محنت اور مزارعت میں ایک شخص کی زمین ہوتی ہے اور دوسرے کی محنت، دونوں صورتوں میں یہ ضروری ہے کہ فریقین کی رضامندی ہو اور کہ محنت کار کے نفع کا تناسب زیادہ رکھا جائے۔

اسلام کے نظام معیشت میں —— جیسا کہ عرض کیا گیا —— بلکہ پورے نظام حیات میں اس بات کو بنیادی اہمیت حاصل ہے کہ کوئی ایسا عمل نہیں ہونا چاہئے، جو فطرت سے بغاوت پر مبنی ہو؛ اسی لئے تلقی جلب، بیع حاضر للبادی، تناجش اور احتکار وغیرہ کو منع کیا گیا؛ کیوں کہ ان تمام صورتوں میں قیمتوں میں غیر فطری اُتار چڑھاؤ پیدا کیا جاتا ہے، آج کل تشہیری وسائل (Advertising) کے ذریعہ مصنوعی طور پر چیزوں کی طلب بڑھائی جاتی ہے، یہ بھی اسلام کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے؛ چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے تجارت میں جھوٹ بولنے اور دھوکہ دینے سے منع فرمایا ہے اور کسی چیز کے فائدہ کو مبالغہ کے ساتھ بیان کرنا اور اس کے نقصانات کے پہلو پر پردہ ڈالنا بھی جھوٹ میں داخل ہے، جس کا زبردست مظاہرہ موجودہ دور میں اشتہارات کے ذریعہ ہوتا رہتا ہے۔

اس عہد میں اسلام کے مقابلے میں دو بڑے معاشی نظام وجود میں آئے، ایک: اشتراکیت، جس نے ستر سالہ تجربہ کے بعد اپنی جائے پیدائش ہی میں دم توڑ دیا اور جہاں اب بھی باقی ہے وہاں بھی اس نے اپنے بعض بنیادی تصورات سے سبکدوشی قبول کر لی ہے؛ اشتراکیت کی بنیاد دو نظریات پر تھی: معاشی مساوات اور اجتماعی ملکیت، اور یہ دونوں ہی باتیں قانون فطرت کے خلاف ہیں، خدا نے انسان کے اندر صلاحیتوں کا فرق رکھا ہے اور معاشی ترقی میں انسان کی صلاحیت اور لیاقت کا بڑا دخل ہے، اس کے باوجود ان سب کے درمیان معاشی مساوات ایک خواب تو ہوسکتا ہے، حقیقت نہیں بن سکتا، اسی طرح افراد کے اندر اپنی املاک میں محنت کرنے اور اسے ترقی دینے کا فطری جذبہ ہوتا ہے، ایسی چیز جو تنہا اس کی ملکیت نہ ہو؛ بلکہ سماج کی ملکیت ہو، اس میں محنت کا جذبہ اس درجہ نہیں پایا جاتا؛ لیکن اشتراکیت کے نمائندوں نے اجتماعی ملکیت کا تصور دیا اور انفرادی ملکیت کا انکار کیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں میں محنت کرنے کا فطری جذبہ مفقود ہوتا گیا اور معاشری ترقی رُک گئی، اسلام کا تصور یہ ہے کہ بنیادی ضرورتیں سبھوں کو مہیا ہوں؛ لیکن یہ ضروری نہیں کہ معاشی معیار بھی سب کا ایک ہی ہو، اسی طرح اسلام انفرادی ملکیت کا قائل ہے؛ لیکن افراد پر اس بات کو واجب قرار دیتا ہے کہ وہ اپنے مال میں سماج کا حق محسوس کریں، نیز شریعت اسلامی میں زیادہ تر قدرتی وسائل کو حکومت کی ملکیت قرار دیا گیا ہے؛ تاکہ اس کا نفع زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچ سکے۔

اسی طرح سرمایہ دارانہ نظام بھی اس وقت موت وزیست کی کیفیت میں ہے؛ کیوں کہ اس نظام میں افراد کو ایسا بے لگام بنادیا ہے کہ ان کے لئے کوئی اخلاقی سرحد نہیں ہے، سرمایہ دارانہ نظام کی سب سے بڑی خرابی سود اور قمار کی اجازت ہے؛ کیوں کہ یہ نفع حاصل کرنے کے غیر فطری طریقے ہیں، اس میں مال کو مبالغہ آمیز اہمیت دی جاتی ہے اور مزدوروں کی محنت کو کوئی خاص درجہ نہیں دیا جاتا ہے، یہ نظام ذخیرہ اندوزی کی اجازت دیتا ہے؛ حالاں کہ یہ سماج کے غریب لوگوں کے ساتھ ظلم ہے، اس میں مصنوعی طور پر صارفیت کو بڑھایا جاتا ہے اور اشتہارات اور بے جا ترغیبات کے ذریعہ سماج کا مزاج بنایا جاتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ضروریات پر قانع نہیں رکھے؛ بلکہ خواہشات کا غلام بن جائے اور اپنی صلاحیت سے زیادہ خرچ کرے؛ تاکہ سرمایہ داروں کو زیادہ سے زیادہ نفع پہنچے، چاہے غریب لوگ قرض اور فضول خرچی کے بوجھ سے دب کر مرہی کیوں نہ جائیں۔

ان حالات میں خاص طور پر ضرورت ہے کہ اسلام کے معاشی نظام کو اس کی معقولیت اور منطقیت کے ساتھ دنیا کے سامنے رکھا جائے اور واضح کیا جائے کہ انسانیت کی حقیقی فلاح و بہبود اور معاشی اعتبار سے عدل کا قائم کرنا اس کے بغیر ممکن نہیں۔

حضرات ! ہندوستان ایک ایسا ملک ہے، جس کو اللہ تعالیٰ نے بے پناہ قدرتی اور افرادی وسائل سے نوازا ہے، تقریباً تمام ہی قدرتی وسائل اس ملک میں موجود ہیں اور افرادی وسائل کا حال یہ ہے کہ ایشیاء، یورپ اور امریکہ میں بے شمار ہندوستانی ماہرین اور مزدور کام کررہے ہیں اور ان کی خدمت کو ہر جگہ تحسین کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، ان میں ایک اچھی خاصی تعداد مسلمانوں کی بھی ہے، مسلمان اس ملک کی دوسری سب سے بڑی اکثریت یا پہلی بڑی اقلیت ہیں اور انڈونیشیا کے بعد سب سے زیادہ مسلمان اسی ملک میں آباد ہیں، کم وبیش ایک ہزار سال تک اس ملک کے مختلف خطوں پر مسلم سلاطین کی حکومت بھی رہی ہے؛ لیکن اس وقت مسلمان یہاں انتہائی درجہ پسماندہ ہیں؛ چنانچہ ۱۹۹۹–۲۰۰۰ء کے ایک سروے کے مطابق شہری علاقوں میں 24% اور دیہاتوں میں 31% کے قریب مسلمان خط غربت سے نیچے زندگی گزار رہے ہیں، ایک قومی سطح کے سروے کے مطابق بیس فیصد مالدار لوگ وہ تھے جن کی فی کس آمدنی کا اوسط شہر میں =/1120 روپے ماہانہ اور دیہات میں =/615 روپے ماہانہ تھا، ایسے لوگوں کا اوسط قومی سطح پر بالترتیب 16% اور 15% ہے اور مسلمانوں میں یہ اوسط صرف 6% اور 12% ہے۔

معاش کے بنیادی طور پر تین ذرائع ہیں، تجارت، ملازمت اور صنعت --- یہ حقیقت ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کا تجارت کی طرف رجحان مسلمانوں کے دور حکومت ہی سے کم تھا، پھر آزادی کے بعد بہت سے مسلمان سرمایہ دار پڑوسی ملک کو منتقل ہوگئے اور جو یہاں رہے، فرقہ وارانہ فسادات نے ان کی کمر توڑ دی؛ کیوں کہ ان فسادات میں مسلمانوں کی تجارت اور معیشت کو خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا تھا۔

مسلمانوں میں ملازمت کا رجحان زیادہ تھا؛ لیکن چوں کہ انگریزوں کے خلاف جدوجہد میں مسلمان پیش پیش تھے اور انگریز بھی ان کو اپنا بڑا دشمن خیال کرتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ چوں کہ حکومت مسلمانوں کے ہاتھ سے چھینی گئی ہے؛ اس لئے وہی ہماری حکومت کے اصل باغی ہیں اور ان کو زیر کرنا اور محروم کرنا ضروری ہے؛ اس لئے منصوبہ بند طور پر مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمت کے مواقع محدود کردیئے گئے، آزادی کے بعد نقل مکانی اور اُردو زبان کی سرکاری حیثیت ختم کردینے کی وجہ سے ملازمت میں ان کا تناسب اور کم ہو گیا، فرقہ وارانہ تعصب نے بھی مسلمانوں کو بے حد نقصان پہنچایا، صنعتی ترقی کے لئے کثیر سرمایہ اور قانونی سہولتوں کی ضرورت ہوتی ہے؛ چنانچہ معاشی پسماندگی اور ملک کی انتظامیہ میں فرقہ پرست افسروں کے درآنے کی وجہ سے صنعت میں بھی ان کا حصہ کم سے کم تر ہوتا چلا گیا۔

اسی پس منظر میں موجودہ حالات میں ہندوستان میں مسلمانوں کی معاشی ترقی کے لئے چند اُمور پر خصوصی توجہ کی ضرورت ہے :

(۱) مسلمانوں کے لئے ہندوستان میں سرمایہ کاری کے مواقع بہت محدود ہو گئے ہیں؛ کیوں کہ اسلام نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور بینک کا نظام اصلاً سود پر مبنی ہے؛ اسی لئے مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد منافع حاصل کرنے کے لئے بینکوں میں اپنی رقم محفوظ نہیں کرتی، یہی حال انشورنس کمپنیوں کا ہے کہ سود و قمار پر مشتمل ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کا دین دار طبقہ اختیاری طور پر انشورنس سے استفادہ نہیں کرتا، اسٹاک ایکسچینج میں گو ان کے لئے گنجائش موجود ہے؛ لیکن بہت سی کمپنیاں وہ ہیں جن کے کاروبار جواز کے دائرہ میں نہیں ہیں؛ اس لئے وہ میچول فنڈ سے بھی استفادہ نہیں کر پاتے؛ البتہ یہ خوش آئند بات ہے کہ بعض ایسے ادارے قائم ہو گئے ہیں جو حلال و حرام کمپنیوں کے بارے میں نشاندہی کرتے ہیں۔

ان حالات میں ہندوستان میں اسلامی مالیاتی اداروں کا قیام نہایت اہمیت کا حامل ہے، اس سے ایک طرف سرمایہ کاروں کو حلال نفع مل سکے گا، دوسری طرف مسلمان تاجروں اور صنعت کاروں کو شرکت و مضاربت کے اُصول پر سرمایہ حاصل ہوگا اور ممکنہ خطرات سے نبرد آزما ہونے کے لئے اسلامی تکافل سے مدد لی جائے گی، اگر ہندوستان میں اسلامی بینک کاری شروع ہو جائے تو اُمید کی جاتی ہے کہ بہت سے مسلم ممالک کے سرمایہ کار بھی ان کے واسطہ سے یہاں اپنا سرمایہ مشغول کریں گے؛ اس لئے اگر حکومت ہند اسلامی بینک کاری کا دروازہ کھولتی ہے تو اس سے نہ صرف مسلمانوں کی دیرینہ آرزو پوری ہوگی اور انھیں معاشی ترقی حاصل ہوگی؛ بلکہ ملک کو بھی فائدہ پہنچے گا۔

(۲) دوسرا اہم مسئلہ مسلمانوں میں تعلیمی اوسط کو بڑھانے کا ہے، ۲۰۰۱ء کی مردم شماری کے مطابق مسلمانوں میں خواندگی کا اوسط ۵۹ ر فیصد اور عورتوں میں ۵۰ ر فیصد ہے؛ جب کہ ہندوؤں میں ۶۵ ر فیصد اور ہندو

خواتین میں ۵۳ رفیصد سے کچھ اوپر ہے، یہ ہندوستان میں بسنے والی تمام مذہبی اکائیوں میں سب سے کم شرح خواندگی ہے، ورنہ جین کمیونٹی میں عام شرح خواندگی ۹۴ رفیصد اور خواتین میں ۹۱ رفیصد کے قریب ہے، یہاں تک کہ بودھ فرقہ میں بھی جو پسماندہ ترین سمجھے جاتے ہیں، شرح خواندگی ۷۳ رفیصد ہے۔

۲۰۰۰ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۵ سال اور اس سے زیادہ عمر کے مسلمانوں میں تعلیم کا تناسب پرائمری سطح تک 25.40 فیصد، مڈل میں 13.86 فیصد، سکنڈری میں 7.78 فیصد، ہائر سکنڈری میں 3.43 فیصد اور گریجویشن اور اس سے اوپر 2.52 فیصد ہے، مسلمانوں میں اسکول جانے والے بچوں کی تعداد 61.9 فیصد ہے، جب کہ اسکول جانے والے بچوں کی قومی شرح 72 فیصد ہے، چھ تا چودہ سال کی عمر میں تعلیمی سلسلہ منقطع کرنے والے بچوں کا اوسط مسلمان سماج میں 7 فیصد ہے؛ جب کہ قومی سطح پر یہ تناسب 4.8 فیصد ہے، اگرچہ گزشتہ دو دہائیوں سے مسلمانوں میں تعلیمی رجحان بڑھا ہے اور جنوبی ہند کی ریاستوں میں مسلمانوں نے اپنے تعلیمی ادارے بھی بہ کثرت قائم کئے ہیں، مگر اب بھی تعلیم میں ہم کافی پسماندہ ہیں۔

یوں تو ہمیشہ سے ہی معیشت کا تعلق تعلیم سے رہا ہے، مگر موجودہ دور میں معاشی ترقی کے لئے اس کی اہمیت وضرورت اور بھی بڑھ گئی ہے، جب تک تعلیمی اعتبار سے مسلمانوں کی حالت بہتر نہ ہو، وہ معاشی پسماندگی کے دلدل سے باہر نہیں نکل سکتے، موجودہ حکومت ایک حد تک مسلمانوں کے لئے تعلیمی مواقع بڑھانے پر توجہ دے رہی ہے؛ لیکن یہ مسلم سماج کی پسماندگی کے لحاظ سے اب بھی بہت کم ہے، ضرورت اس بات کی ہے کہ سرکاری سطح پر بھی اس کے لئے کوششیں ہوں اور مسلمان تنظیمیں بھی ایسے ادارے قائم کریں جو ان مسلمان نوجوانوں کی مدد کریں، جو بعض دفعہ بہت معمولی اسباب کی بناء پر تعلیم کا سلسلہ منقطع کردیتے ہیں، نیز مسلمان تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اعلیٰ مسابقتی امتحانات کے لئے تیار کریں۔

(۳) مسلمان تاجروں، صنعت کاروں اور کاشتکاروں کے لئے بھی رہنما اداروں کی ضرورت ہے، جن میں ماہرین ایسی چیزوں کی نشاندہی کریں، جن کی تجارت مفید ہوسکتی ہے، کونسی صنعت اس وقت اس کے حالات کے لحاظ سے بہتر ہوسکتی ہے اور کس علاقہ میں کونسی کاشت بارآور ہوسکتی ہے اور اس کے لئے کیا مواقع ہیں؟ ان کے بارے میں معلومات فراہم کریں، اسی طرح مسلمان تاجر، کاشت کار اور صنعت کار اپنی پیداوار کو کس طرح اور کہاں برآمد کرسکتے ہیں، اس کی رہنمائی کریں، ایسے رہنما ادارے مسلمانوں کی معیشت کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کرسکتے ہیں۔

(۴) ایک اہم ضرورت یہ ہے کہ مسلمانوں کو تجارت کی طرف راغب کیا جائے اور اس کے لئے ان کا ذہن بنایا جائے؛ کیوں کہ تجارت خود اختیاری چیز ہے، عام قسم کی تجارت میں نہ حکومت کی مدد ضروری ہے نہ

پرائیوٹ کمپنیوں کی ؛ بلکہ حوصلہ، شعور اور محنت کی ضرورت ہے اور اکثر فقہاء کے نزدیک تجارت کو کسب کی دوسری صورتوں پر فضیلت حاصل ہے، اس لئے کہ رسول اللہ ﷺ نے خود تجارت فرمائی ہے، حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ وعمر رضی اللہ عنہ اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بھی تاجر تھے اور زیادہ تر صحابہ رضی اللہ عنہم کا ذریعہ معاش یہی تھا۔

(۵) ناخواندہ اور کم تعلیم یافتہ مسلمان مردوں اور خواتین کو باعزت روزگار سے مربوط کرنے کے لئے اسلامی شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے مائیکرو فائنانس (Micro Finance) کا نظام قائم کرنا بھی بڑی اہمیت کا حامل ہے، اس طرح نہ صرف سماج کے غریب لوگ باعزت طور پر زندگی گزارنے کے لائق ہو سکیں گے؛ بلکہ اس سے غربت سے پیدا ہونے والی سماج برائیوں کو بھی دور کیا جا سکتا ہے۔

حضرات ! اس وقت سیمینار کا مقصد یہی ہے کہ شریعت کے دائرہ میں رہتے ہوئے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے معاشی ترقی کے مواقع پر غور کیا جائے اور رہنما خطوط متعین کئے جائیں کہ مسلمان کس طرح معاشی پسماندگی سے باہر آ سکتے ہیں اور ملک کی ترقی وخوشحالی میں بھی اپنا کردار ادا کرنے کے لائق بن سکتے ہیں، نیز ہندوستان میں اسلامی بینک کاری کے مواقع اور امکانات کا جائزہ لیا جائے اور اس کے لئے علمی، سماجی اور سیاسی سطح پر کوششیں کی جائیں، اس موقع پر اس بات کی وضاحت مناسب ہوگی کہ اکیڈمی شروع سے غیر سودی بینک کاری کے موضوع کو اہمیت دیتی رہی ہے، اس نے اس موضوع کو اپنے دوسرے، تیسرے اور چوتھے سیمینار میں بحث کا مستقل موضوع بنایا ہے، نیز ماہرین اقتصادیات اور اربابِ افتاء کے اشتراک سے ایک جامع رپورٹ تیار کی ہے جو طبع ہو چکی ہے، پھر اسلامی معاشیات سے متعلق کم سے کم ۲۳ر موضوعات مختلف سیمیناروں میں زیر غور آ چکے ہیں۔

اس وقت اکیڈمی اس سیمینار کا انعقاد اس لئے کر رہی ہے کہ معیشت سے ایک مسلمان کی صرف دنیوی ضرورتیں ہی متعلق نہیں ہیں؛ بلکہ مفلس وکم معاش قوم فکری، تہذیبی یہاں تک کہ مذہبی اعتبار سے بھی احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہے اور بعض دفعہ تو یہ صورت حال ان کو کفر وارتداد تک پہنچا دیتی ہے، جیسا کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''**كاد الفقر أن يكون كفرا**''(۱) خدا کرے یہ سیمینار اس سلسلہ میں مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کر سکے اور اپنے مقاصد واہداف کے اعتبار سے نتیجہ خیز ثابت ہو۔

وبالله التوفيق وهو المستعان .

○ ○ ○

---

(۱) شعب الایمان للبیهقی، حدیث نمبر: ۶۶۱۲۔

ہندوستانی مدارس میں اسلامی اقتصادیات کی تعلیم☆

خالدسیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمین و الصلاة و السلام علی سید المرسلین و علیٰ
آله و صحبه أجمعین . أما بعد !

جناب صدر، بزرگانِ محترم، برادرانِ عزیز! یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے اور اس حقیقت پر گذشتہ اور موجودہ تاریخ کی شہادت ثبت ہے کہ ملتِ اسلامیہ کے لئے افراد سازی کا سب سے بڑا مرکز دینی مدارس ہیں اور اب ان مدارس کی اہمیت کو مشرق سے مغرب تک اور اپنوں سے بے گانوں تک محسوس کیا جاتا ہے، خاص کر ہندوستان میں تحریکِ مدارس کا بڑا نمایاں رول رہا ہے، اس ملک کو آزاد کرانے میں علماء نے جو ناقابل فراموش کاوشیں کی ہیں اور اس راستہ میں بلا تامل دار ورسن کو گلے لگایا ہے، وہ ایک زندہ حقیقت ہے، افسوس کہ اسے فراموش کرنے کی کوشش کی جارہی ہے۔

گذشتہ ڈیڑھ سو سال سے نہ صرف ہندوستان میں؛ بلکہ پوری دنیا میں جو باطل تحریکات اُٹھی ہیں، ان کا سیلاب روکنے کے لئے اللہ کی توفیق سے فرزندانِ مدارس ہی کھڑے ہوئے ہیں، یا کم از کم انھوں نے اس سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں، انھوں نے الحاد، احکام شریعت کی بے جا تاویل اور آیاتِ قرآنی کی انحراف آمیز توضیح کو پوری قوت کے ساتھ روکا ہے، انھوں نے حدیثِ نبوی کی حجیت، دین میں اس کی اہمیت اور اس کے اعتماد واستناد کے خلاف چلائے جانے والی منظّم تحریک — جو ہندوستان سے مصر تک پوری قوت، مغرب کی تائید اور بعض دفعہ سربراہانِ ملک کی پشت پناہی کے ساتھ آگے بڑھائی گئی — کا بھرپور اور مؤثر مقابلہ کیا ہے، رسول اللہ ﷺ کی عظمت، ان کی سیرت کی نزاہت و پاکیزگی اور ختم نبوت پر جب بھی کسی گروہ نے پتھر پھینکنے کی کوشش کی، علماء نے اس کا مقابلہ کرنے اور ناموس نبوت کی حفاظت کرنے کو اپنے جگر پاروں کے رگ گلو کی حفاظت سے بھی زیادہ اہمیت دی ہے، مسلمانوں کو جب بھی دعوتِ ارتداد دی گئی، خواہ آریہ سماجیوں کی طرف سے ہو یا عیسائیوں کی طرف سے، اس کی

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیر اہتمام ''دینی مدارس میں معاشیات کی تعلیم'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں دیا جانے والا خطبۂ افتتاحیہ۔

مزاحمت اور اسلام کی طرف سے مدافعت کو فرزندانِ مدارس نے اپنی سب سے بڑی ذمہ داری سمجھا اور اس راہ میں پھانسی کے پھندوں اور قید و بند کی زنجیروں کو بھی خاطر میں نہیں لائے ، دین میں جب بھی انحراف پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تو ان ہی علماء نے بلاخوفِ لومۃ لائم اس کا مقابلہ کیا اور دین کی اس محبت اور سنت رسول پر اس جانثاری کی وجہ سے دشنام طرازی اور تکفیر کے تیر بھی سہے، احکام شریعت کو جب بھی مجروح کرنے اور اُمت مسلمہ کو اس سے محروم کرنے کی کوشش کی گئی، تو ان ہی علماء نے اس فتنہ کی سنگینی کو محسوس کیا اور اس کے مقابلہ کے لئے اُمت کو للکارا، اسی قدسی گروہ نے ملک کو آزاد کرانے میں نہایت اہم کردار ادا کیا اور اللہ کی زمین پر اللہ کی شریعت کو نافذ کرنے کی حتی المقدور کوششیں کی۔

یہ تو علماء کی حفاظتی اور دفاعی خدمات کی چند جہتیں ہیں ؛ لیکن اس کے علاوہ مثبت طریقہ پر مسلمانوں کو دین سے مربوط رکھنے کے لئے علماء نے جو کوششیں کی ہیں، وہ تاریخ کا ایسا روشن باب ہے کہ اخیر دور میں شاید ہی اس کی کوئی نظیر مل سکے ، لوگ اسٹیج پر تعلیم کو عام کرنے کی باتیں خوب کہتے ہیں ؛ لیکن خود ان داعیانِ تعلیم نے اپنے دروازوں کو متمول اور دولت مند لوگوں تک محدود کر رکھا ہے ، جو لوگ غریبوں کی جھونپڑیوں میں علم کا چراغ جلاتے ہیں اور شہر کی رونقوں سے دور قریوں اور دیہاتوں میں علم کا آبِ حیات پہنچاتے ہیں ، وہ یہی علماء اور ان کے زیر انتظام دینی درسگاہیں ہیں ، یہ درسگاہیں نہ صرف مسلمانوں کو دین واخلاق اور تہذیب وتمدن سے آراستہ کرتی ہیں ؛ بلکہ ارتداد اور بے دینی سے ان کی حفاظت بھی کرتی ہیں، اس کے علاوہ آج مسلمانوں میں جو کچھ سماجی واصلاحی کام ہو رہا ہے، حلال وحرام کی فکر پائی جارہی ہے اور دینی حمیت اور ایمانی غیرت باقی ہے، وہ ان ہی مدارس اور ان کے فضلاء کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

زمانہ جوں جوں گذرتا جا رہا ہے، حالات نازک سے نازک تر ہوتے جارہے ہیں، آج عالمی سطح پر اسلام کو بدنام کرنے اور مسلمانوں کو رسوا کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، کمیونزم کے زوال کے بعد مغرب نے محسوس کرلیا ہے کہ اسلام ہی اس کا سب سے بڑا رقیب ہے اور سرمایہ دار نظام کو اب صرف اسلام سے مقابلہ درپیش ہے، انھیں اس بات کا بخوبی احساس ہے کہ ایک نظام حیات کا مقابلہ دوسرے نظام حیات ہی سے ہوتا ہے، آہن وآتش کے ذریعہ زمینیں فتح کی جاسکتی ہیں ، ملکوں کے نقشے بدلے جاسکتے ہیں ، لوگوں کی گردنیں جھکائی جاسکتی ہیں ؛ لیکن اس کے ذریعہ دل ودماغ کو فتح نہیں کیا جاسکتا، اس کے ذریعہ اقلیم قلب کی کشور کشائی نہیں ہوسکتی اور فکر وعقیدہ کو شکست نہیں دی جاسکتی ، وہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ اُمت اتنی سخت جان ہے کہ ہزار ابتلاؤں اور آزمائشوں کے باوجود وہ دامن نبوت کا ایک تار بھی چھوڑنا نہیں چاہتی اور اسلام کی کشش اور جاذبیت کچھ ایسی ہے کہ میدانِ جنگ کے سورما اور تیغ وشمشیر کے شہسوار بھی اس کے آگے جبین اعتراف خم کر رہے ہیں اور فاتح خود مفتوح بنے جاتے ہیں ؛ اس لئے آج

اسلام پر ہمہ پہلو یلغار کی جارہی ہے اور اس کے لئے ہر طرح کی تلبیس وتحریف کا راستہ کھول دیا گیا ہے، اس پس منظر میں علماء کی ذمہ داریاں بہت بڑھ گئی ہیں۔

یہ امر محتاجِ اظہار نہیں کہ شریعتِ اسلامی کا ایک امتیازی وصف اعتدال وتوازن اور انسانی فطرت سے ہم آہنگی ہے، اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ انسان معاش کا محتاج ہے، وہ اس سے محروم رہ کر زندگی کی راہ میں چند قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتا؛ چنانچہ اسلام نے نہ صرف کسبِ معاش کو جائز رکھا؛ بلکہ اس کی حوصلہ افزائی کی، قرآنِ مجید نے مال کو ''خیر'' (العادیات: ۸) اور ''فضل الٰہی'' (الجمعة: ۱۰) سے تعبیر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اللہ کے بندوں کی ضروریات کی تکمیل کے لئے کسبِ معاش کو دوش بدوش رکھتے ہوئے فرمایا گیا کہ جب نماز سے فارغ ہوجاؤ تو روزی کی تلاش کی سرگرمیوں میں لگ جاؤ: ''فَإِذَا قُضِيَتِ الصَّلٰوةُ فَانْتَشِرُوْا فِى الْأَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللهِ '' (الجمعة: ۱۰) — اگر دولت اس کے حقوق کی ادائیگی کے ساتھ حاصل کی جائے، تو اسلام نے اس کی مذمت نہیں کی ہے؛ اسی لئے ہمیں قرآنِ مجید میں صاحبِ ثروت پیغمبروں کا اور حدیث میں صاحبِ ثروت صحابہ کا ذکر ملتا ہے، اور ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن میں زکوٰۃ لینے کا ذکر تو غالباً ایک ہی جگہ ہے، لیکن زکوٰۃ دینے کا حکم مختلف الفاظ میں ۶۵ جگہ ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ زکوٰۃ دولت مند ہی پر واجب ہوتی ہے۔

البتہ اسلام نے کسبِ معاش کی ایسی بے قید اجازت بھی نہیں دی کہ انسان اخلاقی اور انسانی حدود سے باہر چلا جائے؛ اسی لئے شریعت نے مال کے سلسلے میں دونوں پہلوؤں پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے، ایک یہ کہ مال کس طرح کمایا جائے، دوسرے یہ کہ مال کہاں خرچ کیا جائے؟ کسب کے ذرائع کیا ہوں اور خرچ کے مواقع کیا ہوں؟ ان دونوں جہتوں میں ایسے احکام دیئے گئے ہیں کہ معاشرہ میں انصاف قائم ہو، ہر شخص کو اپنی محنت کا پھل ملے؛ لیکن وہ بالکل خود غرض نہ ہوجائے، وہ ایسی اجتماعی ملکیت کا بھی قائل نہیں، جس میں افراد درخت اور پتھر کی طرح بے اختیار ہوجائیں اور انھیں روبوٹ تصور کرلیا جائے؛ کیوں کہ ذاتی منافع کی طلب یقیناً ایسی چیز ہے، جس سے معاشی تگ ودو کے جذبات پروان چڑھتے ہیں اور پھر اس سے معیشت کو ترقی حاصل ہوتی ہے، اور وہ ایسی انفرادی ملکیت کا بھی قائل نہیں، جس کی بنیاد خود غرضی، استحصال اور حق تلفی پر ہو اور جس میں ایثار، دوسروں کی رعایت اور انفاق کے لئے کوئی جگہ نہ ہو، قرآن وحدیث کی معاشی تعلیمات اور مسلمان فقہاء کے اجتہادات کی یہی بنیاد ہے۔

معیشت کی اہمیت کی وجہ سے یہ موضوع ہمیشہ سے علماء کی فکر کا محور رہا ہے، تدوین فقہ کے بالکل ابتدائی دور میں ہمیں امام محمد بن حسن شیبانی کا نام ملتا ہے، جنھوں نے ''کتاب الکسب'' تالیف فرمائی اور اس میں کسب کے جائز وناجائز ذرائع اور ان سے متعلق فضائل واحکام پر روشنی ڈالی، یہ اصل کتاب تو غالباً اب تک شائع نہیں ہوسکی ہے؛ لیکن اس کا خلاصہ علامہ ابوبکر محمد بن احمد سرخسی (م: ۴۸۳ھ) نے اپنی کتاب ''المبسوط'' میں درج کیا ہے، اسی طرح

ابتدائی دور کی کتابوں میں ہمیں قاضی ابو یوسف کی ''کتاب الخراج'' اور علامہ ابوعبید کی ''کتاب الاموال'' بھی ملتی ہے، جس کا تعلق ایک اسلامی حکومت کی مدات آمدنی اور مداتِ خرچ سے ہے، ذیلی طور پر فقہ المعاملات کی بحثیں ہمیں ان فقہی کتابوں میں تو ملتی ہی ہیں، جن میں تمام مسائل کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، ان کے علاوہ جو کتابیں ''احکام سلطانیہ'' یعنی حکومتی قوانین ''احکام قضا'' یعنی عدالتی قوانین اور ''احکام سیر'' یعنی بین قومی تعلقات سے متعلق قوانین پر لکھی گئی ہیں، ان میں بھی اقتصادیات سے متعلق احکام اچھے خاصے آجاتے ہیں، غرض کہ ہمارے فقہاء نے ان مسائل کو ہمیشہ خصوصی اہمیت دی ہے۔

صنعتی ترقی کے بعد معاشی نظام کے سلسلے میں جو نئے افکار پیدا ہوئے، انھیں نظریہ کی حیثیت سے ترقی حاصل ہوئی، اور عالمی سطح پر وہ غور وفکر اور عملی کوششوں کا محور بن گئے، نیز اشتراکیت اور سرمایہ داری نے ایک نظام حیات کی شکل اختیار کرلی، اس پس منظر میں اسلام کے معاشی نظام کی توضیح اور اس کی تطبیق کے سلسلے میں علماء نے مفید کاوشیں کی ہیں، گو خلافتِ عثمانیہ کے سقوط اور مسلم ممالک میں تمام شعبہ ہائے حیات میں اسلام کی حکمرانی سے گریز کی وجہ سے ان کو اس درجہ فروغ حاصل نہیں ہوسکا، جو ہونا چاہئے تھا، مقام مسرت ہے کہ ان کاوشوں میں علماء ہند کی بھی نمایاں خدمات ہیں، غالباً موجودہ دور میں اس موضوع پر پہلی کتاب مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ کی ''اسلامی معاشیات'' ہے، جو بڑے سائز کے تقریباً پانچ سو صفحات پر مشتمل ہے اور اس موضوع پر مولانا نے بڑی نادر تحقیقات پیش کی ہیں، انھوں نے اپنے آپ کو صرف قدماء کے افکار کا اسیر نہیں رکھا ہے؛ بلکہ قارئین اس میں ''قال'' کے ساتھ ''اقول'' کا بھی بڑا سرمایہ پائیں گے، مولانا ہی کی نگرانی میں ان کے ایک فاضل شاگرد ڈاکٹر محمد یوسف الدین نے بھی اس موضوع پر مقالہ لکھا، اور ڈاکٹر انوار اقبال قریشی سابق صدر شعبۂ معاشیات عثمانیہ یونیورسٹی نے بھی دو ضخیم جلدوں میں ''اسلام کے معاشی نظریئے'' کے نام سے اپنا تحقیقی مقالہ پیش کیا، اس طرح مولانا گیلانی کو اس اہم شعبہ میں سبقت واولیت کا شرف حاصل ہے اور آج بھی اس کی وقعت اور قدر وقیمت روز اول کی طرح باقی ہے۔

مولانا گیلانی کے بعد اس سلسلے میں دوسرا اہم نام مولانا حفظ الرحمٰن سیوہارویؒ کا لیا جاسکتا ہے، ان کی کتاب ''اسلام کا اقتصادی نظام'' — جو مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ کی خواہش پر لکھی گئی اور ندوۃ المصنفین دہلی سے شائع ہوئی — اپنے موضوع پر نہایت اہم اور جامع تالیف ہے، اس کے بعد اس موضوع سے متعلق علمی خدمات میں تین شخصیتیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں، ہندوستان سے ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی اور ڈاکٹر احمد علی ندوی، جن میں سے اول الذکر کا کام طریقۂ استثمار پر ہے اور ثانی الذکر کا مالیات سے متعلق فقہی قواعد پر، اور تیسری شخصیت پاکستان سے مولانا محمد تقی عثمانی کی ہے، جن کی تالیفات عام طور پر مقبول ومتداول ہیں، عالم اسلام میں اس وقت علماء

اورمعاشی ماہرین کی ایک قابل لحاظ تعداد نیز متعدد ادارے اسلامی معاشی نظام کی تشکیل وترقی کے سلسلے میں اہم خدمات انجام دے رہے ہیں، یہ بظاہر عجیب بات محسوس ہوتی ہے کہ اس موضوع پر کام کا آغاز تو ہندوستان میں ہوا؛ لیکن ہندوستان میں اس کام کو وہ توجہ حاصل نہیں ہوسکی، جو عالم اسلام اور عالم عرب میں ہوئی، غالبًا اس کی وجہ یہ ہے کہ عالم اسلام میں اسلامی طرز معیشت کو عملی شکل دینے کے مواقع مہیا تھے؛ گو مسلم حکومتوں نے اس پر کما حقہ توجہ نہیں کی، اور ہندوستان کے معاشی قوانین اسلامی مالیاتی نظام کے قیام میں حارج ہیں، خدا کرے جلد ایسے موانع دور ہوجائیں۔ **وما ذلک علی الله بعزیز.**

عصر حاضر میں اسلام کے معاشی نظام کے مطالعہ اور اس کی مشکلات کو حل کرنے کی اہمیت اس لئے بڑھ گئی ہے کہ جنگ عظیم اول کے بعد معاشی نظام کے اعتبار سے دنیا دو حصوں میں تقسیم ہوگئی تھی، سرمایہ داری اور کمیونزم، ان دونوں نظاموں کی کشمکش اور آویزشیں اتنی بڑھتی گئیں کہ بعض اوقات تو دونوں بلاک میں ایٹمی جنگ ہوتے ہوتے رہ گئی، ۱۹۹۲ء کے بعد جب روس پارہ پارہ ہوا، تو گویا اشترا کی نظام کا دارالخلافہ ہی اس کے ہاتھ سے نکل گیا اور اب سرمایہ دارانہ نظام بلا شرکت غیرے پوری دنیا پر حاوی ہے یا ہونے کے لئے کوشاں ہے، اب اس وقت دنیا میں سرمایہ دارانہ نظام کے مقابل اگر کوئی نظام ہے تو وہ اسلام ہے، یہی وہ حقیقت ہے، جو سرمایہ دارانہ ممالک کو مضطرب کئے ہوئی ہے؛ کیوں کہ وہ اس حقیقت سے خوب واقف ہیں کہ اسلحہ سے زمینیں فتح کی جاسکتی ہیں، فکر ونظر کو جیتا نہیں جاسکتا، 'افکار' افکار ہی سے شکست کھاتے ہیں، تاتاری مسلمانوں سے کہیں زیادہ طاقتور تھے؛ لیکن ان کے پاس کوئی فکری نظام نہیں تھا؛ اس لئے آخر مسلمانوں کے فاتح اسلام کے مفتوح بن گئے۔

یہی وجہ ہے کہ اس وقت مغرب اسلام کے معاشی وسماجی قوانین کو معاشی وسماجی ترقی میں رکاوٹ اور معاشی اداروں کے استحکام کے لئے نقصاندہ قرار دیتا ہے اور اسلامی مالیاتی اداروں کو ناکام کرنے کے لئے کوشاں رہتا ہے، ان حالات میں فقہاء اسلام کی ذمہ داری ہے کہ وہ موجودہ دنیا — جو صنعتی ترقی کے اوج کمال پر ہے اور جس نے مشرق ومغرب کے فاصلوں کو سمیٹ دیا ہے — کی ضرورتوں کو پورا کرتے اور دشواریوں کو حل کرتے ہوئے اسلامی معاشی نظام کا ڈھانچہ بنائیں اور جو معاشی ادارے آج کی ضرورت بن چکے ہیں، ان کو اسلامی پیکر عطا کریں، نیز انھیں سرمایہ دارانہ نظام کی ناانصافی سے بچاتے ہوئے لوگوں کے لئے قابل عمل بنائیں، اور موجودہ حالات اس کے لئے موزوں ترین حالات ہیں؛ کیوں کہ ۲۰۰۸ء سے پوری دنیا جس مالی بحران سے دوچار ہے اور جس نے معاشی دنیا میں ایک زلزلہ سا برپا کردیا ہے، اس نے سرمایہ دارانہ نظام کی ناکامی کو پوری طرح واضح کردیا ہے؛ حالاں کہ مغربی طاقتیں کھل کر یہ کہنے کو تیار نہیں ہیں؛ لیکن دبے لفظوں میں بعض حقیقت پسند ماہرین اس کا اعتراف بھی کررہے ہیں؛ اس لئے اس وقت خاص طور پر اس دور کے فقہاء کو اس کی طرف توجہ کرنی چاہئے۔

اس وقت مالیاتی نظام میں تین اداروں کی خاص اہمیت ہے، بینک، اسٹاک ایکسچینج اور انشورنس کمپنیاں، یہ تینوں ادارے موجودہ صنعتی دور کے لئے ضرورت کا درجہ رکھتے ہیں، بینک کھاتہ داروں کی رقم کی حفاظت کرتا ہے، بروقت اس کی واپسی کو یقینی بناتا ہے، کاروباری مقاصد اور دوسری ضرورتوں کے لئے بڑے بڑے قرضے دیتا ہے، رقوم کی ترسیل میں واسطہ بنتا ہے، اپنے کھاتہ داروں کو نفع دیتا ہے، شیئرز کمپنیاں بڑے کاروبار کے لئے رقم فراہم کرنے کا نہایت اہم ذریعہ ہیں، اس کے ذریعہ عام لوگ بڑی بڑی کمپنیوں تک رسائی حاصل کرسکتے ہیں اور اپنا سرمایہ لگاسکتے ہیں، بھاری صنعتوں، فاصلاتی تجارت اور ایکسپورٹ امپورٹ، صنعتی فضلات کی کثرت کی وجہ سے خطرناک بیماریوں کی کثرت ایسی چیزیں ہیں کہ ان کی وجہ سے خطرات بہت بڑھ گئے ہیں، ان خطرات کا مداوا انشورنس سے ہوتا ہے، اس لئے ہم ان اداروں کو غیر ضروری نہیں کہہ سکتے اور ایسے حالات میں جب کہ عالمی سطح پر معیشت باہم مربوط ہوگئی ہے، ایسے اداروں کے بغیر کسی ملک کے وجود کا تصور بھی نہیں کرسکتے؟ مگر افسوس کہ آج ان اداروں کی نشو ونما جن دماغوں کے ذریعے ہورہی ہے، انھوں نے ان مفید اور اہم خدمات انجام دینے والے اداروں کے رگ وریشہ میں ربا وقمار کو داخل کردیا ہے، اب ہمارا فرض ہے کہ جیسے مریض کے جسم کو بچاتے ہوئے اس کی بیماری کا علاج کیا جاتا ہے، اسی طرح ہم ان اداروں کو باقی رکھتے ہوئے اس کی خامیوں کو دور کریں اور اسے پوری طرح اسلام کے رنگ میں رنگ دیں۔

اللہ کا شکر ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں سود، قمار اور محرمات سے پاک بینک انشورنس، میچول فنڈ اور شیئرز میں سرمایہ کاری کو فروغ دینے کی کوشش کی جارہی ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اسلامک بینکنگ کی کوششوں میں مسلمانانِ ہند کو اولیت حاصل ہے، تو غلط نہیں ہوگا؛ کیوں کہ ۱۸۵۶ء میں حیدرآباد دکن میں غیر سودی سوسائٹی پہلی بار قائم ہوئی، حیدرآباد ہی میں ۱۹۲۵ء میں انجمن امداد قرض بلاسود کا قیام عمل میں آیا، غالباً ۱۹۳۶ء میں مسلم فنڈ قائم ہوا، اس کے علاوہ بھی ہندوستان کے شمالی اور جنوبی علاقوں میں بعض ادارے قائم ہوتے رہے، عالم اسلام میں اس کا نقطۂ آغاز مصر کے ایک قریہ مِت غمر کو قرار دیا جاتا ہے، جہاں ۱۹۶۲ء میں غیر سودی کوآپریٹیو بینک کا قیام ہوا، اسلامک بینکوں کے لئے استثمار کا بھی سب سے پہلا ماڈل ''مضاربہ ماڈل'' کے نام سے الٰہ آباد کے ایک پروفیسر نے پیش کیا، ۱۹۷۴ء میں دبئ اسلامک بینک قائم ہوا، جو ایک مکمل بینک تھا، ۱۹۷۵ء میں (IDB) کا قیام عمل میں آیا اور ۱۹۷۶ء میں شاہ فیصل نے سوڈان اور بحرین وغیرہ میں اسلامی بینک قائم کئے۔

واقعہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں اسلامک بینکنگ کو پذیرائی حاصل ہورہی ہے، یہاں تک کہ غیر مسلم مالکان بھی مسلمانوں کا سرمایہ حاصل کرنے کے لئے اپنے یہاں اسلامی استثمار کا کاؤنٹر کھول رہے ہیں اور غیر مسلم کمپنیاں بھی اسلامی انشورنس کی دہائی دے رہی ہیں، ان حالات میں ایک طرف تو ایسے افراد کی ضرورت ہے، جو

جدید معاشی نظام سے واقف ہوں اور فقہ اسلامی پر ان کی گہری نظر ہو، دوسری طرف ان اداروں کی نگرانی کی ضرورت ہے؛ تاکہ اسلام کے نام پر قائم ہونے والے یہ ادارے صحیح راستے سے منحرف نہ ہو جائیں اور دین کے نام پر بے دینی کو رواج دینے کا ذریعہ نہ بن جائیں، ان دونوں مقاصد کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ دینی مدارس میں اسلامی معاشیات کو داخل کیا جائے؛ کیوں کہ ملت کے مختلف کاموں کے لئے افراد سازی کا اس سے بڑا اور کوئی مرکز نہیں، ان کی حیثیت پاور ہاؤس کی ہے، جس سے اُمت کے تمام کاموں کے لئے انرجی حاصل ہوتی ہے، یہ اُمت کے لئے قلب کا درجہ رکھتے ہیں، جو اس جسم کے ایک ایک عضو کو خون پہنچاتا ہے، اس وقت یہ مذاکرہ تین اداروں کے اشتراک سے منعقد ہو رہا ہے اور یہ تینوں ہی ادارے سودی نظام کی جگہ غیر سودی نظام کو لانے کے لئے اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق کوشاں رہے ہیں، (IDB) عالمی سطح کا نہایت فعال ادارہ اور سب سے بڑا اسلامی بینک ہے، جو مالیاتی اداروں کے ساتھ بڑے پیمانے پر رفاہی کام بھی انجام دیتا ہے اور ہم اور آپ سب اس کی وسیع خدمات سے واقف ہیں، انسٹیٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے قیام کو بیس سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے، اس عرصہ میں اس نے علم وتحقیق کے بڑے اہم کام انجام دیئے ہیں اور مختلف شعبوں میں دوررس منصوبہ بندی کے ساتھ کاموں کا آغاز کیا ہے، اس کی خدمات آبِ زر سے لکھے جانے کے لائق ہیں، غیر سودی سرمایہ کاری کے لئے بھی اس نے بڑی کاوشیں انجام دی ہیں اور ایسے اداروں کی مدد کے لئے ''شریعہ بورڈ'' بھی تشکیل دیا ہے۔

تیسرا ادارہ ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' ہے، جس کا بنیادی مقصد ہی عصر حاضر میں پیدا ہونے والے شرعی وفقہی مسائل کو حل کرنا ہے، اب اس نے بیسویں سال میں قدم رکھا ہے، بحمد اللہ ملک وبیرونِ ملک میں اس کو قدر ومنزلت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے، نئے مسائل پر اس کے اٹھارہ سیمنار منعقد ہو چکے ہیں، جس میں ۱۷۵ موضوعات سے زیادہ عصری مسائل زیر بحث آئے ہیں، مالیاتی مسائل پر شروع سے اکیڈمی کی خصوصی توجہ رہی ہے، اسلامی معاشیات کا مثبت حصہ زکوۃ وعشر سے متعلق ہے؛ چنانچہ ان موضوعات پر ایک سے زیادہ مستقل سیمینار منعقد ہوئے ہیں، اس کا سلبی پہلو نظام معیشت کی سود وقمار سے تطہیر اور جدید معاشی اداروں کے اسلامی متبادل کی نشاندہی ہے؛ چنانچہ بینک انٹرسٹ، غیر سودی قرض دینے والے اداروں کی ہیئت، انشورنس، اسلامی بینکنگ کے مسائل —— مرابحہ، بیع بالتقسیط وغیرہ —— نیز کریڈٹ کارڈ، ملٹی لیول مارکٹنگ اور ان جیسے بہت سے موضوعات کو اکیڈمی نے بحث کا موضوع بنایا ہے اور اجتماعی طور پر ان کے بارے میں شرعی رہنمائی کی ہے، یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ہندوستان میں غیر سودی بینکاری کے امکانات کی تلاش میں اکیڈمی نے بڑی کاوشیں کی ہیں، اس کے لئے ماہرین معاشیات، معاشی قوانین کے ماہرین اور مفتیانِ کرام کا ایک گروپ بنایا گیا اور بڑی دقت نظر کے ساتھ اس پر غور کیا گیا اور بالآخر اس پر پروجیکٹ رپورٹ تیار کی گئی، جس کی مولانا محمد تقی عثمانی (پاکستان) اور ڈاکٹر انس زرقاء (سعودی عرب)

جیسے عالم اور ماہر معاشیات نے بڑی تحسین کی، گوساری محنتوں کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا گیا کہ ہندوستان کے موجودہ قوانین کے تحت ایک مکمل اسلامی بینک کا قیام یہاں ممکن نہیں؛ البتہ کوآپریٹیو سوسائٹی کے ذریعہ اسلامی طریقہ پر استثمار کی کوشش کی جاسکتی ہے۔

آج اس موضوع پر ملک بھر سے دینی مدارس کے ذمہ داروں اور نمائندہ شخصیتوں کو جمع کرنا ان تینوں اداروں کے لئے یقیناً سعادت وشرف کی بات ہے، جس کا مقصد اللہ کی زمین پر اللہ کی شریعت کے نفاذ کے لئے راستہ ہموار کرنا ہے، ان کلمات کو ختم کرتے ہوئے بے ساختہ رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد نوکِ قلم پر آتا ہے :

إن مثل العلماء في الأرض كمثل النجوم في السماء يهتدى به في ظلمات البر والبحر ، فإذا انطمست النجوم أو شک أن تضل الهداة . (۱)

زمین میں علماء کی مثال آسمان پر ستاروں کی طرح ہے، جس کے ذریعے خشکی اور سمندر کی تاریکیوں میں رہنمائی حاصل کی جاتی ہے، اگر تارے ماند پڑ جائیں، تو بعید نہیں کہ صحیح راستہ چلنے والے بھی بھٹک جائیں۔

دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس مذاکرہ کو ثمر آور اور نتیجہ خیز بنائے اور ہمیں ایسے فیصلوں کی توفیق عطا فرمائے، جن میں اس کی رضا وخوشنودی ہو۔

اللهم أرنا الحق حقا وارزقنا اتباعه ، وأرنا الباطل باطلاً وارزقنا اجتنابه .

○ ○ ○

---

(۱) مسند احمد، حدیث نمبر: ۱۲۱۸۹

تحقیق مخطوطات کی اہمیت ☆

خالد سیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على خاتم النبيين وأفضل الأنبياء والمرسلين و على آله وأصحابه أجمعين ، أما بعد .

علماء کرام اور طلبۂ عزیز! اللہ کا شکر ہے کہ ہم سب ایک ایسے نبی کی اُمت ہیں، جن کی نبوت کا سایہ قیامت تک قائم رہے گا ، جس کی لائی ہوئی شریعت ایک زندہ شریعت ہے ، جو آخری درجہ فطرتِ انسانی سے ہم آہنگ اور زندگی کی ضرورتوں اور مصلحتوں کو پوری کرنے والی ہے، جو شریعت انسانی زندگی سے متعلق ہو اور جو دین قیامت تک بے آمیز طریقہ پر باقی رہنے کے لئے ہو، ضروری ہے کہ اس سے متعلق علوم وفنون بھی زندہ و پائندہ رہیں، وہ کہنگی نا آشنا ہوں اور ان کی تازگی ہمیشہ برقرار رہے؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کے دوسرے مذاہب اور ان کی مذہبی کتابوں سے متعلق علم وتحقیق کا سلسلہ یا تو مسدود ہو چکا ہے یا محدود؛ لیکن اسلام وہ دین برحق اور قرآن مجید وہ ازلی کتابِ ہدایت ہے، جس میں کسی وقفہ کے بغیر علم وتحقیق کا سلسلہ جاری وساری ہے اور گذشتہ تقریباً ڈیڑھ ہزار سال کی بہترین ذہانتیں ان علوم وفنون کی آبیاری میں خرچ ہوتی رہی ہیں، —— اور کیوں نہ ہوں کہ اسلام نے علم کو جو اہمیت دی ہے، مذاہب عالم میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی، رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ علم میں زیادتی عبادت میں زیادتی سے بہتر ہے ''**فضل العلم خير من فضل العبادة**'' (۱) رسول اللہ ﷺ کے سامنے جب دو ایسے اشخاص کا ذکر کیا گیا، جن میں ایک کا امتیاز عبادت میں تھا اور دوسرے کا علم میں، تو آپ ﷺ نے فرمایا: عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے کسی معمولی شخص پر، ''**فضل العالم على العابد كفضلي على آدناه**'' (۲) آپ ﷺ نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی شخص کے ساتھ خیر کا معاملہ فرماتے ہیں تو اس کو تفقہ

☆ کلیدی خطبہ بہ موقع: ''دوره تدريبيه لمنهج البحث والتحقيق'' بمقام: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

(۱) طبرانی عن حذیفہ بن یمان، بحوالہ مجمع الزوائد، حدیث نمبر: ۴۷۸۔

(۲) ترمذی عن أبی امامہ، حدیث نمبر: ۲۶۵۰۔

یعنی علمی گہرائی عطا فرماتے ہیں: ''من یرد اللہ بہ خیرا یفقہ فی الدین''(۱) یہ اور اس طرح کے کتنے ہی ارشادات نبوی ہیں، جن میں علم کو بمقابلہ دوسرے اعمال کے ترجیح دی گئی ہے، یہاں تک کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا قول مروی ہے کہ اس عبادت میں خیر نہیں، جس کے ساتھ علم نہ ہو اور وہ علم مفید نہیں جس کے ساتھ فہم نہ ہو، ''**لا خیر من عبادۃ لا علم فیھا ولا خیر فی علم لافھم فیہ**''۔(۲)

یہ اسلام کا فیض ہے کہ اس نے انسانیت کو لوح وقلم کی اہمیت سے آشنا کیا، پیغمبر اسلام ﷺ پر جو پہلی وحی نازل ہوئی، خود اس میں قلم کا ذکر موجود ہے، قرآن نے قلم کی قسم کھائی ہے، '' نٓ وَالْقَلَمِ وَمَا یَسْطُرُوْنَ ''(القلم:۱) عربوں کا حال یہ تھا کہ انھیں اپنے اُمی ہونے پر فخر تھا، اہل سیر کا بیان ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ پیدا ہوئے تو مکہ میں صرف تیرہ لوگ لکھنا جانتے تھے اور جب آپ ﷺ مدینہ تشریف لائے تو انصار میں صرف گیارہ لوگوں کو لکھنا آتا تھا اور عورتوں کے کاتب ہونے کو تو بہت ہی برا سمجھا جاتا تھا؛ لیکن یہ آپ ﷺ کا فیض ہے کہ صرف آپ کے کاتبانِ وحی کی تعداد چالیس سے زیادہ ہے، آپ نے خواتین کے لئے لکھنے کی حوصلہ افزائی فرمائی اور خود اُم المومنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو کتابت سکھوائی، اس لئے تحریر وتالیف اور بحث وتحقیق اس اُمت کو میراث میں ملی ہے، مسلمانوں نے کتابت کے وسائل پر بھی توجہ دی ہے، عرب عام طور پر اونٹ کی ہڈیوں، کھجور کی چھالوں اور بعض نرم سفید پتھروں پر لکھا کرتے تھے، اسلام کے آنے کے بعد بتدریج اسے ترقی حاصل ہوئی، یہاں تک کہ عالم اسلام میں عباسیوں کے دور ہی سے کاغذ کا استعمال عام ہوگیا، اس وقت پریس کا وجود نہیں تھا؛ اس لئے ''وراقی'' کا پیشہ شروع ہوا، ''نقل نویس''''وراق'' کہلاتے تھے اور انھیں معاشرہ میں بڑا مقام حاصل تھا، بڑے بڑے شہروں میں ان کے باضابطہ بازار ہوا کرتے تھے، علامہ مقریزی نے اپنی کتاب ''خطط'' میں تفصیل سے وراقین کا اور ان کے تحریری کمالات کا ذکر کیا ہے، یہاں تک کہ اسماء رجال کی کتابوں میں بعض دفعہ شخصیتوں کے تذکرہ میں حسن خط کا بھی ذکر کیا جاتا ہے، یہ سب کچھ نبی عربی اُمی ﷺ کا اعجاز تھا کہ جو قوم لکھنے پڑھنے سے بالکل ہی نابلد تھی، اس نے علمی کمالات اور بحث وتحقیق کے میدان میں امامت کا درجہ حاصل کرلیا، اب ضرورت ہے کہ پھر اسی جامِ کہن کا دور چلے، علم وتحقیق کی مجلسیں آراستہ ہوں اور موجودہ عہد کی ضرورت کے مطابق علماءِ اسلام دین وعلم دین کی خدمت کا فریضہ انجام دیں۔

شاید یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے غیبی نظام تھا کہ خلافت راشدہ کے عہد زریں تک تو سیاسی اور دینی قیادت کا مرکز ایک ہی رہا؛ لیکن جیسے جیسے سیاسی اقتدار کے ایوانوں پر خدا ناترس لوگ مسلط ہوتے گئے اور اللہ کے دین کو نافذ کرنے کے لئے نہیں؛ بلکہ اپنی عیش کوشی کے لئے لوگ اس میدان میں طالع آزمائی کرنے لگے، اقتدار کے دو الگ الگ مرکز قائم ہوگئے، ایک مرکز سیاسی قیادت کا تھا، دوسرا مرکز دینی رہنمائی کا تھا، پہلے مرکز سے ملک و مال کے

(۱) سنن ترمذی: ۲۶۴۵۔ (۲) سنن دارمی، حدیث نمبر: ۲۹۸۔

فاتحین پیدا ہوئے اور دوسرے مرکز سے مفسرین ومحدثین، فقہاء وصوفیاء اور دین کے مخلص شارحین ومبلغین وجود میں آئے، اگرچہ اس تقسیم سے بعض نقصانات بھی ہوئے، مگر اس کے ساتھ ساتھ اس کے دو بڑے فائدے بھی ہوئے، ایک یہ کہ اسلام کا پیغام ہر طرح کی آمیزش سے محفوظ رہا، حکومت کا جبر واستبداد بھی اس پر اثر انداز نہ ہوسکا، یہاں تک کہ صورتحال یہ تھا کہ اگر کوئی محدث شاہی دربار میں آمد ورفت رکھتا اور سرکاری عہدہ قبول کرتا تو محدثین اس کی روایت لینے سے گریز کرتے اور اگر کوئی فقیہ ایوان حکومت سے تعلق رکھتا اور کسی سرکاری منصب پر بٹھایا جاتا تو لوگ اس کے فتویٰ کو نامعتبر مانتے، یہاں تک کہ امام ابو یوسفؒ جیسی شخصیت جنھوں نے عہدۂ قضاء کو عباسی خلفاء کی بتدریج اصلاح کے لئے استعمال فرمایا، کتاب الخراج جیسی کتاب لکھی اور اس کے مقدمہ میں نہایت دردمندی کے ساتھ حکمرانوں کو دین وشریعت کی طرف متوجہ فرمایا، ان سے بھی امام ابوحنیفہؒ کے بعض تلامذہ نے کنارہ کشی اختیار کرلی، اس کی اہمیت کا اندازہ عیسائیت یا ہندومت کی تاریخ سے لگایا جاسکتا ہے، محض رومی حکمرانوں کو ان کے سابق مذہب سے مانوس رکھتے ہوئے عیسائیت کو قابل قبول بنانے کی غرض سے تثلیث کا عقیدہ گھڑا گیا؛ کیوں کہ رومیوں کے مذہب میں تثلیث کا تصور پہلے سے موجود تھا، اسی طرح ہندو مذہب میں برہمنوں نے اپنے اقتدار کو قائم رکھنے اور برسر اقتدار گروہ پر اپنا تسلط برقرار رکھنے کے لئے ویدوں کی حقیقی تعلیمات کو کنارے کردیا اور بت پرستی، انسانیت کے درمیان تفریق اور آواگون کا پورا فلسفہ وضع کرلیا، جسے منوجی کی تعلیمات کہا جاتا ہے، اسلام میں بھی حالاں کہ اس کی حقیقی تعلیمات کو مسخ کرنے کی ناپاک کوششیں بھی ہوئیں؛ لیکن اس میں کبھی کامیابی نہیں مل سکی؛ کیوں کہ اللہ تعالیٰ کو یہ بات منظور تھی کہ یہ دین ہمیشہ اپنی اصلی شکل پر باقی رہے اور بظاہر اس کا سبب یہی ہوا کہ علماء اسلام نے اپنے آپ کو سیاسی طالع آزمائی سے دور رکھا اور حکومتوں سے قربت حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی۔

اس کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ سیاسی طوفان آتے اور جاتے رہے، اقتدار کے لئے کشت وخون کا بازار گرم ہوتا رہا؛ لیکن ان آندھیوں نے علم کے چراغ کو بجھنے بلکہ مدھم تک ہونے نہیں دیا؛ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جو زمانہ شدید سیاسی اُتار چڑھاؤ کا رہا ہے، عین اس زمانہ میں بھی اہل علم نے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر بڑے بڑے علمی کارنامے انجام دیئے ہیں اور ایسی کتابیں تالیف کی ہیں، جن کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی؛ بلکہ ایسا بھی ہوا کہ جب عالم اسلام کا چپہ چپہ تاتاریوں کے قدموں کی دھمک سے لرز اُٹھا تو اہل علم نے دوسرے علاقوں میں ہجرت کی اور وہ وہاں پہنچ کر گیسوئے علم کی آراستگی کا فریضہ انجام دیتے رہے۔

سلف صالحین علم وتحقیق کے کام کو ایک عبادت سمجھ کر انجام دیتے تھے، علامہ ابن جوزیؒ جو کثیر التصنیف علماء میں تھے، انھوں نے ڈھائی سو کتابیں تصنیف کی ہیں اور خود فرمایا کہ میری ان انگلیوں نے دو ہزار جلدیں لکھی ہیں، انھوں نے حدیث شریف کی جو کتابیں لکھیں، ان کے قلموں کے تراشے جمع کرتے گئے اور وصیت کی کہ انھیں

تراشوں سے میرے غسل کا پانی گرم کیا جائے؛ چنانچہ ان کی وصیت پر عمل کیا گیا، امام ابوجعفر طبری کی وفات کے بعد ان کی تصنیفات کو شمار کیا گیا تو ابتدائے جوانی سے یوم وفات تک چودہ ورق روزانہ کا اوسط پڑا۔

ابن شہاب زہریؒ کے علمی اشتغال کا حال یہ تھا کہ ان کی بیوی ان کی کتابوں کے بارے میں کہتی تھیں کہ یہ مجھ پر تین سوکنوں سے بڑھ کر ہیں ''واللہ لهذه الكتب أشد عليَّ من ثلاث ضرائر'' وہ کھانے کے وقت بھی اپنے مسودہ کا مطالعہ کرتے رہتے اور ان کی بہن ان کے منھ میں لقمہ ڈالتی جاتی تھیں، امام رازی کو اس بات کا افسوس ہوتا کہ ان کے کھانے کا وقت ضائع ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ وہ وقت علمی اشتغال سے خالی رہتا ہے، پھر جو کچھ لکھا اور پڑھا جاتا، اس کے پیچھے گہری تحقیق اور غیر معمولی محنت کارفرما ہوتی تھی۔

ابوعبیدہ بن سلام سے مروی ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب ''غریب الحدیث'' کی تصنیف میں چالیس سال صرف کئے، —— شیخ عبدالفتاح ابوغدہ اور خود اُردو میں بھی مولانا محمد حبیب الرحمٰن شیروانی نے اپنی کتاب ''علماء سلف'' میں تذکرہ ورجال کی بہت سی اہم کتابوں سے علماء کے علمی اشتغال کے کتنے ہی اہم واقعات نقل کئے ہیں، جو طلبۂ عزیز کے پڑھنے کے لائق ہیں، یہ سب کچھ اس لئے تھا کہ ان کے نزدیک علم وتحقیق کو عبادت کا درجہ حاصل تھا اور وہ اس کام کو اللہ کی رضاء وخوشنودی کے لئے کیا کرتے تھے۔

افسوس کہ اہل علم کا بہت سارا علمی ذخیرہ آج دستیاب نہیں ہے، بعض کم فہم لوگوں کا حال تو یہ ہے کہ اگر کسی عالم کی کسی تالیف کا کتابوں میں تذکرہ ملتا ہے؛ لیکن اب وہ دستیاب نہیں ہے تو لوگ ان تصنیفات کو ماننے سے انکار کر جاتے ہیں اور مسلکی تعصب کی بنا پر اس کو جھوٹ قرار دیتے ہیں؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بزرگوں نے جس دور میں علم وفن کے چراغ جلائے، وہ دور پریس کی سہولتوں کا نہیں تھا، علمی کاموں کے لئے دماغ کے ساتھ ساتھ آنکھوں کا چراغ بھی جلانا پڑتا تھا اور الفاظ ونقوش کے لعل وگہر مشینوں کے ذریعہ نہیں؛ بلکہ اپنے ہاتھوں سے پروئے جاتے تھے، اس لئے بڑی مشقت سے کتاب کی تالیف پایۂ تکمیل کو پہنچتی تھی اور کبھی کبھی اتنی ہی دشواری کے ساتھ اس کے قلمی نسخے تیار کئے جاتے تھے، پھر ان کی حفاظت کے لئے معقول انتظام بھی نہیں تھا، زیادہ تر انفرادی طور پر لوگ ان علمی جواہر کو محفوظ کرنے کی کوشش کرتے تھے، اس لئے بہت سارے مخطوطات ضائع ہوگئے۔

خاص کر جب تاتاریوں نے بغداد کا عظیم الشان مکتبہ جلا کر خاکستر کر دیا تو علم وفن کے کتنے ہی جواہر پارے ہمیشہ کے لئے نیست ونابود ہوگئے، کہا جاتا ہے کہ ان کتابوں کی راکھ سے دریائے دجلہ پر پل بنایا گیا، اِس سے اس خزانۂ علمی کی کثرت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے، عجیب بات ہے کہ تاتاری قوم غیر مہذب اور وحشی تھی؛ لیکن موجودہ دور میں جو لوگ اپنے آپ کو تہذیب وشائستگی کا نمائندہ سمجھتے ہیں، انھوں نے بھی علمی خزانہ کی تباہ کاری میں کچھ کم ''بہادری'' کا مظاہرہ نہیں کیا، کویت اور عراق کی جنگ میں جامع امام ابوحنیفہؒ بغداد سے منسلک مخطوطات کی ایک بڑی لائبریری

کوعصر حاضر کے تاتاری یعنی امریکہ نے قصداً بمباری کر کے راکھ کا ڈھیر بنادیا، اسی طرح کتنے ہی مخطوطات ہیں، جن کومغرب کی استعماری طاقتیں مشرقی اور اسلامی ملکوں سے لوٹ کر لے گئیں، ان میں سے بعضوں نے یقیناً بہتر طور پر ان کی حفاظت کا انتظام بھی کیا؛ لیکن بہت سے مخطوطات ضائع بھی کر دیئے گئے، اس لئے یہ سمجھنا کم فہمی ہوگی کہ جن تالیفات کا کتابوں میں ذکر آیا ہے، اگر وہ آج دستیاب نہ ہوں تو گذشتہ مؤلفین کے بیان کو خلاف واقعہ سمجھا جائے گا۔

اللہ تعالیٰ کا شکر و احسان ہے کہ اس وقت بھی دنیا کے مختلف خطوں میں اسلامی مخطوطات کی ایک بڑی تعداد موجود ہے، ترکی — بہ قول ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ — ان مخطوطات کا دار الخلافہ ہے اور عالم اسلام کے خاص خاص ملکوں میں ان کی بڑی تعداد موجود ہے؛ لیکن برصغیر کا مقام بھی اس معاملہ میں کم نہیں ہے، سندھ کا علاقہ تو اس کے لئے معروف رہا ہی ہے؛ لیکن موجودہ ہندوستان میں بھی مخطوطات کا ایک بڑا ذخیرہ موجود ہے، خدا بخش لائبریری پٹنہ، شعبۂ مخطوطات مشرقی حیدرآباد، رضاء لائبریری رامپور، نیشنل لائبریری کلکتہ، ٹونک، بھوپال، ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ کی خاندانی لائبریری اور نہ جانے کتنے انفرادی مکتبے اور دینی درسگاہوں اور علمی اکیڈمیوں کی لائبریریاں ہے، جو ان خزانوں سے معمور ہیں، اگر چہ کہ ''مکتبہ الجمعہ الماجد، عرب امارات'' اور ایرانی سفارت خانہ کے ذریعہ اس کی فہرست سازی اور مخطوطات کی اسکیاننگ کا نہایت قابل قدر کام انجام پا رہا ہے؛ لیکن اس کے باوجود آج بھی بہت سے مخطوطات ان دفینوں کی نذر ہیں، جہاں تک اہل علم کی رسائی نہیں ہو پائی ہے ، ہندوستان کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ سب سے پہلے حضرت مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کی تصحیح وتحقیق کے ساتھ یہاں سے صحیحین کی طباعت عمل میں آئی، جو آج بھی صحیح ترین نسخہ تصور کیا جاتا ہے — اللہ تعالیٰ جزائے خیر دے فضیلت جنگ حضرت مولانا شاہ انوار اللہ فاروقیؒ کو، جیسے انھوں نے اسلامی علوم کی تدریس کے لئے ''جامعہ نظامیہ'' کی بنیاد رکھی، اسی طرح اسلامی علوم کے ان مستور خزانوں کو اہل علم تک پہنچانے کے لئے مستقل ایک ادارہ ''دائرۃ المعارف العثمانیہ'' (سابق نام: دائرۃ المعارف النظامیہ) کی بنیاد رکھی، جس کے ذریعہ مختلف اسلامی علوم وفنون کے بہت سارے مخطوطات منظر عام پر آئے، جن میں علامہ سمعانیؒ کی 'کتاب الانساب' حافظ ذہبیؒ کی 'تذکرۃ الحفاظ' شیخ علی متقی الہندیؒ کی 'کنز العمال' امام طحاویؒ کی 'مشکل الآثار' امام محمد بن حسن شیبانیؒ کی 'کتاب الآثار' حدیث کی معروف کتاب 'سنن بیہقی' مفردات حدیث میں 'غریب الحدیث' رجال میں 'کتاب المجروحین' ربط آیات پر منفرد تفسیر 'نظم الدرر' اور نہ جانے کتنے ہی علمی شہ پارے شامل ہیں اور اس یہاں سے طرح ایک عظیم تاریخی کارنامہ انجام پایا۔

بحمد اللہ ادھر مخطوطات کی تحقیق پر لوگوں کی توجہ بڑھی ہے، خاص کر عالم عرب کی جامعات میں دکتورہ کے طلبہ اس موضوع پر بڑی اہم خدمت انجام دے رہے ہیں؛ لیکن خاص کر فقہ حنفی کے مخطوطات پر ابھی بھی توجہ کی ضرورت

ہے،فقہ مالکی کی کتابوں کومغرب کی حکومت نے شائع کرنے کا اہتمام کیا ہے،فقہ حنبلی کی کتابیں سب سے کم دستیاب تھیں،ان پر موجودہ سعودی حکومت نے توجہ دی، نیز سعودی حکومت نے تفسیر وحدیث کے مخطوطات کو بھی طبع کرنے کا اہتمام کیا،شافعی دبستانِ فقہ میں چوں کہ بڑے بلند پایہ علماء ومحدثین پیدا ہوتے رہے ہیں،اس لئے انھوں نے اپنے مذہب کی کتابوں کی خود ہی خدمت کر کے ان کو مستغنی کر دیا ہے۔

لیکن فقہ حنفی کے ساتھ یہ سانحہ ہوا کہ جن ملکوں میں احناف کی اکثریت ہے، وہاں کی حکومتوں کو دین ومذہب سے کم تعلق ہے؛ چنانچہ آج تک امام محمد کی ''کتاب الاصل'' کی بھی پوری جلدیں نہیں آسکیں،حاکم شہید کی ''الکافی'' کے لئے اب تک نگاہیں ترستی ہیں،محیط برہانی اور تاتارخانیہ جیسی اہم کتابیں ابھی کچھ عرصہ پہلے منظرِ عام پر آئی ہیں، نیز امام صاحب، ان کے تلامذہ، مشائخ مذہب اور محدثین احناف کی کتنی ہی تالیفات ہیں، جن کے نام ہم کتابوں میں پڑھتے ہیں،مگر وہ اہل علم کا سرمہ چشم نہیں بن سکیں،اللہ جزائے خیر دے حضرت مولانا ابوالوفاء افغانیؒ کو، کہ انھوں نے ''احیاء المعارف النعمانیہ'' قائم کر کے فقہ حنفی کی بعض بنیادی کتابوں کو اہل علم کی بارگاہ تک پہنچایا،اس سے پہلے غالباً لوگ امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ کی کتابوں کو دیکھنے سے بھی قاصر تھے،اس کے علاوہ بھی ہندوستان کے اہل علم نے اس پر خصوصی توجہ دی ہے، جب حدیث وفقہ کی اہم کتابیں عالم اسلام میں ناپید تھیں، اس وقت ہندوستان میں بعض قیمتی مخطوطات طبع ہوئے اور ہندوستان کے اصحابِ ذوق نے اہم ترین علمی ذخائر کو اہل علم کی بارگاہ تک پہنچایا،اس سلسلہ میں ماضی قریب کی شخصیتوں میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحبؒ،مولانا ابوالوفاء افغانیؒ،مولانا مہدی حسن شاہجہاں پوری،مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی وغیرہ کے نام خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔

ابھی بھی بے شمار مخطوطات ہیں جو منظر عام پر نہیں آپائے ہیں،اسی طرح بعض مخطوطات وہ ہیں جو اگرچہ طبع ہوئے ہیں؛لیکن ان میں اغلاط کی کثرت ہے،نصوص کی تصحیح پر توجہ کم دی گئی ہے،بعض کتابیں جن مصنفین کی طرف منسوب کر کے شائع کی گئی ہیں، علماء کے نزدیک اس کی نسبت بجائے خود مشکوک ہے؛ اس لئے ضرورت ہے کہ ہندوستان میں علمی وتحقیقی اکیڈمیاں اور اعلیٰ دینی تعلیمی درسگاہیں اس اہم خدمت کی طرف متوجہ ہوں۔

حضرات! المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد، جس کے قیام پر بارہ سال کا عرصہ گزر چکا ہے،اس کا مقصد صرف تعلیم وتعلم ہی نہیں ؛ بلکہ بحث وتحقیق اور برادران وطن میں دعوت اسلام اور اس کی تربیت بھی ہے؛ چنانچہ اب تک ۱۴۹ رموضوعات پر یہاں زیر تربیت فضلاء نے کام کیا ہے،جن میں سے عربی واُردو میں ۴۰ مقالات طبع ہو چکے ہیں، اور کام لیتے ہوئے چند جہتوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے،اول یہ کہ ایسے نئے مسائل پر ان سے کام کرایا جائے، جس کی موجودہ دور میں ضرورت ہے، دوسرے: ان موضوعات کا انتخاب کیا جائے جو اہل علم کے لئے نفع بخش ہیں، تیسرے: سلف کے وہ علوم جو مخطوطات کی شکل میں محفوظ ہیں،ان پر تعلیق وتحقیق؛ تاکہ وہ اہل علم کے لئے لائق استفادہ

ہوسکیں؛ چنانچہ ''الأدلۃ الشریعۃ علی مذہب أبی حنیفۃ، الفوائد الظہیریۃ، فتاویٰ سراجیہ، فتاویٰ غیاثیہ، تفسیرات أحمدیۃ، الکافی للشہید، مختصر شرح معانی الآثار لابن رشد المالکی'' پر اس وقت کام چل رہا ہے، اور شعبۂ حدیث میں تحقیق کے کام کے لئے ڈاکٹر حمید اللہؒ چیئر اور فقہ میں قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ چیئر قائم ہے، اس سال شعبۂ تحقیق کو مستقل حیثیت دیتے ہوئے اس کو ایک علاحدہ شعبہ کی حیثیت سے قائم کیا جارہا ہے، یہ شعبہ ابتداءً چھ رفقا پر مشتمل ہوگا، اسی مناسبت سے اس ورکشاپ کا انعقاد عمل میں آرہا ہے؛ تاکہ اس کام کے لئے افراد کار تیار ہوسکیں اور علماء ایک پیشہ کے طور پر نہیں؛ بلکہ اپنے سلف کی طرح ایک عبادت کے طور پر اسے انجام دیں، اگرچہ اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ کام کی وسعت کے لحاظ سے یہ ایک حقیر کوشش ہے؛ لیکن انسان اپنی صلاحیت کے مطابق کوشش کرنے کا مکلّف ہے، ایک ایک اینٹ کے جڑنے سے دیوار وجود میں آتی ہے اور ایک ایک قطرہ مل کر سمندر بنتا ہے، کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ اِس معمولی سی کوشش کو اِس طرف لوگوں کے متوجہ ہونے کا ذریعہ بنادے۔ **وما ذالک علی اللہ بعزیز.**

اخیر میں اپنے ان مہمانوں کا شکرگزار ہوں، جن کی تشریف آوری نے آج کے اس اجلاس کی رونق کو بڑھایا ہے، خاص کر محبّ گرامی مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی صاحب، پروفیسر اختر الواسع صاحب، پروفیسر محسن عثمانی صاحب، پروفیسر سید جہانگیر صاحب، پروفیسر عبد المعز صاحب اور ڈاکٹر فہیم اختر ندوی صاحب کا، جن کی آمد نے اس پروگرام کی وقعت میں اضافہ کیا ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ معہد کو اس کے بلند، وسیع مقاصد میں کامیاب فرمائے اور اسے دین کی دعوت وتحقیق کا اور حفاظت واشاعت کا مرکز بنادے۔ آمین

○ ○ ○

خانوادۂ فرنگی محل کی علمی خدمات اور فکری اعتدال ☆

خالد سیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين والصلاة والسلام على سيد المرسلين وعلى آله وأصحابه أجمعين ، ومن تبعهم بإحسان إلى يوم الدين .

صدر عالی قدر، علماء کرام اور دانش ورانِ ذی احترام! نہایت مسرت کا موقع ہے کہ اسلامک فقہ اکیڈمی کا یہ اہم پروگرام لکھنؤ جیسے گلستانِ علم وادب اور نگارستانِ تہذیب وثقافت میں منعقد ہو رہا ہے، لکھنؤ ہمیشہ سے علم وادب کا سرچشمہ رہا ہے، یہاں کے اصحابِ ذوق کے ذریعہ علم کی محفلیں سجتی اور شعر وسخن کی بزمیں آراستہ ہوتی رہی ہیں، سخن ورانِ لکھنؤ کی دھوم پورے ہندوستان میں رہی ہے؛ حالاں کہ اب لکھنؤ وہ لکھنؤ نہیں رہا اور حسین ولطیف اُردو زبان میں اُردو کے تلفظ کو بے لطف کر دینے والی ہندی کی آمیزش ہوگئی ہے؛ لیکن پھر بھی دارالعلوم ندوۃ العلماء جیسی عظیم درسگاہ اور اپنی مردم خیزی کی وجہ سے یہ شہر عالمی سطح پر شہرت و ناموری کا حامل ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ علمی خدمات اور قائدانہ صلاحیت کے لحاظ سے اتر پردیش ہندوستان کا دل ہے اور لکھنؤ اتر پردیش کا۔

اس شہر کو ماضی میں جن دبستان ہائے علم سے شہرت حاصل رہی ہے، ان میں ایک نمایاں ترین نام 'فرنگی محل' کا ہے، جس میں بڑے بڑے علماء وفقہاء اور مصنفین واہل قلم پیدا ہوتے رہے ہیں، کہنے کو یہ ایک خاندان ہے؛ لیکن اس کی علمی خدمات بڑے بڑے اداروں اور اکیڈمیوں کے ہم پلہ ہیں، خانوادۂ فرنگی محل میز بانِ رسول حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے نسبی تعلق رکھتا ہے، حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے آفتاب نبوت کی میز بانی کی تھی اور اس خاندان نے علوم نبوت کی میز بانی کی ہے؛ چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی کی عام روایت اُصول فقہ اور جدید مسائل پر سیمینار کی رہی ہے نہ کہ شخصیتوں اور اداروں کی خدمات پر؛ لیکن فرنگی محل کی غیر معمولی علمی اور خاص کر فقہی خدمات کی وجہ سے اس عنوان کا انتخاب کیا گیا، جو اکیڈمی کی طرف سے اس نوعیت کا پہلا پروگرام ہے۔

حضرات! لکھنؤ کے فرنگی محل کی تاریخ اصل میں بارہ بنکی کے گم نام قصبہ ''سہالی'' سے شروع ہوتی ہے،

☆ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے زیر اہتمام ''علماء فرنگی محل — حیات وخدمات'' کے موضوع پر منعقدہ سیمینار میں دیا جانے والا کلیدی خطبہ۔

جہاں اپنے عہد کے بڑے عالم اور منقولات ومعقولات کے ماہر استاذ ملا قطب الدین درس دیتے ہوئے ۱۹/رجب ۱۱۰۳ھ مطابق ۲۷/مارچ ۱۶۹۲ء کو شہید کر دیئے گئے، یہ حادثہ ایسا جان کاہ تھا کہ ملا صاحب کے بعض لڑکوں نے اورنگ زیب عالمگیرؒ کے پاس استغاثہ کیا کہ ان کا خاندان یہاں سے ہجرت کرنا چاہتا ہے اور انصاف پرور بادشاہ نے لکھنؤ میں فرانسیسی تاجر کی وہ کوٹھی عنایت کر دی، جو فرنگی محل کہلاتی تھی، کسے معلوم تھا کہ فرنگیوں کا یہ محل علوم اسلامی کی اشاعت کا محل بن جائے گا اور دور دور سے تشنگانِ علوم یہاں آکر سیراب ہوا کریں گے؛ چنانچہ ملا قطب الدین کے صاحبزادے ملا نظام الدین نے یہاں اپنے والد کی درسگاہ کی نشاۃ ثانیہ کی اور تعلیمی سلسلہ شروع کیا، اسے ایسی پذیرائی حاصل ہوئی ہے کہ نہ صرف ان کا مقرر کیا ہوا نصاب ''درس نظامی'' کہلایا؛ بلکہ اس کے باوجود کہ اب یہ نصاب غیر معمولی تبدیلی کے ساتھ مختلف درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے اور ملا نظام کے مقرر کئے ہوئے نصاب کی چند کتابیں ہی اس میں باقی رہ گئی ہیں، پھر بھی اسے ''درس نظامی'' ہی کہا جاتا ہے۔

فرنگی محل کا خانوادہ جلیل القدر علماء کی کثرت اور علمی خدمات کے تسلسل کے اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ ہندوستان میں ایک انفرادی شان کا حامل ہے اور اس خاندان کے علماء کی تصانیف کا اگر جامع تذکرہ مرتب کیا جائے تو یقیناً کم سے کم ایک ضخیم جلد کی ضرورت ہوگی، ان علماء میں بحر العلوم ملا عبد العلیؒ (م:۱۸۱۰ء) ملا محمد مبینؒ (م:۱۸۱۰ء) ملا حسنؒ، مولانا عبد الحلیم فرنگی محلیؒ (م:۱۸۶۸ء) مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ (م:۱۸۸۶ء) اور مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ (م:۱۹۲۶ء) خصوصیت سے قابل ذکر ہیں، بحر العلوم نے اُصول فقہ میں ''ارکانِ اربعہ، حاشیہ زاہدیہ'' تالیف فرمائی، ''منار'' کی فارسی شرح ''تنویر الابصار'' کے نام سے تالیف کی، ''شرح صدر شیرازیؒ'' پر حاشیہ لکھا، ''مثنوی مولانا رومؒ'' کی شرح فرمائی، ''فقہ اکبر'' کی شرح کی اور متعدد تصنیفات ان کی یادگار ہیں؛ لیکن جس کتاب نے ان کو شہرت دوام عطا فرمائی، وہ ہے ''مسلم الثبوت'' کی مبسوط شرح ''فواتح الرحموت''، جس کا شمار اب اُصولِ فقہ حنفی کے اہم مراجع میں ہوتا ہے اور جسے عالم عرب میں بھی غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی ہے۔

ملا محمد مبین فرنگی محلیؒ نے بھی ''سلم'' اور ''مسلم الثبوت'' کی شرح لکھی اور ''میر زاہد ملا جلال'' پر حاشیہ لکھا، فقہ میں ان کا ایک اہم رسالہ ''کنز الحسنات فی ایتاء الزکوۃ'' ہے، جس میں مقدار نصاب پر بڑی اچھی گفتگو کی گئی ہے، یہ اپنے زمانہ کے امام المعقولات سمجھے جاتے تھے، مولانا عبد الحلیم فرنگی محلیؒ — جو مولانا عبد الحی فرنگی محلیؒ کے والد ہیں — بھی بڑے علماء میں تھے، مولانا عبد الحی صاحبؒ نے اپنے رسالہ ''حسرۃ العالم بوفاۃ مرجع العالم'' میں ان کے حالات لکھتے ہوئے ان کی ستائیس تالیفات کا ذکر کیا ہے، جن میں ''نور الانوار'' کے حاشیہ ''قمر الاقمار'' کو خاص شہرت حاصل ہوئی ہے۔

اس خاندان کی اخیر دور کی شخصیات میں ایک اہم نام مولانا عبد الباری فرنگی محلیؒ (م:۱۹۲۶ء) کا ہے، ''تذکرۂ

علماء فرنگی محل'' کے مصنف نے ان کی ایک سودس تصنیفات کا ذکر کیا ہے، جن میں بہت سی تالیفات فقہ اور اُصولِ فقہ سے متعلق ہیں، آپ نے بھی ''مسلم الثبوت'' کی ایک شرح ''ملہم الملوک'' کے نام سے تالیف فرمائی ہے، آپ نے تصنیف وتالیف کے علاوہ قومی وملی جدوجہد میں بھی حصہ لیا ہے اور تحریک خلافت میں بھی شامل رہے ہیں۔

اس خاندان کے گلِ سرسبد اور شجر سدا بہار شخصیت کا ذکر میں اخیر میں کررہا ہوں اور ان کے اس تذکرہ کو مسک ختام تصور کرتا ہوں، میری مراد محدثِ جلیل اور فقیہ بے مثیل حضرت مولانا عبدالحیؒ فرنگی محلیؒ (م:۱۸۸۶ء) سے ہے، جو اسلامی اور عربی علوم میں نابغۂ روزگار اور درآبدار کی حیثیت رکھتے تھے، آپ کی تقریباً سو تالیفات ہیں اور ہر کتاب گویا اپنے موضوع پر حرفِ آخر ہے، اُصولِ حدیث میں ''الرفع والتکمیل'' اور ''الاجوبۃ الفاضلۃ'' ایسی تالیفات ہیں کہ اُصولِ حدیث کے پورے کتب خانہ میں شاید ہی ان کی مثال مل سکے، یہ اسلاف کے افکار وشخصیات کا عطر ہے اور اخلاف کے لئے خضرِ طریق ہے، اسی طرح فقہ میں ''شرح وقایہ'' کی شرح ''السعایۃ'' اگرچہ نامکمل ہے؛ لیکن حدیث وفقہ کے استیعاب کے اعتبار سے ایک بے نظیر کتاب ہے، اگر یہ کتاب مکمل ہوجاتی تو فقہی متون کی شرح میں یقیناً لا جواب تالیف ہوتی، اسی طرح ''شرح وقایہ'' کا حاشیہ ''عمدۃ الرعایۃ'' اختصار کے ساتھ جامعیت اور حل مشکلات کے لئے نمونہ کا درجہ رکھتی ہے، صرف ۳۹ سال کی حیات مستعار پانے کے باوجود آپ نے جو عظیم علمی خدمات انجام دی ہیں اور جو تالیفی ورثہ چھوڑا ہے، وہ علماء متقدمین کی یاد دلاتا ہے، مولانا کی تالیفات تو بجائے خود گراں قدر ہیں ہی، ان کے عاشق نادیدہ شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ کی تعلیقات مولانا لکھنوی کی تحریروں کو نہ صرف متعارف کرانے میں ممد ومعاون رہی ہیں؛ بلکہ ان کے ذریعہ ان کتابوں کی قدر وقیمت میں بھی اضافہ ہوگیا ہے۔

حضرات ! فرنگی محل کے علماء کی کاوشیں اگرچہ مختلف علوم وفنون میں اپنے جوہر دکھاتی رہی ہیں اور اس زمانے کے مزاج ومذاق کے مطابق معقولات ان کی خاص جولان گاہِ فکر رہا ہے؛ لیکن شاید ان کا سب سے بڑا علمی اور تصنیفی ذخیرہ فقہ اور اُصولِ فقہ میں ہے، اس موضوع پر بڑی ہی بلند پایہ کتابیں اس خانوادۂ علمی کا اثاثہ ہیں اور وہ اپنی اہمیت اور افادیت کی وجہ سے اصحابِ علم اور اہل ذوق کی آنکھوں کا سرمہ بنتی رہی ہیں، فقہی تالیفات کے علاوہ فرنگی محل میں بالکل ابتدائی دور سے ہی فتاویٰ نویسی کا سلسلہ رہا ہے، اس حقیر کے رفیقِ درس ڈاکٹر اشتیاق احمد اعظمی نے اپنے پی ایچ ڈی کے مطبوعہ مقالہ ''اودھ میں افتاء کے مراکز اور ان کی خدمات'' میں ان کا تفصیلی تعارف پیش کیا ہے، اللہ کا شکر ہے کہ فرنگی محل کا یہ علمی اور تعلیمی مرکز آج بھی زندہ ہے اور حضرت مولانا ابوطیب احمد میاں فرنگی محلی اور ان کے لائق فرزند جناب مولانا خالد رشید ندوی کے ذریعہ اسے ایک نئی زندگی حاصل ہورہی ہے، خدا کرے یہاں کی بہار رفتہ واپس آئے اور یہ چراغ چراغ گھر بار ہوجائے، جس کی روشنی دور تک اور دیر تک پہنچتی رہے۔

حضرات ! فرنگی محل کی فقہی خدمات کا ذکر کرتے ہوئے ایک خاص پہلو جس کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے،

اس کو واضح کرنے کی ضرورت ہے، جس سے صرفِ نظر کر جانا ناانصافی اور زمانہ ناشناسی ہوگی اور وہ ہے فرنگی محل کا مسلکِ اعتدال — بعض اعتقادی اور عملی مسائل جن میں شاہ اسماعیل شہیدؒ، حلقۂ دیوبند اور حلقۂ بدایوں کے درمیان اختلاف رائے پایا جاتا تھا اور اب بھی پایا جاتا ہے، ان میں فرنگی محل کے علماء وارباب افتاء کے درمیان بھی اختلاف رائے رہا ہے اور دومختلف نقاطِ نظر پائے گئے ہیں؛ لیکن اس اختلاف نے حد اعتدال سے تجاوز نہ کیا اور اس اختلاف کی وجہ سے فریق مخالف کی تکفیر وتفسیق نہیں کی گئی؛ بلکہ اسے راجح اور مرجوح کا اختلاف سمجھا گیا، یہ بھی ایک خوش گوار حقیقت ہے کہ علماء فرنگی محل ہمیشہ تصوف کے قائل اور مشائخ صوفیہ سے مربوط رہے ہیں؛ لیکن اس کے باوجود حدیثِ نبوی سے بھی ان کا رشتہ استوار رہا؛ اسی لئے ہمیں یہاں ہر دور میں ایسے علماء نظر آتے ہیں، جو ایک طرف تصوف کے ان اشغال کی تائید وتقویت میں قلم اُٹھاتے ہیں، جن کا فی الجملہ احادیث وآثار سے ثبوت ہے اور ان اشغال کا رد بھی کرتے ہیں، جن کے لئے قرونِ اولیٰ میں کوئی نظیر نہیں اور جن کی سرحدیں بدعت؛ بلکہ بعض اوقات شرک سے جاملتی ہے۔

یہی حال فقہی مسائل واحکام کا ہے، خاص کر مولانا عبدالحیؒ صاحبؒ کے یہاں مسائل فقہیہ میں جو اعتدال ملتا ہے اور شارع کی نصوص اور فقہاء کے اجتہادات میں — تقلید پر قائم رہنے کے باوجود — ہم آہنگی پیدا کرنے کی جو کوشش نظر آتی ہے، وہ علماء کے لئے ایک مثال ہے، اگر چہ ہندوستان میں تمام ہی مکاتبِ فکر اپنی نسبت مسند الہند حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی طرف کرتے ہیں؛ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ اس دعویٰ میں کس حد تک صادق القول ہیں اور اگر شاہ ولی اللہ صاحب اس دور میں پیدا ہوتے تو ان کے افکار وخیالات پر ان حضرات کا کیا ردعمل ہوتا؛ لیکن مولانا عبدالحیؒ صاحب واقعی فکر ولی اللہی کے امین؛ بلکہ اس کے نقیب وترجمان تھے۔

انھوں نے متعدد مواقع پر اپنے حنفی ہونے کا ذکر کیا ہے اور وہ عموماً دوسرے مذاہب کے احترام کے ساتھ حنفیہ کے نقطۂ نظر کی بھر پور وکالت بھی کرتے ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ متأخرین احناف کی بعض آراء پر نقد بھی کرتے ہیں، نیز فقہاء کے درمیان پائے جانے والے اختلافِ رائے کو پورے انصاف اور عدل کے ساتھ پیش کرتے ہیں، مثلاً خواتین کی جماعت کو بہت سے فقہاء احناف نے مکروہ قرار دیا ہے؛ لیکن مولانا نے اپنے رسالہ ''تحفۃ النبلاء'' میں تفصیل سے اس موضوع کی احادیث وآثار پیش کی ہیں اور فقہاء نے کراہت کے جو اسباب لکھے ہیں، ان کا تفصیلی تجزیہ کرتے ہوئے لکھا ہے :

> ...... وبعد التسليم لا دلالة على كراهة التحريم أصلا ، بل لو دل فإنما يدل على فضيلة صلاة الإنفراد . (۱)

---

(۱) تحفۃ النبلاء فی جماعۃ النساء: ۹۱۹۔

......اس بات کوتسلیم کرلیا جائے تب بھی عورتوں کی جماعت کے مکروہ تحریمی ہونے پر کوئی دلیل موجودنہیں ہے؛ بلکہ یہ دلالت کرتی ہےتو صرف اس بات پر کہ عورتوں کا تنہا نماز پڑھنا بہتر ہے۔

مولانا نے اپنی تالیفات میں ہمیشہ اس بات کو پیش نظر رکھا ہے کہ اصحاب مذہب کے اقوال اصل ہیں اورمشائخ مذہب کے اقوال کو وہ اہمیت حاصل نہیں، انھوں نے حنفیہ کی مدافعت میں بھی اس بات کوملحوظ رکھا ہے، مثلاً فرماتے ہیں :

فإنهم طعنوا في كثير من المسائل المدرجة في فتاوى الحنفية أنها مخالفة للأحاديث الصحيحة أو أنها ليست متأصلة على أصل شرعي ، ونحو ذلك ، جعلوا ذلك ذريعة إلى الطعن على الأئمة الثلاثة ظناً منهم أنها مسائلهم ومذاهبهم وليس كذلك ، بل هي تفريعات المشايخ ، استنبطوها من الأصول المنقولة عن الأئمة ، فوقعت مخالفة للأحاديث الصحيحة فلا طعن بها على الأئمة الثلاثة ، ولا على المشايخ أيضا ، فإنهم لم يقرروها مع علمهم بكونها مخالفة للأحاديث . (۱)

ان لوگوں نے بہت سے ایسے مسائل کے متعلق جوحنفیہ کے فتاویٰ میں بعد میں داخل کئے گئے ہیں، اعتراض کیا ہے کہ یہ صحیح احادیث کے خلاف یا یہ کسی شرعی اُصول پر قائم نہیں ہیں وغیرہ — ان لوگوں نے اس کو لے کر امام ابوحنیفہؒ، امام ابو یوسفؒ اور امام محمدؒ پر یہ سمجھتے ہوئے تنقید کی ہے کہ یہ ان کے مسائل اوران کی آراء ہیں؛ حالاں کہ ایسا نہیں ہے؛ بلکہ یہ مشائخ کی تفریعات ہیں، انھوں نے ائمہ منقول اُصول کی بنیاد پر ان کو مستنبط کیا ہے؛ چنانچہ وہ احادیث صحیح کے خلاف ہوگئی ہیں، ان کو لے کر ائمہ ثلاثہ پر طعن کرنا درست نہیں ہے؛ بلکہ مشائخ پر بھی لعن کرنا درست نہیں ہے، ان حضرات نے ان کو حدیث کے خلاف جاننے کے باوجود ان آراء کا اظہار نہیں کیا ہے۔

اسی طرح اگر کسی مسئلہ میں احناف کے مختلف اقوال ہوں تو جو قول حدیث سے قریب تر ہوتا ہے، مولانا اسے ترجیح دیتے ہیں، جیسے وضو کے شروع میں بسم اللہ کہنے کا مسئلہ ہے کہ اس میں ایک قول اس کے واجب ہونے کا ہے،

(۱) النافع الکبیر:۲۱۔

جس کی طرف علامہ ابن ہمامؒ کا میلان ہے، مولانا نے ظاہر حدیث سے موافقت کی وجہ سے اس کو ترجیح دیتے ہوئے فرمایا ہے: ''وأصحها وأحسنها''(۱) — اسی طرح وضو میں گردن کے مسح کو بعض فقہاء نے سنت قرار دیا اور بعض نے بدعت ومکروہ کہا ہے ومولانا نے اپنے رسالہ تحفۃ الطلبہ فی تحقیق مسح الرقبۃ'' میں اس بات کو ترجیح دیا ہے کہ گردن کا مسح نہ سنت ہے اور نہ بدعت؛ بلکہ مستحب ہے یا ادب کے درجہ میں ہے، اختلافی مسائل میں غالباً مولانا کا سب سے تفصیلی رسالہ'' قراءت فاتحہ خلف الامام' کے موضوع پر''امام الکلام مع غیث الغمام'' ہے، جس میں حدیث اور رجال کی بڑی نفیس بحثیں آ گئی ہیں، اس رسالہ میں مولانا نے حنفیہ کے دلائل کو بڑی قوت کے ساتھ پیش کیا ہے، لوگوں کی بے اعتدالی کا رونا رویا ہے اور علماء مقلدین سے گلہ کیا ہے کہ وہ ہر جگہ اس قاعدہ پر قائم رہتے ہیں کہ ہمارا مذہب صحیح ہے، گو اس میں خطا کا احتمال بھی ہے اور اس کے مقابلہ میں دوسرا مذہب خطا پر مبنی ہے، گو اس میں صواب کا احتمال بھی پایا جاتا ہے، نیز یہ بات اس وقت بھی کہی جاتی ہے جب اپنے مذہب کے خلاف واضح نصوص موجود ہوں۔

مولانا نے اس رسالہ کے اخیر میں جو رائے قائم کی ہے، وہ یہ ہے کہ مقتدی پر قراءت فرض نہیں ہے؛ البتہ سری نمازوں میں سورہ فاتحہ کا پڑھ لینا مستحب یا مسنون ہے، اگرچہ یہ مذہب کا قولِ ضعیف ہے؛ لیکن درایت کے اعتبار سے قوی ہے اور جو قول درایت کے مطابق ہو وہ قابل ترجیح ہے: ''ولا یعدل عن الدرایۃ إذا وافقها روایۃ'' (ص:۲۶۶) پھر آگے شاہ ولی اللہ صاحبؒ کا قول نقل کر کے ان کے نقطۂ نظر کی تائید کرتے ہیں کہ جہری نماز میں بھی سکتہ کے وقت سورۂ فاتحہ کو پڑھنے کی گنجائش ہے، (ص:۲۶۸) اسی رسالہ کے اخیر میں نماز جنازہ میں سورۂ فاتحہ کی قراءت پر گفتگو کی گئی ہے، جس کا ماحصل یہ ہے کہ نمازِ جنازہ میں سورۂ فاتحہ پڑھنا چوں کہ بعض صحابہ سے ثابت ہے؛ اس لئے اس کو مکروہ کہنا درست نہیں؛ البتہ ضروری نہیں ہے، (ص:۲۷۳) یہ ضروری نہیں کہ ان مسائل میں مولانا کے نقطۂ نظر سے اتفاق کر لیا جائے؛ لیکن اس سے مسائل فقہیہ میں آپ کا اعتدال معلوم ہوتا ہے، آپ نے عصام ابن یوسف کا ذکر کرتے ہوئے نقل کیا ہے کہ وہ حنفی تھے؛ لیکن نماز میں رکوع سے پہلے رفع یدین کے قائل بھی تھے، پھر لکھا ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی حنفی بعض مسائل میں نصوص کی بنیاد پر دوسرے فقہاء کی رائے کو لے لے تو اس کی وجہ سے وہ حنفیت کے دائرہ سے باہر نہیں ہو جاتا۔

غرض کہ آپ کی ذات فقہاء احناف کے نقطۂ نظر پر وسیع نگاہ اور گہرے مطالعہ کے باوجود نصوص سے اعتناء، دوسرے مسالک کا احترام اور تقلید میں اعتدال کی بہترین مثال ہے، افسوس کہ مولانا لکھنویؒ اور نواب صدیق حسن خانؒ کے درمیان بعض اختلافات نے شدت اختیار کر لی اور اس کے نتیجہ میں'' ابراز الغی''، '' تذکرۃ الراشد'' اور''تنبیہ ارباب الخبرۃ'' جیسی تالیفات آپ کے قلم سے آئیں، جو مولانا کے عمومی مزاج سے ہم آہنگ نہیں تھیں؛

---

(۱) أحكام القنطرة فی أحكام البسملة:۳۳۔

لیکن نواب صاحب نے تقلید اور مقلدین کے بارے میں جو سخت لب ولہجہ اختیار کیا، یہ اس کا فطری ردعمل تھا؛ لیکن پھر بھی اپنے رسالہ ''ابراز الغی'' کی ابتدا میں نواب صاحب کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں :

وهو العالم الجليل والفاضل النبيل مجمع الكمالات الإنسية منبع الفضائل الحميدة النواب السيد صديق حسن خان بهادر دام اقباله . (۱)

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ایک طرف ان دونوں معاصر اہل علم کے درمیان تحریری مناظرہ جاری تھا؛ لیکن دوسری طرف صورتِ حال یہ تھی کہ مولانا جب کبھی بھوپال تشریف لے جاتے تو نواب صاحب کے یہاں قیام فرماتے اور نواب صاحب جب لکھنؤ آتے تو مولانا ان کے میزبان ہوتے ، نیز مولانا کی وفات پر نواب صاحب نے سخت غم واندوہ کا اظہار کرتے ہوئے سوگ کا اعلان کیا تھا۔

حضرات ! اس حقیر نے خاتم الفقہاء حضرت مولانا عبد الحئ فرنگی محلیؒ کا ذکر کرتے ہوئے کسی قدر تفصیل سے اس جہت کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ آج کے حالات میں خاص طور پر علماء کو راہِ اعتدال اختیار کرنے کی ضرورت ہے؛ کیوں کہ یہود ونصاریٰ اور اعداء اسلام عام مسلمانوں کو جغرافیائی، نسبی اور لسانی بنیادوں پر اور مذہب سے مربوط مسلمانوں کو مسلکی اساس پر تقسیم کرنے کے درپے ہیں اور اس طرح وہ اُمت کے ٹکڑے کرنے اور ان کی صفوں کو بکھیرنے میں کامیاب ہوتے جارہے ہیں؛ اس لئے ضرورت ہے کہ علماء نقش دیوار کو پڑھیں، دشمنوں کی چال کا ادراک کریں، حکمت سے کام لیں، اپنے اختلافات کو حدود میں رکھیں اور اعتدال کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ دیں کہ دین وشریعت اصل ہے اور مسلک ومشرب ان کے تابع، اگر مسلکی تعصبات اُمت کے دینی وجود کو خطرہ میں ڈال دیں تو یقیناً علم کے تقاضوں سے بے خبری اور علماء کی اپنے فریضۂ منصبی کی ادائیگی میں کوتاہی ہے۔

حضرات ! اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کی بنیاد ۱۹۸۹ء میں حضرت مولانا قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ نے رکھی، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ ، حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانیؒ ، حضرت مولانا مفتی نظام الدین اعظمیؒ ، حضرت مولانا ابوالسعود احمد باقویؒ اور حضرت مولانا عبد الرحیم لاجپوریؒ جیسے اکابر علم کی سرپرستی میں اس کاروانِ فکر ونظر نے اپنا سفر شروع کیا، آج بھی حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی، حضرت مولانا محمد سالم قاسمی اور حضرت مولانا سید نظام صاحب جیسے اکابر ملت کی رہنمائی اسے حاصل ہے اور اس کے انتظام وانصرام میں ہندوستان کے ممتاز علماء فقہ کا حصہ ہے، جو اس کی مجلس انتظامی کے ارکان ہیں، بانی اکیڈمی کے بعد ممتاز صاحب افتاء اور معروف مصنف حضرت مولانا مفتی محمد ظفیر الدین مفتاحیؒ کو باتفاق رائے اس کا صدر منتخب کیا گیا تھا، ان کی قیادت میں اس

(۱) ابراز الغی :۳۔

قافلہ نے تیز رفتاری کے ساتھ اپنا علمی سفر طے کیا، ابھی دو ماہ پہلے ان کی وفات ہوگئی ہے، دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی بال بال مغفرت فرمائے اور اکیڈمی کو ان کا بدل عطا کرے۔

اکیڈمی جہاں اپنے سالانہ فقہی سیمیناروں کے ذریعہ علماء کے اجتماعی غور وفکر کے واسطہ سے نئے مسائل کا حل پیش کرتی ہے، وہیں نو جوان فضلاء کی تربیت کے لئے ورکشاپ بھی منعقد کرتی ہے اور مختلف فکری اور فقہی موضوعات پر سیمینار وسمپوزیم بھی رکھتی ہے، یہ پروگرام اسی کا ایک حصہ ہے، اس طرح ہمیں اپنے بزرگوں کی خدمات کو یاد کرنے اور ان کو نمونہ بنا کر عمل کرنے کا موقع ملے گا کہ جو قومیں اپنے ماضی کو یاد نہیں رکھتیں، ان کے لئے مستقبل کا سفر طے کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور وہ احساس کمتری اور کم حوصلگی میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔

ہم آخر میں حضرت مولانا ابوالطیب احمد میاں فرنگی محلی اور ان کے صاحب زادگان مولانا طارق رشید ندوی اور مولانا خالد رشید ندوی، نیز ان کے رفقاء کار، شہر کے حاضرین اور مقالہ نگاروں کا شکریہ ادا کرتے ہیں کہ ان ہی کی عنایت وتوجہ سے فکر ونظر کی یہ محفل سجائی گئی ہے اور دُعاء کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اس پروگرام کو اپنے مقصد میں کامیاب فرمائے، فرنگی محل کی علمی خدمات میں تسلسل قائم رہے اور اس جگہ کو علمی وفکری خدمات کا بہترین مرکز بنائے۔

وباللہ التوفیق ، وھو المستعان .

○ ○ ○

موسوعہ فقہیہ اوراس کا اُردوترجمہ ☆

خالدسیف اللہ رحمانی

الحمد لله رب العالمين والصلوٰة والسلام علىٰ سيد المرسلين وعلىٰ آلهٖ وصحبه أجمعين ومن تبعهم بإحسان إلىٰ يوم الدين .

بزرگانِ محترم، صدر عالی قدر! یہ ایک حقیقت ہے کہ اسلامی علوم میں فقہ کوخصوصی اہمیت حاصل ہے، ایک طرف اس کا مصدر ومنبع کتاب اللہ اورسنت رسول ہے اور پورا فقہی ذخیرہ براہ راست یا بالواسطہ اس سے ماخوذ ہے، جوعلم صحیح ومعصوم کا سب سے اہم ذریعہ ہے، دوسری طرف یہ پوری طرح انسانی زندگی سے مربوط ہے اور دنیا میں آنے سے لے کر جانے تک زندگی کے ایک ایک لمحہ اور انسان کی متنوع حیات مستعار کے ایک ایک گوشہ میں رہنمائی کرتا ہے، اس لئے ہر دور میں فقہ اسلامی اپنے عہد کی عظیم علمی شخصیتوں کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔

موجودہ دور چوں کہ صنعتی ترقی، وسائل ابلاغ اور ذرائع مواصلات کے فروغ اور نئے افکار ونظریات کے ظہور کا دور ہے اوران ترقیات کی وجہ سے پوری دنیا ایک گاؤں میں تبدیل ہوچکی ہے؛ اس لئے نئے مسائل کے پیدا ہونے کی رفتار گذشتہ صدیوں کے مقابلہ کہیں تیز ہے، فقہاء ہی ان مسائل کا حل پیش کرسکتے ہیں اور مسلمانوں کی رہنمائی کرسکتے ہیں کہ وہ بدلے ہوئے حالات میں کس طرح اپنے مسائل پر احکام شریعت کو منطبق کریں؟ اس لئے عصر حاضر میں بھی فقہ اسلامی کو علماء ومحققین کی خصوصی توجہ حاصل رہی ہے۔

اس دور میں جوفقہی خدمات انجام دی گئیں ہیں، ان کو ہم بنیادی طور پر تین زمروں میں تقسیم کرسکتے ہیں:

منہج فقہ، اُصولِ فقہ اوراحکامِ فقہ — فقہی منہج کے سلسلہ میں دو باتیں خاص طور پر قابل لحاظ ہیں :

الف : رسول اللہ ﷺ نے احکام شریعت پرغور کرنے کا انفرادی طریقہ بھی بتایا اوراجتماعی بھی، انفرادی اجتہاد کی اصل وہ حدیث ہے، جوحضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو یمن بھیجے جانے کے واقعہ سے متعلق ہے :

إن رسول الله صلى الله عليه وسلم لما أراد أن يبعث معاذاً إلى اليمن

☆ تعارفی کلمات جوبہ موقع تقریب رسم اجراء اُردوترجمہ موسوعہ فقہیہ پیش کئے گئے۔

قال : (كيف تقضي إذا عرض لک قضاء) ، قال : اقضى بكتاب الله ، قال : (فإن لم تجد في كتاب الله ؟) قال : فبسنة رسول الله صلى الله عليه وسلم ، قال : (فإن لم تجد في سنة رسول الله صلى الله عليه وسلم ولا فى كتاب الله ؟) قال : أجتهد برأيى ولا آلو ، فضرب رسول الله صلى الله عليه وسلم صدره فقال : (الحمد لله الذي وفق رسول رسول الله صلى الله عليه وسلم لما يرضي رسول الله) . (۱)

اوراجتماعی اجتہاد کی نظیر حضرت علیؓ کی یہ روایت ہے :

قلت : يا رسول الله صلى الله عليه وسلم إن نزل بنا أمر ليس فيه بيان أمر ولا نهي ، فما تأمرنا ؟ قال : تشاوروا الفقهاء والعابدين ولا تمضوا فيه رأي خاصة ، رواه الطبراني في المعجم الأوسط ، ووثق رواته الهيثمي وقال : رجاله موثقون من أهل الصحيح . (۲)

صحابہ میں حضرت عمرؓ نے، تابعین میں مدینہ کے فقہاء سبعہ نے اور ائمہ متبوعین میں امام ابوحنیفہؒ نے خاص طور پر اس منہج کو اختیار کیا، موجودہ دور میں علم وتحقیق کے میدان میں کم حوصلگی، ورع وتقویٰ اور خشیتِ الٰہی میں کمی اور صورت مسئلہ سے علماء شریعت کی اس بناء پر کم آگہی —— کہ وہ جدید سائنسی تحقیق سے متعلق ہیں —— کی وجہ سے اجتماعی طریقہ اجتہاد ہی محفوظ اور آسان راستہ ہے، اس لئے اس دور میں نئے مسائل کی بابت اجتماعی اجتہاد کی طرف رجحان بڑھا ہے؛ اسی پس منظر میں عالم اسلام میں بھی اور غیر مسلم اکثریت ممالک میں بھی مجامع فقہیہ قائم کی گئی ہیں، انھیں میں سے ایک ''اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا'' بھی ہے۔

ب : دوسرا اہم رجحان تقلید کے باوجود حسبِ ضرورت مختلف دبستانِ فقہ سے استفادہ کا ہے؛ کیوں کہ اس دور میں جو مسائل پیدا ہوئے ہیں، کسی ایک فقہ کے دائرہ میں رہتے ہوئے ان کو حل کرنا دشوار ہے؛ اس لئے ہندوستان اور اس جیسے ممالک جہاں اُمت اسلامیہ کا تعامل تقلید پر ہے اور جہاں علماء اور اصحابِ فکر بجا طور پر اسے دین پر چلنے کا محفوظ طریقہ سمجھتے ہیں، وہاں بھی ایک دبستانِ فقہ سے وابستگی کے باوجود دوسرے مکاتب فقہ سے

(۱) أبوداود، حدیث نمبر:۳۵۹۲، باب اجتهاد الرأى في القضاء، نیز دیکھئے: سنن ترمذي ، باب ماجاء في القاضي كيف يقضي؟ حدیث نمبر:۱۳۲۲۔

(۲) مجمع الزوائد:۱/۱۷۸۔

استفادہ کا رجحان بڑھا ہے؛ کیوں کہ تمام فقہاءِ سلف کے اجتہادات شریعت ہی کے دائرہ میں ہیں اور ایک فقہ سے دوسری فقہ کی طرف عدول ''ہجرت من الدین اِلی الدین'' ہے نہ کہ ''ہجرت من الدین اِلی الدنیا''، اسی لئے اس دور میں فقہ مقارن پر متعدد اعلیٰ درجے کی تصنیفات بھی منظر عام پر آئی ہیں۔

فقہی اُصول وقواعد کے سلسلہ میں دو کام بڑے اہم ہوتے ہیں :

الف : تقعید —— یعنی فقہی قواعد سازی، قواعد فقہ کا موضوع ویسے بہت قدیم ہے، احادیث وآثار میں بھی بعض قواعد ہیں، امام محمد اور امام شافعی کی کتابوں میں بھی بہت سے قواعد مل جاتے ہیں اور چوتھی صدی ہجری اور اس کے بعد اس فن پر درجنوں کتابیں لکھی گئی ہیں؛ لیکن موجودہ دور میں فقہی قواعد وضوابط کے استقراء اور تتبع کی جو کاوشیں ہو رہی ہیں، وہ قواعد فقہیہ کی تاریخ کا ایک روشن باب ہے، جس میں مختلف فقہی ابواب سے متعلق قواعد کو جمع کرنے، کتاب وسنت سے ان کی اصل تلاش کرنے اور فقہاء کے اجتہادات کی روشنی میں یہ متعین کرنے کی کوشش کی جارہی ہے کہ کن کن ابواب میں یہ قاعدہ قابل عمل ہے؟ نیز نئے مسائل کے حل میں ان سے مدد لینے کا عمومی رجحان پیدا ہوا ہے، اس سلسلہ میں ''مجمع الفقہ الاسلامی الدولی، جدہ'' کے زیر نگرانی جو کام ہو رہا ہے، وہ بہت ہی قابل تحسین ہے اور جب یہ کام مکمل ہوگا تو اپنے موضوع پر انشاء اللہ ایک انسائیکلوپیڈیا ہوگا۔

ب : دوسرا اہم کام ''مقاصدِ شریعت'' سے متعلق اُصول کی تنقیح وتوضیح کا ہے، یوں تو مقاصدِ شریعت کا ذکر امام غزالیؒ، امام الحرمینؒ، علامہ عز الدین ابن عبدالسلامؒ وغیرہ نے بھی کیا ہے اور متاخرین میں علامہ ابواسحٰق شاطبیؒ نے اس پر نہایت بصیرت مندانہ اور چشم کشا گفتگو کی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ انھوں نے شریعت کے مقاصد ومصالح کو منقح کر کے غور وفکر کا ایک نیا راستہ لوگوں کو دکھایا ہے؛ لیکن موجودہ دور میں مقاصدِ شریعت پر خصوصی توجہ دی گئی ہے؛ بلکہ اسے ایک مستقل علم کی حیثیت سے متعارف کرایا جارہا ہے؛ اگرچہ یہ بات قابل غور ہے کہ کیا محض مقاصد کو سامنے رکھ کر فتاویٰ دیئے جاسکتے ہیں اور یہ کہنا مداہنت ہوگا کہ ''مقاصد شریعت'' کو سامنے رکھتے ہوئے بعض اہل علم کی طرف سے جو اجتہادات سامنے آرہے ہیں، وہ سب کے سب قابل قبول ہیں؛ لیکن بہر حال شریعت اسلامی کی منطقیت، اس کی عقل وفطرت سے ہم آہنگی اور شریعت کے مزاج ومذاق کو سمجھنے کے لئے ان اُصولوں کی بڑی اہمیت ہے۔

احکامِ فقہ کے سلسلہ میں ایک کام تو اجتہاد واستنباط کا ہوا ہے، اور وہ ہے اس دور میں پیدا ہونے والے نئے معاشی اور سیاسی اداروں کے اسلامی متبادل کی تلاش، جیسے: اسلامک بینکنگ، اسلامی تکافل، اسلامی اسٹاک ایکسچینج یا موجودہ جمہوری نظام کو اسلام کے سیاسی احکام سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش وغیرہ۔

دوسرا کام جمع وترتیب اور تعبیر وتسہیل کا ہے، اس نقطۂ نظر سے تین طرح کے کام ہو رہے ہیں: تقنین، تسہیل اور موسوعات کی تیاری۔

''تقنین'' سے مراد احکام شریعت کو دفعہ وار طریقہ پر مرتب کرنا ہے، اس کام کی ابتداء غالبًا خلافت عثمانیہ کے ''مجلۃ الأحکام العدلیۃ'' سے ہوئی، اس کے بعد موجودہ دور میں مختلف حکومتوں نے سرکاری سطح پر اور شخصیتوں نے انفرادی سطح پر اس کام کو انجام دینے کی کوشش کی ہے، ہندوستان میں مسلم پرسنل لا بورڈ کے تحت ''مجموعۂ قوانین اسلامی'' کے نام سے مسلم پرسنل لا کے ضمن میں آنے والے مسائل کی دفعہ وار ترتیب بھی اس سلسلہ کی ایک اہم اور قابل ذکر خدمت ہے۔

دوسرا کام فقہی مضامین کی تسہیل وتیسیر کا ہوا ہے، اور مختلف کتابیں ''**الفقه الميسر**'' یا ''**الفقه المنهجی**'' کے نام سے یا کسی اور عنوان سے تالیف کی گئی ہیں اور انھیں قبولیت حاصل ہو رہی ہے۔

تیسرا کام جو بعض پہلوؤں سے ان تمام کاموں سے زیادہ اہم ہے، وہ ہے موسوعات کی ترتیب کا رجحان —— اس وقت مختلف اسلامی علوم میں موسوعات کی تیاری کا کام چل رہا ہے، انفرادی طور پر بھی اس طرح کی خدمت انجام دی جارہی ہے، میرا خیال ہے کہ ایسی انفرادی کوششوں میں ڈاکٹر رواس قلعجی کی کاوشیں خاص طور پر قابل تحسین ہیں کہ ان کے ذریعہ بعض ان فقہاء کی خدمات بھی زندہ ہوئی ہیں، جن کی فقہ ناپید ہو چکی تھی اور جن کی آراء مختلف کتابوں میں بکھری ہوئی تھیں، اس اہم کام کو اس کی شان کے مطابق انجام دینے کے لئے اجتماعی کاوشیں بھی ہو رہی ہیں اور اس سلسلہ میں سب سے بڑا کام ؛ بلکہ کارنامہ وزارت اوقاف کویت کے زیر نگرانی مرتب ہونے والی ''موسوعہ فقہیہ'' ہے، جس کو اس صدی کی سب سے بڑی فقہی خدمت قرار دیا جاسکتا ہے اور جس کی ترتیب وتبویب میں عالم اسلام کے جلیل القدر اور عمیق النظر فقہاء شامل رہے ہیں۔

میرے حقیر مطالعہ کے مطابق اس موسوعہ کی درج ذیل خصوصیات خاص طور پر قابل ذکر ہیں :

۱- اس کی ترتیب حروف تہجی پر ہے، اس لئے اگر مطلوبہ کلمہ یا اس کا مادہ معلوم ہو، تو بآسانی مطلوبہ مواد تلاش کیا جاسکتا ہے۔

۲- فقہ کی بعض کتابوں کی عبارتیں بہت دقیق اور مغلق ہیں، فقہ مالکی کی بہت سے تصنیفات اور فقہ حنفی کی بعض متون کا خاص طور پر اس سلسلہ میں ذکر کیا جاسکتا ہے، موسوعہ فقہیہ میں عبارت کو حتی المقدور سہل اور آسان رکھنے کی کوشش کی گئی ہے اور بعض مشکل مسائل کو بھی آسان تعبیر میں پیش کیا گیا ہے۔

۳- اس کی ایک اہم خصوصیت اس کی جامعیت ہے، ہر لفظ کے تحت اس کے لغوی معنی، اصطلاحی تعریف، قریب المعنی اصطلاحات کے درمیان فرق سے لے کر اس لفظ کے ذیل میں آنے والی زیادہ سے زیادہ جزئیات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

۴- اہل سنت والجماعت کے چاروں دبستانِ فقہ —— حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی —— کے نقاطِ نظر اور ان کے

دلائل کوانصاف کے ساتھ پیش کیا گیا ہے،تمام آراء کااحترام ملحوظ رکھا گیا ہےاور فقہی تعصبات سےاوپراُٹھ کرگفتگو کی گئی ہے۔

۵- تمام فقہاء کی آراءخودان مذاہب کے مستند مراجع سے نقل کی گئی ہیں؛ کیوں کہ ایک دبستانِ فقہ سے وابستہ لوگ جب دوسرے دبستانِ فقہ کی آراء کونقل کرتے ہیں تو بھول چوک کا امکان ہوتا ہے، یا وہ مذہب کے غیر راجح قول کوراجح سمجھ کرنقل کردیتے ہیں، پھر مرتبین نے اس بات کا بھی اہتمام کیا ہے کہ کسی مسئلہ کےنقل کرنے میں ایک ہی کتاب پراکتفاءنہیں کیا جائے؛ بلکہ متعدد مراجع سے استفادہ کیا گیا ہےاوراگر مشائخ مذہب کے درمیان قولِ مستند کے سلسلہ میں اختلاف ہوتو اس پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے، نیز احادیث وآثار کوبھی اصل مراجع سےنقل کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے، اس طرح یہ کتاب دستاویزی حیثیت کی حامل ہوگئی ہےاور فقہاء کے لئے ایک مستند مرجع کا درجہ رکھتی ہے۔

۶- یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ حالاں کہ اس موسوعہ کی ترتیب میں بہت سے اہل علم شامل رہے ہیں؛ لیکن منہج میں بڑی حد تک یکسانیت پائی جاتی ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تدوین کمیٹی نے لکھنے والوں کے لئے ایک منہج متعین کرکے کام کرایا ہوگا۔

۷- فقروں پر نمبراندازی کی گئی ہے، اس کی وجہ سے مسائل کے تلاش کرنے اوران کا حوالہ دینے میں سہولت ہوتی ہے۔

۸- اس بات کا بھی اہتمام کیا گیا ہے کہ ہر جلد کے ساتھ ان شخصیات کے تراجم بھی تحریر کردیئے جائیں، جن کا اس جلد میں ذکرآیا ہے،اس سے قارئین کوبڑی سہولت حاصل ہوتی ہے کہ انھیں فقہاء کےاحوال جاننے کے لئے کسی اور کتاب سے مراجعت کی ضرورت نہیں رہتی اور مختلف عہد کےفقہاء کے نقاطِ نظر میں کیا اختلاف پایا جاتا ہے؟ آسانی سےاس کا تجزیہ کیا جاسکتا ہے۔

۹- اتنی وسیع الاطراف اورحروف تہجی کی ترتیب پر مرتب ہونے والی کتاب میں تکرار کا پایا جانا فطری بات ہے؛ کیوں کہ بہت سی اصطلاحات متداخل، اور بہت سے مضامین ایک دوسرے سے مربوط ہیں؛ لیکن اس کتاب میں بڑی حد تک تکرار سے بچنے کی کوشش کی گئی ہےاوراسی لئے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ مترادف اور متقارب الفاظ کےحوالہ دیئے جانے پراکتفاء کیا جاتا ہےاورایک ہی جگہ شرح وبسط سے گفتگو کی جاتی ہے۔

۱۰- کتاب کی کتابت اورطباعت میں بھی اعلیٰ معیار کوملحوظ رکھا گیا ہے، علمی اور تحقیقی کتابوں کے شایانِ شان صفحات کے سائز ہیں، آسانی کے لئے ان کو دو کالمی رکھا گیا ہے، متن اور حاشیہ کےحروف کے حجم میں فرق رکھتے ہوئے ایسا سائز منتخب کیا گیا ہے کہ پڑھنے والوں کو دشواری نہ ہو، نیز مرکزی عنوان، ذیلی عنوان، متن

اور حاشیہ کے حروف کے سائز پوری کتاب میں یکساں رکھے گئے ہیں۔

واقعہ ہے کہ یہ کتاب اپنی جامعیت، استناد واعتبار اور اُسلوب و بیان کے اعتبار سے اس حقیر کی رائے میں اس صدی کا سب سے بڑا فقہی کارنامہ ہے، اس کتاب میں اُصولِ فقہ کے مباحث نہیں آئے ہیں اور اس کے لئے مستقل طور پر — جیسا کہ معلوم ہوا ہے — ''الملحق الأصولي'' کی ترتیب کا کام جاری ہے، اس کے مکمل ہونے کے بعد انشاءاللہ اس کی افادیت اور جامعیت میں مزید اضافہ ہوجائے گا، اور جب بھی اس عہد کی علمی وفقہی خدمات کی تاریخ لکھی جائے گی، اس موسوعہ کے ذکر کے بغیر وہ ادھوری ہوگی، اس سلسلہ میں وزارت اوقاف کویت کا جس قدر شکریہ ادا کیا جائے کم ہے اور خود مملکت کویت کا بھی، کہ کویت حجم کے اعتبار سے چھوٹا ملک ہے؛ لیکن اسلامی علوم کی نشر واشاعت اور اسلامی کاز کی تائید وتقویت کے اعتبار سے اس کی خدمات بہت ہی وسیع ہیں۔

اس کتاب کی اہمیت اور افادیت کا تقاضہ ہے کہ مختلف زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو، برصغیر کے لوگوں کے لئے خوشی کی بات ہے کہ سب سے پہلے اس کا ترجمہ اُردو زبان میں ہوا ہے، اُردو زبان دنیا میں سب سے زیادہ بولی جانے والی چھ زبانوں میں سے ایک ہے، اس زبان کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مسلمانوں کی گود میں پیدا ہوئی ہے، یوں تو اس میں دنیا کی مختلف زبانوں کے الفاظ موجود ہیں؛ لیکن سب سے زیادہ عربی، فارسی اور ہندی کے الفاظ ہیں، ایک صاحبِ نظر عالم کے تجزیہ کے مطابق تقریباً ساٹھ فیصد قرآنی الفاظ اپنی اصل صورت میں یا تبدیلی کے ساتھ اُردو میں شامل ہیں، بہت سی اسلامی تعبیرات اُردو زبان کا جزو لاینفک بن گئی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اُردو کے غیر مسلم ادباء بھی ''سبحان اللہ، ماشاءاللہ اور الحمد للہ وغیرہ'' کہے بغیر اپنی بات پوری نہیں کر پاتے، حمد ونعت اُردو شاعری کی مستقل صنفیں مانی گئی ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ کی تعریف اور رسول ﷺ کی توصیف کی جاتی ہے، اُردو زبان کی پہلی نثر ''معراج العاشقین'' کو قرار دیا جاتا ہے، جو تصوف کے موضوع پر خواجہ گیسو درازؒ کی تصنیف ہے، اور اُردو کے پہلے صاحبِ دیوان شاعر ولی دکنی ہیں، جو ایک صوفی شاعر تھے، اور جن کے اشعار میں اسلامی تعلیمات اور اخلاقیات رچی بسی ہیں، غرض کہ اُردو کے روز پیدائش سے ہی اسلام سے اس کا رشتہ قائم ہے، اس نے علامہ اقبال جیسا شاعر دنیا کو دیا ہے، اسی زبان میں قرآن مجید کے سب سے زیادہ ترجمے پائے جاتے ہیں اور اُردو کے بالکل ابتدائی دور میں ہمیں سید شاہ مراد اللہ سنبھلی کی ''تفسیر مرادیہ'' ملتی ہے، اس وقت برصغیر میں تقریباً ۳۵ کروڑ مسلمانوں کی زبان اُردو ہے، اس کے علاوہ یورپ، امریکہ اور مختلف علاقوں میں اُردو بولنے والے مسلمانوں کی کثیر تعداد بستی ہے، اگر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو شاید مسلمانوں میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ''اُردو'' ہی ہوگی۔

اس لئے اس زبان کا حق تھا کہ اس عظیم الشان کتاب کے ترجمہ میں اس کو اولیت حاصل ہو؛ چنانچہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا وزارت اوقاف کویت کی بے حد شکر گذار ہے کہ اسے اس موسوعہ کے اُردو ترجمہ کا موقع دیا گیا

اور اکیڈمی نے بھی پورے اہتمام اور دقت نظر کے ساتھ اس فریضہ کو انجام دیا، جواب اپنے آخری مرحلہ میں ہے، اکیڈمی نے اس ترجمہ میں جن اُمور کو ملحوظ رکھا ہے اور جو اہتمام کیا ہے، ان کا تذکرہ بھی مناسب ہوگا :

الف : ترجمہ ایک مشکل فن ہے؛ بلکہ بعض دفعہ ترجمہ کا کام اصل تالیف سے زیادہ مشکل ہوجاتا ہے؛ کیوں کہ مؤلف اظہار وتعبیر میں آزاد ہوتا ہے اور مترجم مؤلف کی تعبیر کا پابند، ترجمہ کے لئے ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں کے محاورات اور اسالیب بیان سے اچھی طرح واقف ہو، چنانچہ مترجم کا انتخاب کرتے ہوئے اکیڈمی نے اس بات کو خاص طور پر ملحوظ رکھا ہے۔

ب : کتاب جس موضوع کی ہو، ضروری ہے کہ مترجم اس موضوع اور فن سے مناسبت رکھتا ہو؛ تاکہ اصطلاحات واستعارات کے مفاہیم درست طریقہ پر متعین کرسکے، اسی لئے موسوعہ کے ترجمہ کے لئے اکیڈمی نے عام طور پر فقہ کے اساتذہ اور افتاء وقضاء سے مربوط شخصیتوں کا انتخاب کیا اور انھیں سے یہ خدمت لی۔

ج : اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ ترجمہ میں برجستگی باقی رہے، ترجمہ پن پیدا نہ ہو، اور ممکن حد تک سہل وعام فہم زبان استعمال کی جائے، جملوں کی ترکیب اُردو زبان کے مزاج کے مطابق ہو اور رموزِ تحریر کی پوری پوری رعایت رکھی جائے۔

د : فقہی اصطلاحات کو اصل شکل میں باقی رکھنے کی کوشش کی گئی ہے، ترجمہ کرتے ہوئے ایسی تعبیرات اختیار کی گئی ہیں کہ فقہی حدود وقیود سے تجاوز نہ ہوجائے۔

ان تمام اُمور کی رعایت ملحوظ رکھنے کے لئے ترجمہ کے کام کو پانچ مراحل پر تقسیم کیا گیا تھا :

۱- پہلا مرحلہ مترجمین کی تعیین کا تھا، اس کے لئے پورے ملک سے کہنہ مشق اور باصلاحیت فضلاء سے ترجمہ کے نمونے طلب کئے گئے اور ایک کمیٹی نے اصل اور ترجمہ کا تقابل کرکے مترجمین کا انتخاب کیا۔

۲- پھر مختلف افراد کو مختلف جلدوں کے ترجمہ کی ذمہ داری سونپی گئی، ترجمہ اور رموزِ تحریر کے استعمال کے سلسلہ میں ایک تفصیلی ہدایت نامہ مرتب کرکے انھیں بھیجا گیا اور اس کی روشنی میں ان حضرات نے ترجمہ کیا اور اگر کہیں موسوعہ کی عبارت سمجھنے میں دقت ہوئی تو اصل مراجع —— جن کا حوالہ دیا گیا تھا —— سے بھی مراجعت کی گئی۔

۳- ترجمہ کے بعد ایک اور فاضل کو —— جو نسبتاً زیادہ تجربہ رکھتے تھے —— اس پر نظر ثانی کی ذمہ داری دی گئی اور ان سے کہا گیا کہ وہ صرف ترجمہ کی عبارت دیکھنے اور اس کے نوک و پلک درست کرنے پر اکتفاء نہ کریں؛ بلکہ اصل عبارت سے بھی تقابل کریں۔

۴- اس کے بعد نظر نہائی کی ذمہ داری ایسے افراد کو سونپی گئی، جو تالیف وترجمہ میں زیادہ فائق وبااعتماد ہوں، ان سے کہا گیا کہ وہ نظر ثانی شدہ ترجمہ کو اصل سے ملائیں اور اپنے ساتھ ایک اور معاون کو رکھیں اور دونوں

مل کرنظر ڈالیں؛ تا کہ زیادہ بہتر طور پر کام ہو سکے اورفنی ولسانی فروگذاشتیں نظرانداز نہ ہو جائیں۔

۵- ان مراحل سے گذرنے کے بعد ترجمہ وزارت اوقاف کویت کو بھیجا جاتا ہے، انھوں نے اپنے یہاں دو تین اُردو داں اصحابِ نظر علماء کی کمیٹی رکھی ہے، جو اس پورے کام کا ناقدانہ جائزہ لیتی ہے اور حرف حرف پڑھ کر اپنے ''ملاحظات'' لکھتی ہے، پھر اس کے مطابق ترجمہ کی تصحیح کی جاتی ہے۔

اس طرح ان مراحل سے گذر کر اس ترجمہ کو قابل طباعت سمجھا جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ موسوعہ کی کمپوزنگ کا کام عام اُردو خواں حضرات سے نہیں لیا گیا ہے؛ بلکہ ایسے حضرات سے لیا گیا ہے، جو فقہی اصطلاحات، شخصیات، تعبیرات اور کتابوں کے ناموں سے ایک گونہ مانوس ہوں، اس لئے پوری کمپوزنگ اکیڈمی کے دفتر میں کرائی گئی ہے اور کمپوزنگ کے لئے بھی اُردو خط کے جدید ترین پروگرام سے فائدہ اُٹھایا گیا ہے۔

پھر یہ بھی کوشش کی گئی ہے کہ حروف کے حجم، صفحات کے سائز وغیرہ بالکل اصل کے مطابق ہوں، جہاں اکیڈمی نے ترجمہ کا کام کرایا ہے اور وہ اس کی علمی نگرانی کر رہی ہے، وہیں ''جینوین'' کو ایک تفصیلی معاہدہ کے تحت اس کی طباعت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، جس نے کتاب کے سرورق کا ڈیزائن اور کاغذ اور طباعت کا معیار اصل کے مطابق یا اس کے قریب رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اس موقع پر ہمیں بے ساختہ اکیڈمی کے بانی حضرت مولانا قاضی مجاہدالاسلام قاسمیؒ کی یاد آتی ہے، جنھوں نے اس اہم علمی پراجکٹ پر توجہ کی، وزارت اوقاف سے اس کی منظوری حاصل فرمائی، مترجمین کا انتخاب کیا، بعض جلدوں پر خود نظر نہائی کی اور ان کی زندگی میں کئی جلدوں کا ترجمہ ہوا، نیز متعدد جلدوں پر نظر ثانی اور نظر نہائی کا کام مکمل ہو گیا، یہ ان کے اخلاص کی برکت ہے کہ ان کی وفات کے بعد بھی کسی وقفہ کے بغیر یہ عظیم علمی خدمت کا سلسلہ جاری رہا، اگر وہ اپنی آنکھوں سے اس کا مطبوعہ نسخہ دیکھتے تو یقیناً بے حد خوش ہوتے؛ لیکن ہمیں اُمید ہے کہ یہ عظیم فقہی خدمت ان کے لئے بہترین صدقۂ جاریہ ہوگی اور اگر ہاتف غیبی نے آج کی اس تقریب کی خبر اللہ کی قدرت سے ان کو پہنچائی ہو تو یقیناً ان کی روح بے حد مسرور وشادکام ہوئی ہوگی۔

اخیر میں ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ بہ قول امجد حیدرآبادی :

جو کچھ ہوا ہے ، ہوا ہے کرم سے تیرے
جو بھی ہوگا ، تیرے کرم سے ہوگا

اکیڈمی، مسلمانانِ ہند اور پوری دنیا میں اُردو بولنے والے مسلمانوں کی طرف سے وزارت اوقاف کویت کا

شکریہ ادا کرتی ہے، ان کی خدمت میں جذبۂ سپاس پیش کرتی ہے، نیز ان تمام لوگوں کی بھی شکر گذار ہے، جنھوں نے کسی بھی جہت سے اس کام میں تعاون کیا ہے اور حصہ لیا ہے، اخیر میں دُعاء ہے کہ اللہ تعالیٰ اس خدمت کو قبول فرمائے اور اکیڈمی کے کاروانِ علم وتحقیق کو اپنی منزل کی طرف رواں دواں رکھے۔

واللہ هو المستعان .

○ ○ ○

آخری کنارے پر!

خالد سیف اللہ رحمانی

براعظم افریقہ میں جنوبی افریقہ ایک ایسا ملک ہے جو شہری سہولتوں اور صنعتی وتجارتی ترقی کے اعتبار سے یورپ کا ہمسر نظر آتا ہے، اور قدرت کی طرف سے جو حسن فطرت اس کے حصہ میں آیا ہے، اس نے اس کی کشش میں اور اضافہ کر دیا ہے، راقم الحروف پہلے بھی دو بار اس ملک کا سفر کر چکا ہے اور جنوری ۲۰۱۲ء کے آخری ہفتہ میں ایک مالیاتی ادارہ کی دعوت پر پھر یہاں کا سفر ہوا، جس نے اسلامی اُصولوں کے مطابق سرمایہ کاری کا ایک شعبہ رکھا ہے اور اس حقیر کو اپنے شریعہ اڈوائزری بورڈ کا چیئر مین بنایا ہے، گذشتہ سال سے ہی اس ادارے کی طرف سے سفر کا تقاضا تھا؛ لیکن عدیم الفرصتی کی وجہ سے فون اور ای میل پر رابطہ سے کام چلایا گیا اور وہاں کے موسم کی مناسبت سے جنوری کے آخر میں یہ سفر طے پایا، میں ۲۳ر جنوری ۲۰۱۲ء کو براہ دوبئ دس بجے شب جوہانس برگ پہنچا، عزیزی مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی (استاذ المعهد العالی الاسلامی حیدرآباد) اور مولانا امتیاز احمد قاسمی (اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا) میرے ساتھ تھے، ایرپورٹ پر ملک کے معزز علماء مولانا محمد عباس علی جینا (صدر جمعیۃ علماء)، مولانا محمد ایوب کا چھوی (جنرل سکریٹری جمعیۃ علماء)، مولانا شعیب جوسب (شرعی اڈوائزر اینگلو رینڈ)، مولانا احمد سلیمان (مشیر اسلامی شعبہ اسکینڈر بینک) اور متعدد علماء و ذمہ دار شخصیتیں موجود تھیں، ۲۴ر جنوری ۲۰۱۲ء کو میرا قیام جوہانس برگ میں رہا اور پورا دن نہایت مصروفیت میں گذرا، صبح ساڑھے دس بجے اینگلو رینڈ کمپنی کی میٹنگ میں شرکت ہوئی، یہاں اس کے مالک مسٹر ریچرڈ سے بھی ملاقات ہوئی، جو سفید فام انگریز ہیں، میں نے ترجمان کے ذریعہ انھیں اسلامی نظام معیشت کی فطرت اور واقعیت سے ہم آہنگی اور موجودہ سرمایہ دارانہ نظام میں فرضی اُتار چڑھاؤ کے بارے میں گفتگو کی، وہ بڑے سمجھ دار، خلیق اور باخبر تاجر ہیں، انھوں نے کہا کہ وہ اسلامک باؤنڈز (صکوک) جاری کرنا چاہتے ہیں اور اس سرمایہ کو معدنیات کی تجارت میں مشغول کریں گے۔

ساڑھے گیارہ سے ڈیڑھ بجے تک جمعیۃ علماء کے دفتر میں علماء کی ایک نشست رکھی گئی تھی، جس میں تبادلہ خیال کا موقع ملا، مولانا عباس صاحب کے علاوہ تبادلۂ خیال کی اس نشست میں مفتی اشرف قریشی (فاضل بنوری

ٹاؤن کراچی)، مولانا ابراہیم بھام، مولانا یوسف بادلی، مولانا سلیمان راوت (ریڈیو اسلام کے نمائندہ) اور مختلف اہل علم موجود تھے، جنوبی افریقہ کے پس منظر میں میراث و وصیت اور نظام قضاء سے متعلق حاضرین نے متعدد استفسار کئے، جمعیۃ کے تحت ایک جامعہ اسلامیہ بھی قائم ہے، یہاں نصف گھنٹہ طلبہ سے خطاب کیا گیا، پھر آج ہی عصر کی نماز وہاں کی مشہور دینی جامعہ دارالعلوم زکریا میں ادا کی گئی، یہاں جامعہ کے مہتمم مولانا شبیر احمد سالوجی، شیخ الحدیث مولانا مفتی رضاء الحق صاحب، نائب مہتمم حافظ محمد بشیر احمد وغیرہ سے ملاقات ہوئی، نیز عصر بعد طلبہ سے خطاب ہوا، یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ جامعہ ہذا سے مختصر تحقیق کے ساتھ فتاویٰ سراجیہ شائع ہو چکی ہے، نیز یہاں سے صادر ہونے والے فتاویٰ کی چار جلدیں بھی منظر عام پر آئی ہیں، جو بنیادی طور پر مفتی رضاء الحق صاحب کے فتاویٰ پر مشتمل ہیں، یہاں پاکستان کے ایک فاضل مولانا علاء الدین صاحب سے بھی ملاقات ہوئی جو مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے تلامذہ میں ہیں، پچیس سال تک مدرسہ صولتیہ مکہ مکرمہ میں پڑھا چکے ہیں اور اس وقت جامعہ زکریا میں استاذ ہیں، انھوں نے شیخ محمد محمد عوامہ کی تالیف ''اثر الحدیث الشریف فی اختلاف الائمۃ الفقہاء'' کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے؛ چنانچہ اس حقیر کو بھی اس کا ایک نسخہ عنایت کیا، عشاء کی نماز یہاں کی دوسری مشہور جامعہ 'دارالعلوم آزادوِل' کی مسجد میں ادا کی گئی، یہاں خاص طور پر شعبۂ افتاء کے طلبہ و اساتذہ سے خطاب رکھا گیا تھا؛ چنانچہ شعبۂ تدریب افتاء کے وسیع ہال میں اس حقیر کا خطاب ہوا، طلبہ اور دوسرے اساتذہ کے علاوہ جامعہ کے شیخ الحدیث اور صاحب ذوق عالم دین مولانا فضل الرحمٰن اعظمی، جامعہ کے مفتی، مفتی سعید صاحب اور دیگر اساتذہ بھی موجود تھے۔

گذشتہ دو اسفار میں یہاں کے مشہور سیاحتی شہر 'کیپ ٹاؤن' جانے کا موقع نہیں ملا تھا، اس لئے میز بانوں نے ۲۵-۲۷ر جنوری ۲۰۱۲ء کیپ ٹاؤن کے سفر کے لئے رکھا تھا، پچیس کو عین فجر کے وقت ہم لوگ طیارہ کے ذریعہ سے جوہانس برگ سے کیپ ٹاؤن کے لئے نکلے اور دو گھنٹے کے ہوائی سفر کے بعد کیپ ٹاؤن پہنچے، کیپ ٹاؤن کا ایرپورٹ بھی خاصا وسیع، بہت خوبصورت اور جدید سہولتوں سے آراستہ ہے، اگر آپ ڈرائیونگ سے واقف ہوں تو وہاں کرایہ کی ٹیکسی مل جاتی ہے، جو مقررہ وقت تک آپ کے تصرف میں رہتی ہے، مولانا شعیب جوسب نے ٹیکسی حاصل کی اور ان کے برادر بزرگ جناب رضوان جوسب نے (جو خود ایک بڑے تاجر ہیں) ڈرائیونگ کی ذمہ داری سنبھالی، انھوں نے ٹیکسی کے ریس کی بھی مشق کی ہے اور ہیلی کاپٹر کے پائلٹ بھی ہیں، انھیں اپنے گاڑی پر بے حد قابو ہے اور ایک زمینی ہیلی کاپٹر کی طرح کار چلاتے ہیں، ایرپورٹ کے قریب ہی SPUR نامی ریسٹورنٹ واقع ہے، جہاں حلال فوڈ کا اہتمام ہے، اسی ریسٹورنٹ میں ناشتہ کیا گیا اور اس کے بعد ہم لوگ (Athlone) نامی محلّہ میں واقع مسلم جوڈیشیل کونسل (مجلس القضاء الاسلامی) پہنچے۔

یہ اس صوبے میں مسلمانوں کی سب سے بڑی تنظیم ہے، جس میں احناف اور شوافع دونوں مکاتبِ فقہ کے

علماء شریک ہیں، اس تنظیم میں عرب نژاد اہل علم بھی ہیں اور وہ لوگ بھی جن کے آباء واجداد ملیشیاء سے یہاں لائے گئے تھے، زیادہ تر اسی نسل کے مسلمان یہاں آباد ہیں اور عام طور پر فقہ شافعی کے متبع ہیں، یہاں تنظیم کے ذمہ داران اور علماء پہلے سے منتظر تھے، تنظیم کے صدر علیل ہونے کی وجہ سے نہیں آپائے تھے؛ لیکن نائب صدر شیخ احمد صادر، جنرل سکریٹری شیخ عبدالخالق علی، تنظیم کے مفتی، مفتی محمد یوسف کران اوران کے صاحبزادے مولانا طٰہٰ کران — جو یہاں ایک جامعہ کے ذمہ دار ہیں — وغیرہ موجود تھے، یہ سبھی حضرات انگریزی زبان سے واقف تھے اوران میں متعدد حضرات عربی زبان سے بھی واقف تھے، بہر حال اس حقیر نے ''عصر حاضر میں علماء کی ذمہ داریاں'' کے زیر عنوان خطاب کیا، مولانا عبدالفتاح (فاضل جامعہ زکریا) نے حاضرین کے لئے انگریزی میں ترجمہ کیا، شیخ احمد صادر نے، ایک ازہری عالم نے اور اخیر میں مفتی یوسف کران نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا، مفتی یوسف کران دارالعلوم دیوبند کے قدیم فضلاء میں ہیں، جو اصلاً ملایا نسل سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے کئی عالمی کانفرنسوں میں پہلے بھی ملاقات ہوچکی تھی، انھوں نے اجازت چاہی کہ وہ ''جدید فقہی مسائل'' کا انگریزی میں ترجمہ کرنا چاہتے ہیں، راقم الحروف نے بہ خوشی اجازت دے دی، یہ بڑی اچھی نشست رہی؛ لیکن اس وقت یہ کونسل ایک گمبھیر مسئلہ سے دوچار تھی اور وہ یہ کہ اس صوبہ میں یہی کونسل 'حلال فوڈ' کے بارے میں تصدیق نامہ جاری کرتی ہے، ایک فوڈ کمپنی نے تصدیق نامہ کا غلط استعمال کیا، جس کا انکشاف کمپنی کی ایک انگریز خاتون ملازمہ کے ذریعہ ہوا، یہ خبر میڈیا کا موضوع بن گئی، جس دن ہم لوگ پہنچے، اسی دن وہاں کے بعض انگریزی اخبارات میں پہلے صفحہ پر شاہ سرخی میں کونسل سے متعلق یہ خبر شائع ہوئی، اس کی وجہ سے بڑی ہنگامی صورت حال تھی اور مسلمانوں کا ایک بڑا طبقہ سراپا احتجاج بنا ہوا تھا، اسی دن شام میں کونسل کی طرف سے جنوبی افریقہ کے علماء اور ذمہ دار شخصیتوں کا ایک نمائندہ اجتماع رکھا گیا تھا، جس میں ذمہ داروں نے بعض کوتاہیوں کے لئے معذرت خواہی بھی کی اور مستقبل کا لائحۂ عمل بھی پیش کیا، اس صورت حال پر جہاں افسوس ہوا کہ مسلمانوں کے بہت سے ذمہ دار ادارے جو فریضہ اپنے سر لیتے ہیں، ان کو اس طرح ادا نہیں کرتے، جو ان کا حق ہے، وہیں اس بات پر مسرت ہوئی کہ مغرب اور مغرب زدہ علاقوں میں بسے ہوئے مسلمان بھی دینی حمیت اور اسلامی غیرت کی متاع گراں مایہ سے محروم نہیں ہیں۔

یہاں ظہرانہ سے فارغ ہونے کے بعد ہم لوگ لب ساحل پر موجود سیون اسٹار ہوٹل (Tabl Bay) پہنچے، جہاں پر ہمارے قیام کا نظم کیا گیا تھا، اس ہوٹل کے ساتھ ایک بڑا مال بھی لگا ہوا ہے اور ایک وسیع رقبہ پر اس کی عمارت، سوئمنگ پل اور پارک کا سلسلہ ہے، اس کے ایک طرف کا حصہ سمندر سے لگا ہوا ہے اور سامنے کا حصہ بھی اس طرح ہے کہ صرف ایک سڑک کا فاصلہ ہے، اس کے بعد سمندر ہے، اس لئے یہ ہوٹل اپنے محل وقوع کے اعتبار سے بہت خوبصورت بھی ہے اور نہایت مہنگا بھی، کیپ ٹاؤن میں دو سمندر ایک دوسرے سے ملتے ہیں، ایک: بحر اٹلانٹک

اور دوسرا: بحر ہند، کیپ ٹاؤن شہر کچھ اس طرح ہے کہ گویا بحر اٹلانٹک نے اس کو اپنے گود میں لے رکھا ہے، اس سمندر کا پانی نہایت صاف وشفاف فیروزہ رنگ کا واقع ہوا ہے، ایسا لگتا ہے کہ ایک آسمان فضاء کے اوپر ہے اور دوسرا آسمان سطح زمین پر، دنیا کے کئی علاقوں اور ساحلی شہروں میں جانے کا اتفاق ہوا؛ لیکن استنبول اور کیپ ٹاؤن کے سمندر اپنی رنگت اور شفافیت کے اعتبار سے جتنے خوبصورت نظر آئے، شاید کہیں اور ایسی خوش رنگی نظر نہیں آئی، کیپ ٹاؤن میں ایم جے سی کے پروگرام کے علاوہ میزبانوں نے دو دن صرف استراحت اور تفریح کے لئے رکھے تھے؛ چنانچہ آج بعد نماز مغرب جناب رضوان جو سب کے ساتھ ہمارا قافلہ تفریح کے لئے نکلا، جناب رضوان صاحب ہر ماہ یہاں آتے ہیں اور یہاں کے چپہ چپہ سے واقف ہیں، وہ مختلف پہاڑی راستوں کو سر کرتے ہوئے اوپر بڑھتے جاتے تھے اور نیچے رنگ ونور کا جو سماں تھا، اسے دیکھ دیکھ کر ہر شخص کی زبان پر 'سبحان اللہ' اور 'الحمد للہ'' کے کلمات تھے، آخر ہم لوگ خاصی بلندی پر —— جسے سگنل پوائنٹ (چیک منس اسپیک) کہا جاتا ہے —— پہنچے، جو سطح زمین سے کافی اونچائی پر واقع ہے، یہاں سے پورا کیپ ٹاؤن شہر نظر آتا ہے، بلند وبالا خوبصورت عمارتیں، ان عمارتوں کے درمیان سرو قامت درختوں کی قطاریں، پورا شہر رنگ برنگی روشنیوں میں ڈوبا ہوا، سمندر کے کنارے چھوٹے چھوٹے اسٹیمر اور سمندر کے اندر فاصلہ پر بڑے بڑے جہاز، سب کے سب بقعۂ نور، ایک طرف پانی کا سمندر اور دوسری طرف رنگ ونور کا ایسا خوبصورت منظر شاذ ونادر ہی نظر آتا ہے، ہم لوگ اس منظر سے لطف اُٹھاتے ہوئے کسی قدر دیر سے واپس ہوئے۔

۲۶ ر جنوری ۲۰۱۲ء کو شہر کے دوسرے ساحل کی طرف ہمیں لے جایا گیا، سمندر کے کنارے کنارے نشیب وفراز کو طے کرتے اور کئی بیچ (Beach) کو چھوڑتے ہوئے ہم لوگ (Hap Mans Peak) پر پہنچے، یہ ساحل کی بلندترین پہاڑی ہے، جس سے ایک طرف شہر کا بڑا حصہ، دوسری طرف سرسبز وشاداب پہاڑیوں کا سلسلہ اور نشیب میں تا حد نظر سمندر کی مچلتی ہوئی موجیں نظر آتی ہیں، یہ بے حد خوبصورت ساحل ہے، جس کو حسن فطرت بھی عطا ہوا ہے اور انسانی صناعی نے بھی جہاں اپنا جوہر دکھایا ہے، ایک قابل افسوس بات یہ ہے کہ ہم لوگ جن ساحلی سیاحت گاہوں کو چھوڑتے ہوئے یہاں پہنچے، ان میں ایک (Hot Bact) بھی ہے، یہ ساحل کی وہ جگہ ہے جہاں مرد وعورت بالکل بے لباس حالت میں رہتے ہیں اور جہاں کپڑے پہنے ہوئے لوگوں کو جانے کی اجازت نہیں ہے، عجب بات ہے کہ انسان صنعت وحرفت کی دنیا کو فتح کرتا جاتا ہے؛ لیکن خود اخلاق وشائستگی اور شرم وحیا کے جوہر سے محروم ہوتا جا رہا ہے، بہر حال ہم لوگ دوپہر تک واپس آگئے۔

پھر ظہر کے بعد ہمیں اسٹیمر کے ذریعہ 'روبن آئی لینڈ'' نامی جزیرہ پر لے جایا گیا، کیپ ٹاؤن کے ساحل سے آدھے گھنٹے میں تیز رفتار اسٹیمر نے یہ سفر طے کیا، یہاں کی خاص بات یہ ہے کہ اسی جزیرہ میں آزادی سے پہلے وہ

جیل بنائی گئی تھی، جس میں مجاہدین آزادی کو قید رکھا جاتا تھا، ان ہی قیدیوں میں نیلسن منڈیلا بھی تھے، یہ خوفناک ترین قیدیوں کے لئے بنائی جانے والی جیل تھی، ہر قیدی کے لئے چھوٹا چھوٹا کمرہ، جس میں بہ مشکل ایک شخص رہ سکے، زمین ہی پر کمبل کا بستر، کمرہ چاروں طرف سے بند، لوہے کے مضبوط دروازے، ان قیدیوں سے نہایت پُرمشقت کام بھی لئے جاتے، جیسے بے مقصد زمین کی کھدائی وغیرہ، قیدخانہ کے باہر بلند مضبوط دیواریں اور اس پر برقی کے تار، لوگوں کو کھانے کے لئے جو پلیٹ اور پیالہ فراہم کیا جاتا تھا، وہ بھی رکھا ہوا ہے، جو مشہور قیدی جس کمرے میں تھے، وہاں ان کے نام اور مختصر تعارف پر مشتمل تختیاں آویزاں ہیں، چند مسلمانوں اور ہندوؤں کے نام بھی ملے، قیدیوں کے شناختی کارڈ کی تصویر بھی آویزاں کی گئی ہے، کھانے کا چارٹ بھی ہے، صرف دو وقت کھانا دیا جاتا تھا، قیدیوں میں بھی امتیاز تھا، سیاہ فام قیدیوں کو معمولی اور کم مقدار میں کھانا دیا جاتا، رنگ دار یعنی ہندوستان وغیرہ کے لوگوں کو ان سے کسی قدر بہتر اور مقدار میں زیادہ، اور سفید فام قیدیوں کے لئے سب سے بہتر، باضابطہ اِس کے وہ چاٹ لگے ہوئے ہیں، جو اُس وقت چسپاں کئے جاتے تھے۔

جو شخص وہاں گائیڈ کی حیثیت سے تفصیلات بتارہا تھا، وہ خود اس جیل میں پانچ سال رہ چکا تھا، اس نے بتایا کہ نیلسن منڈیلا یہیں چھپ چھپ کر لکھتے تھے اور قیدخانے کے احاطہ میں جو کھلا ہوا صحن ہے، جس میں تھوڑے وقت کے لئے قیدیوں کو نکلنے کی اجازت دی جاتی تھی، وہیں گھاس کی جڑوں میں زیر زمین اپنے کاغذ چھپایا کرتے تھے اور کوئی کام کرنے والا اسے باہر پہنچاتا تھا، منڈیلا سے جب ان مظالم کے بارے پوچھا گیا، جو ان پر روا رکھے جاتے تھے تو انھوں نے کہا کہ میری تحقیر کے لئے روز مرہ کا معمول تھا کہ میرے دونوں ہاتھ باندھ دیئے جاتے اور پاؤں پر کوئی وزنی چیز رکھ دی جاتی؛ تاکہ میں اُٹھ نہ سکوں، پھر کوئی سفید فام فوجی میرے سر پر پیشاب کرتا اور مجھ کو میرے حقیر ہونے کا احساس دلایا جاتا، منڈیلا نے نہایت صبر کے ساتھ پُرامن طریقہ پر حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے اس جنگ کو انجام تک پہنچایا، اخیر میں اپنے پیش رو صدر مسٹر بوتھو سے صلح کی اور اس طرح ملک کو غلامی سے نجات حاصل ہوئی، اس جیل کو دیکھ کر نیلسن منڈیلا اور ان کے رفقاء کی جدوجہد اور صبر واستقامت کو خراج تحسین پیش کرنے کو دل چاہتا ہے اور دوسری طرف مغربی طاقتوں کی سفاکی اور ان کی فطرت میں پائی جانے والی شقاوت کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ظاہر جتنا سفید ہے، ان کا باطن اسی قدر سیاہ ہے، یہ دنیا کے جس خطہ میں گئے، ظلم کی آندھی بن کر گئے اور مقامی باشندوں کی تذلیل وتحقیر میں انھوں نے کوئی کسر نہ چھوڑی، اس جزیرہ میں ایک بزرگ کا مزار بھی ہے، جن کا بڑی وقعت کے ساتھ گائیڈ حضرات ذکر کرتے ہیں اور مسلم وغیر مسلم سب عقیدت کے ساتھ یہاں پہنچتے ہیں، اس جزیرہ میں وہ عمارت بھی ہے، جو عہد غلامی میں گورنر ہاؤس ہوا کرتی تھا، اب یہ ہاسپٹل ہے، اب اس جزیرہ میں آبادی بھی ہے اور آبادی کی مناسبت سے ہاسپٹل اور تعلیمی ادارے بھی ہیں، بہرحال یہ قیدخانہ

اسی طرح تھا، جیسے ہندوستان میں انڈومان نکوبار کا علاقہ ،جس کولوگ ’ کالا پانی‘ کہتے تھےاور جہاں ان لوگوں کوبھیج دیا جاتا تھا، جوانگریزوں کی نظر میں سنگین جرم کے مرتکب ہوتے تھے۔

۲۷ر جنوری ۲۰۱۲ءکوہم لوگ اس مقام کودیکھنے کے لئے نکلے، جہاں بحراٹلانٹک اور بحر ہند ایک دوسرے سے ملتے ہیں،اس کے لئے فجر بعد ہی کیپ ٹاؤن سے روانگی ہوئی اور آمدورفت میں تقریباًپانچ سوکیلومیٹر کا سفر طے کیا گیا، جاتے ہوئے ہم لوگ سرسبز پہاڑیوں اورسمندر کے درمیان واقع ایک خوبصورت ساحلی شہر Hermanus میں ناشتہ کے لئے رُکے، یہ چھوٹا سا؛لیکن بہت ہی قرینے سے بسا ہوا شہر ہے،لوگوں نے بتایا کہ نوشادی شدہ جوڑے یہاں آکر چند دن گزارتے ہیں،ہم لوگ یہاں سے گزرکراس مقام پر پہنچے، جہاں دونوں سمندروں کا سنگم واقع ہے، اس سے پہلے ایک بہت طویل راستہ کچی سڑکوں کا ہے، اس میں کوئی آبادی نہیں ہے ؛ بلکہ دور دور تک میدان اورخودرو پودے ہیں،معلوم ہوا کہ ملک کے کچھ علاقہ کو نیچرل زون قرار دے دیا گیا ہےاوراس کو بالکل فطرت پر باقی رکھا گیا ہے،آخرہم لوگ ’’کیپ آگس‘‘ نامی چھوٹے سے شہر میں پہنچےاورسمندر کے کنارے چلتے ہوئے اس مقام تک پہنچے، جہاں ایک طرف بحراٹلانٹک کی نیل گوں لہریں رواں دواں ہیں اوراسی سے لگے ہوئے بحر ہند کی متلاطم موجیں اپنا شور برپا کئے ہوئی ہے، بحر ہند والا حصہ سیاہی مائل ہے دونوں پانیوں کا فرق ساحل سمندر سے صاف نظر آتا ہے، بحر ہند کی سطح آب بھی بہ مقابلہ بحراٹلانٹک کے اونچی نظرآتی ہے،اس کا تجربہ تونہیں ہوا؛لیکن لوگوں نے بتایا کہ بحراٹلانٹک کا پانی بہت ٹھنڈا ہےاور بحر ہند کا معتدل،اورسنگم پربھی دونوں پانی کی یہ کیفیتیں برقرار ہیں، بہرحال اس طویل سفرکوبرداشت کرنے کا مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کاارشاد’’مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ‘‘ کی واقعاتی تصویرچشم سر سے دیکھی جائے، جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ جہاں دوسمندر ملتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ درمیان میں ایک پردہ رکھ دیتے ہیں اور یہ پانی ایک دوسرے ملتے نہیں۔

آج جمعہ کا دن تھا اورنماز جمعہ کی فکر دامن گیرتھی ، پتہ چلا کہ واپسی میں ایک جگہ نمازِ جمعہ میسرآسکتی ہے؛ چنانچہ ہمارا یہ قافلہ Caledon میں نماز کے لئے رکا، یہاں ایک چھوٹا سا مصلی واقع ہے،امام صاحب نے انگریزی میں خطاب کیااورعربی میں خطبہ دیا، یہ صومالیہ کے رہنے والے تھے، جوافریقی ملک ہے؛لیکن یہ دیکھ کرافسوس ہوا کہ خطبہ میں اعراب کی بے تحاشا غلطیاں کررہے تھے، یہاں کئی مرد جبے میں ملبوس تھےاورکئی خواتین برقعہ میں؛لیکن نماز سے باہر نکلتے ہی مرد حضرات نے اپنا جبہ پھینکااورخواتین نے اپنا برقعہ؛ چنانچہ یہی خاتون اب چست جینس، کھلی آستین، تنگ اور چھوٹے سے ٹی شرٹ میں ملبوس تھیں اور سر کھلے ہوئے تھے، ایسا لگتا ہے کہ جیسے ایک شخص کے دوچہرے ہوں اوروہ بیک وقت دوتہذیبوں کا نمونہ ہوں۔

۲۸ر جنوری ۲۰۱۲ء کوہم لوگ صبح سویر جہاز سے ڈربن کے لئے روانہ ہوئے اورتقریباً ڈیڑھ گھنٹے کی اُڑان

کے بعد کنگ شا کھا ایر پورٹ ڈربن پر اُترے، یہاں میں پہلے بھی آ چکا تھا؛لیکن اب اس کی شکل کافی بدلی ہوئی تھی، ورلڈ فٹ بال کپ کے موقع سے اس ایر پورٹ کی توسیع وتحصیل پر خاص توجہ دی گئی، یہاں سے ہم لوگ ساحل سمندر پر واقع مولانا شعیب جوسب کے فلیٹ پر گئے، یہ تقریباً پندرہ سولہ منزلہ وسیع وعریض احاطہ کی دو مماثل بلڈنگوں پر مشتمل ہے، معلوم ہوا کہ جس عرب تاجر نے دبئ میں 'برج خلیفہ' بنایا ہے، اسی نے اس عمارت کی تعمیر کی ہے، اس عمارت کے سامنے دور تک لوگوں کے گھومنے اور ٹھہرنے کے لئے پلیٹ فارم بنا ہوا ہے، جو سمندر سے متصل ہے، یہاں ضروریات سے فارغ ہوکر ہم لوگ جمعیۃ علماء نٹال کے دفتر پہنچے، جہاں پہلے سے ذمہ دار حضرات منتظر تھے، اس سے پہلے میں اُس وقت یہاں حاضر ہوا تھا، جب حضرت مولانا محمد یونس پٹیل صاحبؒ جمعیۃ کے صدر تھے، وہ واقعی اخلاق وسلوک میں سلف کا نمونہ تھے، افسوس کہ بعض عاقبت نا اندیش حضرات نے کچھ ایسا اختلاف پیدا کیا کہ یہاں کی وحدت وہم آہنگی باقی نہیں رہی، بہر حال اس وقت جمعیۃ کے صدر مولنا محمدی صاحب ہیں اور ماشاء اللہ معتدل الفکر اور فعال ہیں، یہاں ذمہ داران جمعیۃ کے علاوہ مولانا ہارون اور مولانا صالح جی صاحب وغیرہ سے ملاقات ہوئی، کافی دیر تک تبادلۂ خیال کا موقع ملا، خاص کر نظام قضاء اور اسبابِ فسخ کے موضوع پر زیادہ گفتگو رہی۔

ڈربن کی ایک اہم شخصیت مفتی زبیر بیات ہیں، گذشتہ اسفار میں بھی ان سے ملاقات ہوتی رہی ہے، وہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے سیمینار میں شرکت کے لئے ہندوستان بھی تشریف لا چکے ہیں، ان کا ایک اہم تعلیمی اور تربیتی ادارہ 'دارالاحسان' کے نام سے ڈربن شہر میں قائم ہے، یہاں ظہر سے پہلے خطاب رکھا گیا تھا، جس میں اس ادارہ کے اساتذہ وطلبہ کے علاوہ شہر کے اہم علماء اور شخصیتیں بھی مدعو تھیں، معروف صاحب علم اور علامہ سید سلیمان ندویؒ کے صاحبزادے ڈاکٹر سید سلمان ندوی اور معروف مسلمان قانون داں اور کئی اسلامی مالیاتی اداروں کے شرعی اڈوائزر ڈاکٹر شعیب عمر صاحب بھی شرکاء میں شامل تھے، مختصر خطاب کے بعد کچھ سوالات کئے گئے، یہیں ہم لوگوں نے نماز ظہر ادا کی اور ظہرانہ سے فارغ ہوئے اور اس کے بعد اپنے قیام گاہ پر واپس ہو گئے۔

عصر کے بعد ڈاکٹر شعیب عمر کے یہاں نشست رکھی گئی تھی، کسی قدر تاخیر سے ہم لوگ یہاں پہنچ پائے، مغرب سے عشاء تک مختلف مسائل پر — جو زیادہ تر شرعی نوعیت کے تھے اور فقہی معاملات سے جڑے ہوئے تھے — گفتگو ہوتی رہی، یہاں بھی ڈاکٹر ندوی، مفتی زبیر صاحب، ہمارے میزبان عزیز مولانا شعیب جوسب، مولانا احمد سلیمان کے علاوہ ہمارے رفقاءِ سفر عزیزی مولوی محمد عمر عابدین قاسمی مدنی سلمہ اور مولانا امتیاز احمد قاسمی موجود تھے، یہ بڑی علمی اور دلچسپ نشست رہی، اخیر میں ہم لوگوں نے جناب شعیب عمر صاحب کے پرتکلف عشائیہ سے استفادہ کیا اور عزیزی مولانا شعیب جوسب صاحب کے مکان پر ہم سب کی واپسی ہوئی، ان کا مکان بالکل سمندر سے لگا ہوا ہے اور سمندر کے کنارے چہل قدمی کرنے والوں کے لئے سڑک بنی ہوئی ہے، روشنی کا بھی معقول انتظام ہے،

میں اپنے ان رفقاء کے ساتھ کافی دیر تک چہل قدمی کرتا رہا، رات کی خاموشی، خوشگوار ماحول، ہلکی خنک ہوائیں اور سمندر کا نہ تھمنے والا نغمہ ریز تموج بڑے ہی لطف کا باعث تھا۔

۲۹؍جنوری ۲۰۱۲ء کو دوستوں نے پروگرام بنایا کہ (Moses Mabida) نامی اسٹیڈیم پر چلا جائے، کچھ عرصہ پہلے جنوبی افریقہ میں عالمی فٹ بال کپ ہوا تھا، اسی موقع سے یہ خوبصورت، وسیع وعریض اور بلند و بالا اسٹیڈیم تعمیر کیا گیا تھا، یہ خود تو ایک بڑا اسٹیڈیم ہے ہی؛ لیکن اس کے چاروں طرف اِن ڈور اور آؤٹ ڈور کھیل کے میدان اور کھیل کے مناسب عمارتیں بنی ہوئی ہیں، ایک برقی ٹرالی کے ذریعہ لوگ اس اسٹیڈیم کی چھت پر پہنچتے ہیں، جہاں سے پورا ڈربن شہر نظر آتا ہے، یہاں سے واقعی ڈربن شہر کا منظر، سمندر اور نشیب وفراز کی وجہ سے بڑا خوبصورت نظر آتا ہے۔

یہاں سے واپسی میں ہم لوگ پھر اپنی منزل پر پہنچے، عزیز رفقاء نے سمندر کے کنارے غسل کرنے کا خوب لطف اُٹھایا اور ان حضرات کے اصرار پر لب ساحل کھڑے ہوکر میں نے بھی ایک طرح سے اس میں شرکت کی، وہ منظر واقعی بہت عجیب ہوتا ہے جب سمندر کی موجیں اُٹھ کر ساحل کی طرف بڑھتی ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ ہر شئے کو بہالے جائیں گی، یہاں کے ایک خاص ہوٹل (Solly Nanger) میں میز بانوں نے ظہرانہ کے لئے بکنگ کرا رکھی تھی، دارالعلوم زکریا کے طلبہ افتاء ملاقات کے بے حد مشتاق تھے اور مجھے دو پہر کے کھانے پر مدعو کرنا چاہتے تھے، میز بانوں نے خود انھیں یہاں مدعو کرلیا، جس میں پیش پیش محترم دوست جناب عبدالوحید صاحب (سابق مقیم جدہ، حال مقیم امریکہ) کے صاحبزادہ عزیزی محمد وسیم سلمہ تھے، انھیں اس وقت دیکھا تھا، جب ان کی عمر چار پانچ سال رہی ہوگی، اب وہ ماشاءاللہ افتاء کے طالب علم ہیں، بڑی محبت سے ملے اور والد ماجد سے فون پر گفتگو بھی کرائی۔

آج ہی ہم لوگوں کو جوہانس برگ واپس ہونا تھا، عزیزی مولانا شعیب جوسب کے والد صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ کسی وقت ان کے گھر پر بھی حاضری ہو؛ چنانچہ عصر کی نماز ان ہی کے آبائی دولت خانہ پر ادا کی اور چائے وغیرہ کے بعد جوہانس برگ کے لئے روانہ ہوگئے، ہم لوگوں کو پروگرام کے مطابق مغرب کی نماز جوہانس برگ کے قریب ایک شہر میں واقع ''مدرسۃ النور'' میں کرنی تھی، یہ نابینا حضرات کا مدرسہ ہے، اس کے ذمہ دار ایک فعال عالم دین مولانا حسن مرچی ہیں، بڑی محبت سے ملے، یہاں نماز مغرب کے بعد خطاب ہوا اور دورۂ حدیث کے طلبہ کی خواہش پر انھیں حدیث کی اجازت دی گئی، طلبہ نے مختلف حدیث کی کتابوں کی عبارت بڑی عمدہ عربی لہجہ میں پڑھی، مجھے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ یہ نابینا بے تکلف دوڑ بھاگ کر رہے تھے اور بالکل بیناؤں کی طرح چل رہے تھے، مدرسہ کے ذمہ داران نے بتایا کہ یہ نابینا طلبہ فٹ بال بھی کھیلتے ہیں، یہیں جناب ڈاکٹر ہانسا (Hansa) بھی آگئے، جو مساج کے ذریعہ ریڑھ کی ہڈی کی تکلیف کا علاج کرتے ہیں، مجھے بھی وقتی طور پر فائدہ ہوا، اگر چند

روز رہتا تو شاید زیادہ نفع ہوتا، بہر حال عشاء اور عشائیہ کے بعد مولانا احمد سلیمان کے یہاں جوہانس برگ میں قیام رہا۔

۳۰ر جنوری ۲۰۱۲ء کا دن کچھ احباب سے ملاقات اور تفریح میں گذرا اور جوہانس برگ کا میوزیم بھی دیکھنے کا موقع ملا، اسی دن مخدوم محترم مولانا عباس علی جینا کے یہاں عشائیہ ہوا اور اگلے دن ہندوستان واپسی ہوئی، اگر چہ اس حقیر کو جنوبی افریقہ ایک سے زائد بار جانے کا موقع ملا ہے؛ لیکن اس بار کیپ ٹاؤن بھی جانے کا موقع ملا، جو دنیا کے مشرقی حصہ میں سمندر کا آخری ساحل ہے، اور اس طرح ایک دیرینہ خواہش پوری ہوئی۔

○ ○ ○

خبرنامہ

(جمادی الاولیٰ تا شوال ۱۴۳۳ھ)

مولانا شاہد علی قاسمی ☆

- ۱۲/اپریل ۲۰۱۲ء کو معہد میں ''سلام ورلڈ'' کے ذمہ داران جناب احمد عزیمو ڈپٹی چیئر مین اور ندیم کایا (جنرل سکریٹری ایکزیکیٹیو بورڈ) تشریف لائے، اس وفد نے مولانا رحمانی اور اساتذۂ معہد سے تفصیلی تبادلۂ خیال کیا اور طلبہ کے درمیان محاضرہ بھی دیا۔
- ۱۷-۱۸/اپریل ۲۰۱۲ء کو جامعۃ العلوم والتربیۃ الاسلامیہ کی دعوت پر مولانا رحمانی گجرات تشریف لے گئے، تعلیم وتربیت کے اعتبار سے یہ ایک مثالی درسگاہ ہے، آپ نے یہاں کا تفصیلی معائنہ کیا، مشورے دیئے اور طلبہ سے خطاب بھی فرمایا۔
- ۲۰-۲۲/اپریل ۲۰۱۲ء کو بیت الحجاج ممبئی میں آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ کا بائیسواں اجلاس عام منعقد ہوا، اس موقع سے عاملہ کی نشست بھی ہوئی، مولانا رحمانی نے بھی ان نشستوں میں شرکت کی۔
- ۲۸/اپریل ۲۰۱۲ء کو اسلامک فقہ اکیڈمی کی جانب سے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں 'اسلام کے سیاسی نظام' پر دو روزہ سیمینار منعقد ہوا، مولانا رحمانی نے اس میں کلیدی خطبہ دیا اور ایک نشست کی صدارت بھی کی۔
- ۳۰/اپریل ۲۰۱۲ء کو جامعہ عائشہ نسواں حیدرآباد کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا، مولانا رحمانی نے اجلاس کی صدارت کی، معہد کے دوسرے اساتذہ بھی اجلاس میں شریک رہے۔
- ۵/مئی ۲۰۱۲ء کو ورنگل میں ''آئینی حقوق بچاؤ تحریک'' کا جلسہ ہوا، مولانا جمال الرحمٰن مفتاحی نے صدارت کی، مولانا رحمانی نے کلیدی خطبہ دیا، اس اجلاس میں جناب اسدالدین اویسی (ایم پی حیدرآباد) اور مختلف حضرات شریک تھے۔

☆ معتمد تعلیم: المعہد العالی الاسلامی حیدرآباد۔

◆ ۲۴-۲۵/مئی۲۰۱۲ءکواسلامک فقہ اکیڈمی کی مجلس عاملہ اور مجلس تاسیسی کی نشستیں دہلی میں منعقد ہوئیں، اس بار اگلی میقات کے لئے عہدیداروں کا انتخاب بھی تھا، بہ اتفاق رائے تمام عہدیداران اپنی جگہ برقرار رکھے گئے۔

◆ ۷/جون۲۰۱۲ءکو مدرسہ خادم الاسلام (عطا پور) کا سالانہ جلسہ مولانا رحمانی کے زیر صدارت ہوا، مفتی شاہد علی قاسمی (استاذ معہد) اور دیگر حضرات نے خطاب کیا، اس ادارہ کے ذمہ دار معہد کے فاضل مولانا عمیر انور مظاہری ہیں۔

◆ ۹/جون۲۰۱۲ءکودارالعلوم امدادیہ ممبئی کے سالانہ اجلاس میں شرکت کے لئے مولانا رحمانی نے ممبئی کا سفر کیا اور تفصیلی خطاب فرمایا۔

◆ ۱۷/جون۲۰۱۲ءمطابق ۲۵/رجب۱۴۳۳ءروز اتوار کوآفیسرس میس ملک پیٹ حیدرآباد میں معہد کا گیارہواں جلسۂ تقسیم اسناد مولانا خالد سیف اللہ رحمانی کے زیر صدارت منعقد ہوا، حضرت مولانا منیر احمد مظاہری (امام وخطیب جامع مسجد کالینہ، ممبئی) کا خصوصی خطاب ہوا، آپ کے علاوہ حضرت مولانا سید محمد اکبر مفتاحی (ناظم مجلس علمیہ آندھرا پردیش)، پروفیسر وصی نعمانی (دہلی)، پروفیسر سید جہانگیر نظامی (ایفل یونیورسٹی حیدرآباد)، جناب رحیم الدین انصاری (ناظم دارالعلوم حیدرآباد) اور مولانا قاضی سمیع الدین نرساپوری نے خطاب کیا۔

◆ اس سے ایک دن پہلے ۲۴/رجب۱۴۳۳ھ کی شام کو معہد کے لائبریری ہال میں مدرسہ عبداللہ بن مسعود سے فارغ ہونے والے طلبہ کی بخاری شریف کے آخری درس کے لئے خصوصی نشست منعقد ہوئی، مولانا رحمانی نے آخری حدیث کا درس دیا اور مولانا منیر احمد مظاہری نے فارغ ہونے والے طلبہ اور علماء کو نصیحت کی، مولانا حافظ خواجہ نذیر الدین صاحب نے بھی اجلاس سے خطاب کیا، ان پروگراموں میں شہر کی اہم علمی و دینی شخصیتوں کے علاوہ جناب محمد جعفر صاحب (معتمد مالیات معہد) اور جناب اقبال احمد انجینئر (معتمد تعمیرات معہد) بھی شریک ہوئے، بحمداللہ گذشتہ سال اور سالِ رواں مجموعی طور پر ایک سو چالیس فضلاء نے معہد کے مختلف شعبوں سے فراغت حاصل کی ہے، جنھیں جلسۂ سالانہ میں اسناد دی گئیں۔

◆ ۲۱/جون۲۰۱۲ءکودینی مدارس بورڈ آندھراپردیش کے زیر اہتمام مدرسہ بیت العلوم کاغذنگر کے اشتراک سے ''آئینی حقوق بچاؤ تحریک'' کا جلسہ کاغذنگر میں ہوا، مولانا رحمانی نے صدارت کی اور حیدرآباد سے بورڈ کے ذمہ داران تشریف لے گئے۔

◆ ۲۳/جون۲۰۱۲ءکو مدرسہ عثمان تحفیظ القرآن ایرہ کنٹہ (حیدرآباد) کا سالانہ جلسہ مولانا رحمانی کے زیر صدارت منعقد ہوا، جس میں حفظ مکمل کرنے والوں کی دستار بندی ہوئی، یہ مدرسہ معہد کے پڑوس میں واقع ہے۔

◆ ۲۵/جون۲۰۱۲ءکوکوکن کی معروف اور سب سے بڑی دینی درسگاہ جامعہ حسینیہ شری وردھن مولانا رحمانی

تشریف لے گئے ، اسی دن بعد نماز مغرب بخاری شریف کی آخری حدیث کا درس دیا اور طلبہ کو نصیحتیں کیں ، نیز ۲۶؍جون کو اجلاس عام سے خطاب کیا۔

◆ چنئی کے اصحابِ علم کے دیرینہ مطالبہ کو پورا کرتے ہوئے مولانا رحمانی ۳۰؍جون ۲۰۱۲ء کو چنئی تشریف لے گئے ، انجمن حمایت اسلام کے زیر اہتمام زکوٰۃ کے موضوع پر تفصیلی خطاب بھی فرمایا اور سوالات کے جوابات بھی دیئے ، جس میں چار سو سے زیادہ منتخب تجار اور علماء نے شرکت کی ، اور جناب ٹی رفیق نے اجلاس کی صدارت کی ، اسی دن شام میں جناب ملک ہاشم صاحب کی دعوت پر مولانا رحمانی میل وشارم گئے ، اور بعد نماز مغرب مسجد خضر میں اصلاح معاشرہ کے موضوع پر تفصیلی خطاب کیا ، یکم جولائی کو صبح ۱۱؍بجے جامعہ باقیات الصالحات ویلور تشریف لئے گئے ، آپ نے اس سال فارغ ہونے والے طلبہ سے خطاب بھی کیا اور انھیں دستار بھی تقسیم کی ، جناب ملک ہاشم صاحب اور مولانا محمد ابراہیم قاسمی (رکن شوریٰ دارالعلوم دیوبند) آپ کے ساتھ تھے ، یہاں سے آپ مشہور تجارتی شہر آمبور تشریف لے گئے اور بعد نماز مغرب اصلاحِ معاشرہ اور تفہیم شریعت پر ٹی عبدالواحد اسکول کے وسیع کیمپس میں خطاب کیا ، جناب ٹی رفیق صاحب نے صدارت کی ، کاکا سعید عمری صاحب اور قاری محمد قاسم بھوپالی بھی اس پروگرام میں شریک تھے۔

◆ گجرات میں ایک اہم مدرسہ جامعہ اسلامیہ ماٹلی والا بھروچ ہے ، مولانا رحمانی نے اہل مدرسہ کی دعوت پر ۳؍جولائی کو وہاں سالانہ جلسہ سے خطاب فرمایا ، اس جلسہ میں عوام کے علاوہ ریاست کے علماء اور مساجد کے ذمہ داران کی بڑی تعداد شریک تھی۔

◆ مؤرخہ : ۵-۱۲؍شعبان ۱۴۳۳ھ معہد میں سالانہ امتحان منعقد ہوا ، امتحان سے فارغ ہونے کے بعد کچھ طلبہ تربیت قضاء حاصل کرنے کے لئے پھلواری شریف پٹنہ گئے ، کچھ برادران وطن میں دعوت دین کے کام کی عملی تربیت کے لئے رامپور (یوپی) جناب سید عبداللہ طارق کے مرکز گئے اور کچھ مرکز نظام الدین کے نظام کے مطابق دعوت وتبلیغ کے کام میں نکلے اور دیگر طلبہ اپنے وطن کو گئے —— ۲۱؍شعبان ۱۴۳۳ھ سے معہد میں تعطیل ہوگئی۔

◆ ۱۰؍رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ کو مسجد سلمیٰ ٹولی چوکی میں بعد نماز ظہر زکوٰۃ کے احکام ومسائل پر مولانا رحمانی کا خطاب ہوا ، اس موقع پر آپ نے سوالات کے جوابات بھی دیئے۔

◆ ۱۶؍رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ مطابق ۵؍اگست ۲۰۱۲ء کو جناب غیاث الدین بابو خاں کی دعوت پر لیک بنجارہ فنکشن ہال میں زکوٰۃ چیریٹیبل ٹرسٹ کا سالانہ جلسہ منعقد ہوا ، مولانا رحمانی نے اپنے صدارتی کلمات میں تعلیمی ومعاشی ترقی میں زکوٰۃ کے استعمال کے موضوع پر تفصیلی خطاب فرمایا۔

◆ ۱۹؍رمضان المبارک ۱۴۳۳ھ مطابق ۷؍اگست ۲۰۱۲ء کو بعد عصر ''کو'' نامی تنظیم کے زیر اہتمام مختلف

مذاہب کے نمائندوں کا چیریٹی کے تصور پر سمپوزیم منعقد ہوا، مولانا رحمانی نے اس پروگرام میں اسلام کے تصور انفاق پر خطاب کیا۔

- اس سال رمضان المبارک میں اسلامک فاؤنڈیشن ٹورنٹو (کناڈا) کے تعاون سے معہد نے حیدرآباد، ورنگل، وشاکھاپٹنم، کاکی ناڈا اور بہار کے بعض علاقوں میں مجموعی طور پر ۵۰۰ فوڈ پیکیج تقسیم کیا۔
- اسی طرح سعودی عرب کے تعاون سے بواسطہ اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا حیدرآباد میں افطار کا نظم کیا گیا، جس میں کئی سو لوگوں نے شرکت کی۔
- ۱۱ر شوال کو معہد کھل گیا، اس سال شعبۂ تفسیر وحدیث میں ۱۶، دعوہ وانگریزی زبان میں ۱۰، فقہ میں ۵۱ اور سال دوم میں ۱۶ر طلبہ کا داخلہ قبول کیا گیا، اس سال شعبۂ عربی ادب کا بھی آغاز کیا گیا ہے، جس میں ۵ کا داخلہ منظور کیا گیا، اس کے علاوہ مدرسہ عبداللہ بن مسعودؓ (مختصر مدتی عالم کورس) میں ۵۵ (جدید وقدیم) داخلے لئے گئے، جس میں زیادہ تر عصری تعلیمی اداروں کے طلبہ اور فارغین ہیں۔
- ۱۵ر شوال ۱۴۳۳ھ مطابق ۲ر ستمبر ۲۰۱۲ء کو اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا اور شعبۂ قانون مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اشتراک سے اسلام کے سیاسی نظام کے عنوان سے ایک اہم سیمینار منعقد ہوا، مولانا رحمانی نے اس میں کلیدی خطبہ پیش کیا، پروفیسر یٰسین مظہر صدیقی، پروفیسر محسن عثمانی ندوی، مولانا عتیق احمد بستوی، پروفیسر سعود عالم قاسمی اور متعدد اہم علمی شخصیتوں نے پروگرام میں شرکت کی۔
- ۲۷ر شوال ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۴ر ستمبر ۲۰۱۲ء کو مولانا آزاد نیشنل اُردو یونیورسٹی کے شعبۂ اسلامک اسٹڈیز کے بورڈ آف اسٹڈیز کی نشست منعقد ہوئی، مولانا رحمانی نے بحیثیت رکن شرکت کی، اس نشست میں ایم اے اسلامیات کے نصاب کی تیاری پر غور کیا گیا۔
- ۲۸ر شوال ۱۴۳۳ھ مطابق ۱۵ر ستمبر ۲۰۱۲ء سے دس روز کا ورکشاپ برائے تحقیق مخطوطات معہد میں رکھا گیا، جس میں معروف محقق مولانا نور الحسن راشد کاندھلوی نے خصوصی مربی کی حیثیت سے شرکت کی، پروفیسر اختر الواسع، پروفیسر محسن عثمانی، پروفیسر سید جہانگیر، پروفیسر عبدالمعز، ڈاکٹر فہیم اختر ندوی، معہد کے اساتذہ مفتی اشرف علی قاسمی، مولانا مصطفیٰ عبدالقدوس ندوی، مولانا شاہد علی قاسمی، مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی، مولانا محمد اعظم ندوی اور مولانا سید عبدالرشید صاحب نے مختلف محاضرات دیئے، اخیر میں شرکاء کا امتحان بھی لیا گیا اور انھیں اسناد بھی دی گئی، مولانا محمد عمر عابدین قاسمی مدنی اور مولانا سید عبدالرشید نے اس ورکشاپ کے انتظام وانصرام کی ذمہ داری انجام دی۔
- ۷ر ذوالقعدہ ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۳ر ستمبر کو مولانا رحمانی نے ڈاکٹر ف عبدالرحیم (مجمع الملک فہد لطباعة

القرآن الکریم مدینہ منورہ) کی دعوت پر چینئی کا سفر کیا اور کمپیوٹر پر کتابت شدہ قرآن مجید کے رسم اجراء کی تقریب سے خصوصی خطاب فرمایا۔

- ۸؍ذوالقعدہ ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۴؍ستمبر ۲۰۱۲ء کو مسجد عالیہ گن فاؤنڈری میں سینئر ایڈوکیٹ جناب غلام یزدانی صاحب نے مولانا رحمانی کے انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی کے رکن منتخب ہونے پر تہنیتی تقریب رکھی، جس میں شہر کے معزز علماء ودانشوران اور مختلف تنظیموں کے ذمہ داران نے شرکت کی۔
- ۹؍ذوالقعدہ ۱۴۳۳ھ مطابق ۲۵؍ستمبر ۲۰۱۲ء سے تین روزہ قضاء تربیتی ورکشاپ معہد میں منعقد ہوا، جس میں مولانا قاضی محمد قاسم مظفر پوری اور مولانا محمد انظار قاسمی (امارت شرعیہ پٹنہ) نے بحیثیت مربی شرکت فرمائی، ۲۵؍ستمبر کی شام میں تربیت قضاء ورکشاپ کی افتتاحی نشست منعقد ہوئی، جس سے مولانا رحمانی نے بھی خطاب کیا، اس موقع پر معہد کے اساتذہ اور طلبہ نے مولانا رحمانی کے انٹرنیشنل اسلامک فقہ اکیڈمی مکہ مکرمہ کے رکن منتخب ہونے پر گرم جوش تہنیت پیش کی۔

○ ○ ○

فضلاء معہد کے مطبوعہ سندی مقالات

• اُردو زبان میں علوم اسلامی کا سرمایہ (طلبہ کے مضامین کا مجموعہ) • ہندوستان اور مسلمان (طلبہ کے مضامین کا مجموعہ) • اسلام — امن وآشتی کا علمبردار (طلبہ کے مضامین کا مجموعہ) • اسلام کا نظام زراعت (محمد نافع عارفی) • حقوق اور ان کی خرید وفروخت (محمد عمر عابدین قاسمی مدنی) • بچے — حقوق واحکام (محمد نعمت اللہ قاسمی) • ندوۃ العلماء کا فقہی مزاج اور ابناء ندوہ کی فقہی خدمات (منور سلطان ندوی) • کلوننگ، ٹیسٹ ٹیوب، فیملی پلاننگ اور جنین کے مالی حقوق (نثار احمد ندوی قاسمی) • خواتین کے شرعی مسائل — قرآن وحدیث اور فقہ اسلامی کی روشنی میں (منور سلطان ندوی) • اسلام اور ماحولیات (محمد جہانگیر حیدر قاسمی) • نفل نمازیں — احکام ومسائل (سعید احمد مظاہری) • ظلم وزیادتی اور عدم مناسبت کی وجہ سے فسخ نکاح (رضی الرحمٰن قاسمی) • فضلاء دیوبند کی فقہی خدمات (آفتاب غازی قاسمی، عبدالحسیب قاسمی) • حقوق ادا نہ کرنے کی وجہ سے فسخ نکاح (مقیم الدین اشاعتی) • امراض وعیوب کی وجہ سے فسخ نکاح (وسیم جعفر رشادی) • شرکت — احکام وتطبیقات (ابوعبیدہ قاسمی) • اجارہ — احکام وتطبیقات (عبدالباسط قاسمی) • مضاربت — احکام وتطبیقات (آفتاب غازی قاسمی) • سلم واستصناع — احکام وتطبیقات (محمد جبرئیل ندوی) • مرابحہ — احکام وتطبیقات (سید مدثر احمد قاسمی) • جوا اور جوئے کی مروجہ شکلیں (محمد عبداللہ سلیمان مظاہری) • علماء گجرات کی خدماتِ حدیث (محمد عمران عبداللہ گجراتی) • احادیث البدائع • المسائل الاستحسانیہ • الاختلافات الفقہیہ بین الفقہاء الحنفیہ • معہد کے زیر تربیت فضلاء کی علمی کاوشیں (عبیداللہ قاسمی، محمد عمران ندوی) • طہارت ونماز — مسائل ودلائل (رفیع الدین حمیدی فاضل دیوبند) • سجدے — احکام ومسائل (فضل الرحمٰن قاسمی) • قاضی مجاہد الاسلام قاسمیؒ کی فقہی فکر وفقہی خدمات • سن رسیدہ اشخاص - احکام ومسائل (نوشاد اختر ندوی) • آیاتِ قرآنی کا نزولی پس منظر (تحسین حیدر قریشی ندوی قاسمی) • قرآن مجید اور بائبل (طفیل احمد انعامی)۔

○ ○ ○